جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۳ء

اُردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلّہ

سہ ماہی

الاقربا

اسلام آباد
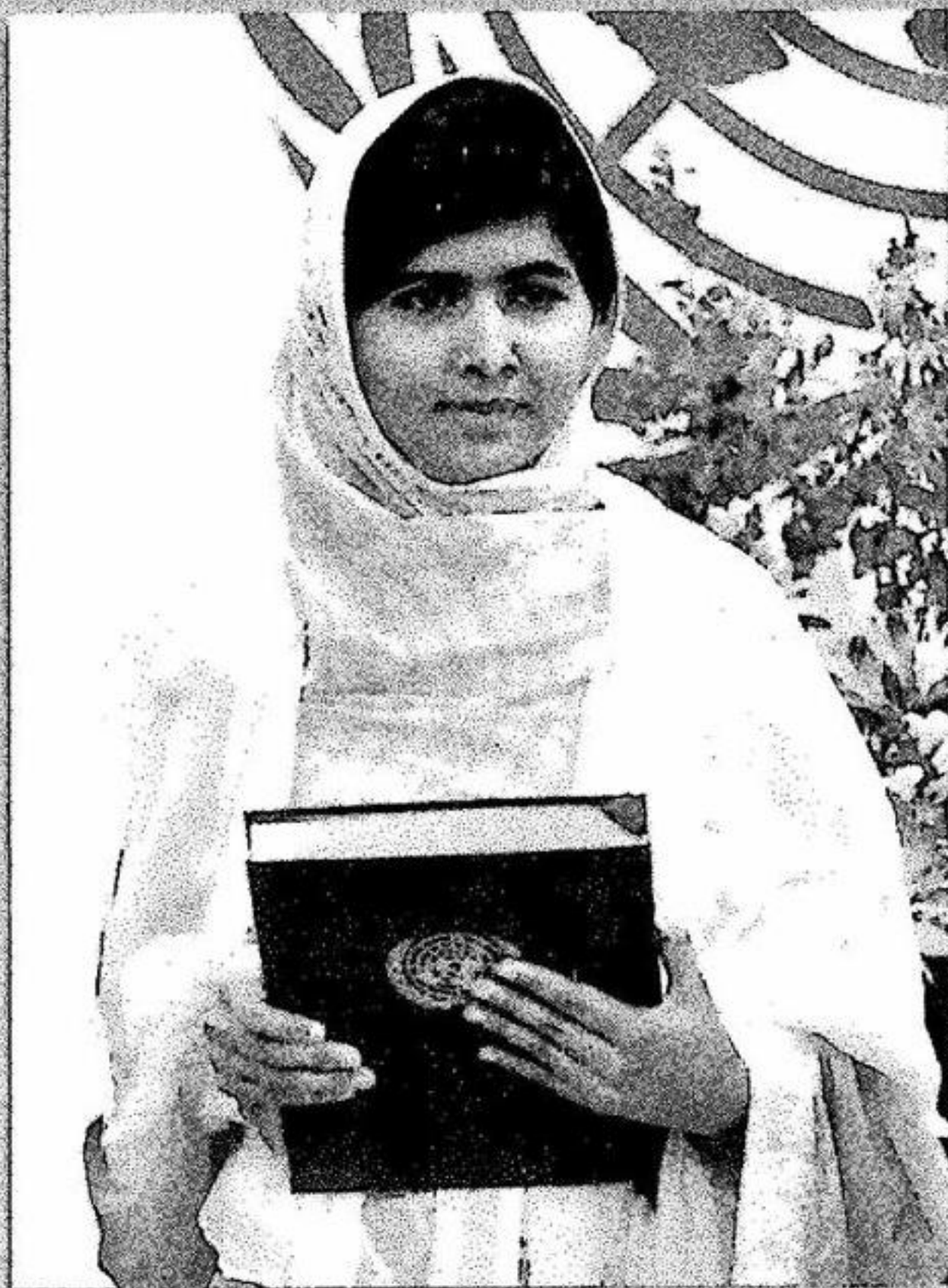
الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم وادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۶ شمارہ نمبر ۳ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۳ء

صدر نشین سید منصور عاقل

مجلسِ ادارت
شہلا احمد مدیر مسئول
ناصر الدین مدیر منتظم
نعیم فاطمہ علوی مدیر معاون

مجلس مشاورت

پاکستان
پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین ۔۔ پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران
ڈاکٹر عالیہ امام سیّد محمد حسن زیدی

بیرون ملک
پروفیسر ڈاکٹر علی آسانی (صدر شعبہ انڈو مسلم اینڈ اسلامک کلچر ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ)
پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اُر (صدر نشین اردو زبان وادب استنبول یونیورسٹی۔ترکی)
پروفیسر ڈاکٹر سویمانے یاسر (شعبہ اردو اوساکا یونیورسٹی۔جاپان)
پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔انڈیا)

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۲۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Ph.051-4442686 Fax 051-2221670

website www.alaqreba.com

E-mail alaqreba@hotmail.com

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone
London, E-11. 3 DG (U.K.)
Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849
Email: Barqureshi@ hotmail.co.uk

محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE
Mill Creek WA 98012- 4677 (USA)
Phone: (001) 425-385-8666
E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۲۵۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۱۰۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۱۰ / ڈالر ۷/ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰ /ڈالر ۳۰/ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	جولائی۔ستمبر ۲۰۱۳ء
کمپوزنگ	محمد انور چوہدری
طابع	ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سیّد ناصر الدین

مندرجات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱	دخترِ پاکستان ۔ ملالہ یوسف زئی (سرورق)	ادارہ	۷
۲	تحریم وتکریم ۔ بنام ۔ تحقیر وتذلیل (اداریہ)	ادارہ	۹
۳	'کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی' (ذیلی اداریہ)	ادارہ	۱۵

مضامین ومقالات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۴	قرآن واحادیث کا جمال، فنِ تاریخ گوئی کا کمال	سید انتخاب علی کمال	۱۸
۵	سلطنتِ عثمانیہ ۔ عثمان کی وصیت	محمد طارق غازی	۳۳
۶	اردو ادب میں مشاعرہ کی روایت	محمد اویس جعفری	۴۵
۷	سید ابوالحسن ندوی کا اسلوبِ نگارش	ڈاکٹر محمد شارق	۶۷
۸	ادب میں نراجیت کی تشکیلات اور اظہار	مسلم شمیم	۷۲
۹	اردو شاعری میں تانیثیت	ڈاکٹر عارفہ بشریٰ	۷۸

اقبالیات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۰	علامہ اقبال ۔ 'یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید'	طارق بن عمر	۹۷

عالمی ادب

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۱	ترکی کے صوفی شعراء کے کلام میں پیغام محبت واخوت، اظہارِ اتحاد ویکجہتی	پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار	۱۰۷

۱۲	فرانسیسی ادب کی مشرقی اساس	احمد اعجاز الدین رحمت علی	۱۳۰
۱۳	پی۔جی۔ووڈ ہاؤس۔۔زندگی اور فن	محمد طارق علی	۱۳۹
۱۴	ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی شعری روایت	شاکر کنڈان	۱۴۹
۱۵	جون وولف گینگ وان گوئٹے	فضہ پروین	۱۷۵

افسانہ۔کہانی

۱۶	قاتل کی تلاش	واجد ندیم	۱۸۶
۱۷	خاندانی	ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق	۱۹۷
۱۸	پاگل	سلیم زاہد صدیقی	۲۰۶
۱۹	شہر میں امن ہو گیا	قیصر طارق	۲۱۴
۲۰	یہ کیسی رات	فرزانہ اعجاز	۲۱۹

متفرقات

۲۱	عشق رسولؐ اور قائد اعظمؒ	پروفیسر جلیل احمد صدیقی	۲۲۵
۲۲	لمحہ فکریہ	سلمان غازی	۲۳۳
۲۳	الاقرباء۔۔اردو ادب میں عالمی معیار کا مجلّہ	حسن چشتی	۲۳۸
۲۴	الاقرباء۔۔سالنامہ ۲۰۱۳ء پر ایک نظر	سرور عالم راز سرور	۲۴۲

یادرفتگاں

۲۵	تاجدار سخن میر ببر علی انیس کی یاد میں	سلمان رضوی	۲۴۹

۲۶ حمد۔ نعت ۲۵۳

صابر عظیم آبادی۔ شفیق احمد فاروقی۔ عبدالجبار اثر۔ عرش ہاشمی۔ نورین طلعت عُروبہ۔ حسن زیدی۔ محمد اویس ابنِ محمود بھاولپوری۔ سیّد حبیب اللہ بخاری

۲۷ غزل ۲۵۹

صابر عظیم آبادی۔ سید زاہد حسین سالک۔ ضامن جعفری۔ مضطر اکبرآبادی۔ امین راحت چغتائی۔ شفق ہاشمی۔ سید مشکور حسین یاد۔ مرزا معصوم پانی پتی۔ سید تابش الوری۔ انوار فیروز۔ سرور عالم راز سرور۔ حسن چشتی۔ پروین شیری۔ سید صفدر حسین جعفری۔ عبدالجبار اثر۔ کرامت بخاری۔ محمد اویس ابنِ محمود بھاولپوری۔ حسن زیدی۔ فریدہ لاکھانی۔ شمع سیّد۔

۲۸ نظم ۲۷۱

حمایت علی شاعر۔ محمد اویس جعفری۔ امین راحت چغتائی۔ سید مشکور حسین یاد۔ سمیس برلاس۔ کرامت بخاری۔ معظم سعید۔ سلمان غازی

۲۹ رباعی ۲۸۵

صابر عظیم آبادی

۳۰ نقد و نظر ۲۸۸

سیّد منصور عاقل۔ نعیم فاطمہ علوی

۳۱	**مراسلات**	۳۰۳

بیرسٹر سلیم قریشی۔ محمد طارق غازی۔ ڈاکٹر نسیم اے ہائنز۔ ڈاکٹر عارفہ بشریٰ۔
احمد اعجاز الدین رحمت علی۔ سید انتخاب علی کمال۔ سید ماہرہ نعمان۔ شفق ہاشمی۔
مفتی عبدالرحمٰن شریف۔ سعدیہ راشد۔ فریدہ لاکھانی۔ سید حبیب اللہ بخاری۔
انوار فیروز۔ عثمان مظفر۔ مسعود احمد صدیقی۔ سعود صدیقی۔ خواجہ مشتاق
حسین۔ فرخ ہاشمی۔ صابر عظیم آبادی۔ صاحبزادہ مسکین فیض الرحمٰن
درانی۔ محمد بشیر

خبر نامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

۳۲	احوال وکوائف	پروفیسر ہما سالاری	۳۲۵
۳۳	قطعات تہنیت	عقیل دانش	۳۲۹
۳۴	سہرا	سید منصور عاقل	۳۳۰
۳۵	گھریلو چٹکلے	سیّدہ سارہ سلمان	۳۳۱

سرِورق

دخترِ پاکستان ۔۔۔ ملالہ یوسف زئی

کتاب وقلم کی حُرمت وعظمت سے سرشار پاکستان کی نوعمرونوخیز بیٹی ملالہ یوسف زئی جس نے اپنے عزم وہمت کا نقشِ دوام صحیفۂ عالم پر ثبت کر دیا ہے الحمدُ اللہ آج پاکستان کے لیے نشانِ افتخار بن چکی ہے۔ یہ بچی مشرقی آدابِ معاشرت اور دینی اخوت وعالمگیریت کی پہچان بھی ہے اور محسنِ انسانیت آنحضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیامبر بھی۔ اُس نے جان پر کھیل کر ثابت کر دیا ہے کہ جس دینِ انسانیت پر وہ پختہ ایمان رکھتی ہے اُس میں بغض وعناد، دہشت وبربریت اور انتقام وکینہ پروری کی کوئی گنجائش نہیں۔ اُس کا دین رنگ ونسل۔ عقیدہ ومذہب اور علاقائی امتیازات وتعصبات سے ماورا ہے جس مین بدترین دشمنوں کو بھی ہدفِ انتقام بنانے کی اجازت نہیں۔

ملالہ جو دو بھائیوں کی بہن ہے اُسے الحمدللہ اپنے والدین کا سایۂ عاطفت حاصل ہے۔ والد جناب ضیاء الدین یوسف زئی ایک خوش فکر شاعر اور سوات میں ایک تعلیمی درسگاہ کے بانی و مہتمم ہیں۔ سوات پاکستان کے شمال مغرب میں حسین ترین مناظر فطرت کی آغوش میں ایک سرسبزوشاداب وادی ہے جسے جنتِ نگاہ سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بقول شاعر ☆

یوں تو مری نگاہ نے دیکھے ہیں سو جہاں مگر — حسنِ سوات کی قسم حسنِ سوات اور ہے

ملالہ اسی وادیٔ جنت نظیر میں ۱۲ جولائی ۱۹۹۷ء کو پیدا ہوئی۔ لگتا ایسا ہے کہ شائد قدرت نے ملالہ جیسی بیٹی عطا کر کے سوات کو عالمی شہرت سے ہمکنار کرنا تھا اُس نے ابتدائی تعلیم ہی کے مدارج جس فاتحانہ انداز میں طے کیے اور اُس کے خداداد شعور وبصیرت کے جوہر جس طرح

☆ علامہ قابل گلاؤٹھوی

نمایاں ہوئے اُس نے بچپن ہی سے ایک تابناک مستقبل کی گواہی دے دی تھی۔ چنانچہ کم عمری ہی میں اُس کی پُر عظمت صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا جس کی ابتداء ضلع سوات میں صدر نشین ''ڈسٹرکٹ چائلڈ اسمبلی'' کے منصب سے ہوتی ہے اور وہ ۲۰ قومی اور بین الاقوامی اعزازات جو ملالہ کو عطا کیے گئے ہیں اُن میں درج ذیل نہایت اہم ہیں:

۱ نونہالان عالم بین الاقوامی امن انعام (۲۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء)

۲ نوجوانانِ پاکستان امن انعام (۱۹ دسمبر ۲۰۱۱ء)

۳ تیسرا اعلیٰ ترین سول بہادری ایوارڈ (۱۵ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

۴ تازہ ترین نامزدگی نوبل امن انعام برائے سال ۲۰۱۳ء

اور ۱۲ جولائی ۲۰۱۳ء کو اقوام متحدہ کی جانب سے ''عالمی یومِ ملالہ'' منانے کا اعلان۔ ملالہ اور اُس کے اہل خاندان ہی کا نہیں بلکہ اُس کے تمام اہل وطن کا سر بھی فخر سے بلند کر دیا ہے اور پھر انجمنِ اقوام عالم کے شہ نشیں (PODIUM) سے کم وبیش سو ممالک کے نوعمر سامعین سے خطاب کرنے کا اعزاز اس صغیر سنی میں عدیم المثال ہے جہاں ملالہ نے کتاب وقلم کا علم بلند کیا۔ اسلامی تصورات، انسان دوستی پر مبنی امن کا منشور عطا کیا اور مشرق کی تہذیبی وثقافتی روایات کا عملی نمونہ بن کر اقوام عالم کو بقائے باہمی کا جو پیغام دیا اُس پر اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون جو اپنی اہلیہ کے ساتھ شریک محفل تھے اور اقوام متحدہ کے خصوصی مندوب برائے تعلیم اور سابق وزیر اعظم برطانیہ گورڈن براؤن کا پُر عزم وپُر وقار قومی لباس میں ملبوس پاکستان کی بیٹی ملالہ یوسف زئی کو زبردست خراج تحسین اور تمام مندوبین عالم کا کھڑے ہو کر پُر جوش تالیوں سے استقبال اور اظہار تحسین کرنا بھی دنیا کے اس عظیم ترین ادارے کا تاریخ ساز واقعہ ہے۔ سلام ملالہ یوسف زئی بہترین دعاؤں کے ساتھ !

اداریہ

تحریم و تکریم۔۔۔ بنام۔۔۔ تحقیر و تذلیل

مقدمہ بعنوان مندرجہ بالا بعدالت معزز قارئین پیش خدمت ہے جس میں درج ذیل دستاویزی شہادت پر انحصار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ایوان صدر نے نومنتخب وزیر اعظم کی جانب سے حلف اردو میں لینے کی درخواست یہ عذر پیش کر کے مسترد کر دی کہ صدر زرداری قومی زبان اچھی طرح نہیں بول سکتے۔ باوثوق ذرائع کے مطابق نومنتخب وزیر اعظم نے ایوانِ صدر کو درخواست ارسال کی تھی کہ اُن کے عہدے کا حلف اردو زبان میں لیا جائے۔ تاہم ایوانِ صدر کی جانب سے اُنھیں بتایا گیا کہ ان کی وزارتِ عظمٰی کے عہدے کا حلف اردو میں نہیں لیا جا سکتا کیونکہ صدر زرداری اچھی طرح اردو نہیں بول سکتے۔''

(روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۶ جون ۲۰۱۳ء)

پاکستان کے ہر صوبائی دارالحکومت نیز راولپنڈی/اسلام آباد اور بیرونِ ملک سے شائع ہونیوالے اردو زبان کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے کی اس خبر پر نہ تو تادمِ تحریر کسی بھی نوعیت کے سرکاری ردِ عمل کا اظہار کیا گیا ہے اور نہ تردید ہی کی گئی ہے اس لیے اِس خبر کے معتبر و مصدقہ ہونے میں قطعاً کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے بہرحال اس دستاویزی شہادت نے چند منطقی سوالات کو جنم دیا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ بھی ہیں اور مملکت کے اعلیٰ ترین منصب کی آئینی حیثیت کو داغدار کرنے کے مترادف بھی۔ دنیا بھر میں کسی بھی مملکت کا آئین ایک دستورِ اساسی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لیے تحریم و تکریم کا مستوجب سمجھا جاتا ہے اور اقتدارِ اعلیٰ۔ قومی یکجہتی اور وفاق کے استحکام کا ضامن بھی۔ سربراہِ مملکت آئین کے اِن اوصاف کی علامت ہوتا ہے چنانچہ اس تناظر میں اُٹھنے والے درج ذیل سوالات نہایت اہم ہیں۔

۱۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۵ کے مطابق مملکت سے وفاداری اور آئین و قانون کی اطاعت مملکت کے ہر شہری کا بنیادی فرض ہے۔ صدر مملکت کو اس بنیادی فرض کی ادائیگی سے کوئی استثنیٰ حاصل نہیں۔

۲۔ ۱۹۷۳ء کے رواں آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے مطابق اردو پاکستان کی قومی زبان ہے (عملاً نفاذ کے لیے انتظامی اقدامات کرنے کے لیے آئین میں پندرہ سال کی مقررہ حد ۱۹۸۵ء میں گزر چکی ہے مزید دس سال کا اضافہ بھی ۱۹۹۵ء میں اختتام پذیر ہوئے اب تک ۱۸ برس گزر چکے ہیں) لہٰذا اس آرٹیکل کے منافی کوئی بھی اقدام قومی زبان کی تحقیر و تذلیل کے ساتھ ساتھ آئین شکنی قرار پاتا ہے اور قابل مواخذہ ہے خاص طور پر جب کہ اس کا ارتکاب صدرِ مملکت کی سطح پر ہو۔۔۔۔"چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

۳۔ آئین کے آرٹیکل ۴۱ کے مطابق "صدر سربراہ مملکت ہوگا اور جمہوریہ کی یک جہتی کی نمائندگی کرنے کا پابند ہوگا" اس تناظر میں صدر کا قومی زبان میں حلف لینے سے دوٹوک انکار اور ایک غیر ملکی زبان میں حلف لینا نہ صرف قومی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف ہے بلکہ آئین شکنی کے زمرے میں بھی آتا ہے اور قابل مواخذہ ہے۔

۴۔ آئین کے آرٹیکل ۴۷ کے تحت آئین شکنی یا عملِ ناروا (Mis.conduct) کے الزام پر صدر کے خلاف تعزیری کاروائی کر کے اُس کے منصب سے برطرف کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ آئین کے آرٹیکل ۴۲ اور تیسرے شیڈول میں دیے گئے صدر کے منصب سنبھالنے سے پہلے اُٹھائے جانے والے حلف میں درج ذیل مشمولات، منجملہ دیگر، قابل غور ہیں۔

(الف) ''یہ کہ میں مسلمان ہوں اور قادر مطلق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قرآن حکیم کے آسمانی صحیفۂ آخر ہونے، حضرت محمدؐ کے پیغمبر آخر الزمان ہونے نیز قرآن و سنت کی تمام تعلیمات و مقتضیات پر ایمان رکھتا ہوں''

(ب) ''یہ کہ بحیثیت صدر اپنے فرائض منصبی دیانتداری، وفاداری، اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور اسلامی جمہوریہ کے آئین و قانون کے مطابق نیز پاکستان کے اقتدار اعلیٰ۔ سالمیت۔ استحکام۔ بہبود اور خوشحالی کے مفاد میں انجام دونگا

(ج) یہ کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی برقراری۔ تحفظ اور دفاع کو یقینی بناؤں گا

مزید توجہ طلب امر یہ ہے کہ آئین کے آرٹیکل ۱۷۸ اور ۱۹۴ کے مطابق تیسرے شیڈول میں چیف جسٹس آف پاکستان۔ جج صاحبان عدالت عظمیٰ۔ چیف جسٹس اور جج صاحبان عدالت ہائے عالیہ کے حلف کے متن میں، منجملہ دیگر، وہی الفاظ شامل ہیں جو صدر کے متن میں بھی موجود ہیں یعنی

''یہ کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی برقراری تحفظ اور دفاع کو یقینی بناؤنگا''

بہ الفاظِ دیگر قومی زبان سے متعلق آرٹیکل ۲۵۱ کے ضمن میں چیف جسٹس اور دیگر جج صاحبان عدالت ہائے عالیہ و عظمیٰ کے فرائض منصبی بھی وہی ہیں جو صدر مملکت کے ہیں یعنی آئین شکنی کا بروقت نوٹس لینا چیف جسٹس آف پاکستان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

ہم نے ایک دفعہ نہیں متعدد بار صدرِ محترم کو الیکٹرانک میڈیا پر اردو، سندھی اور انگریزی زبان میں گفتگو یا تقریر کرتے دیکھا بھی ہے اور سُنا بھی۔ ہم نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ موصوف کی اردو ماشاء اللہ اُن کی انگریزی سے بہر حال بہتر ہے کہ یہ اُن کی اپنی قومی زبان ہے جس کے عملاً

استعمال کیے بغیر بحیثیت صدر پاکستان وہ تین چوتھائی سے بھی زیادہ اپنے ہم وطنوں سے براہ راست رابطہ میں نہیں رہ سکتے جب کہ ان کے آئینی مرتبہ ومقام کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی قومی زبان اور تہذیب وثقافت کے سیاق وسباق میں جس میں لباس بھی شامل ہے ایک غیر ملکی دکھائی نہ دیں اور نہ کسی مخصوص خطے کے نمائندہ۔ جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے ملک کی آٹھارہ کروڑ آبادی میں بمشکل چار فیصد افراد یہ زبان بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ کا تعلق بھی صوبۂ سندھ سے تھا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد اُن کا یہ ادراک پختہ ہو چکا تھا کہ صرف اردو زبان ہی برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہے جو قرآن وسنت کے حوالے سے بیش بہا خزانوں کی امین اور اسلامی روایات کا گنج گراں مایہ ہے۔ صدرِ محترم کے مطالعہ میں یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور آئی ہوگی کہ بھارت میں آزادی کے بعد جب مرکزی اسمبلی میں رائے شماری ہوئی تو اردو اور ہندی کے لیے ووٹ برابر ڈالے گئے چنانچہ اسپیکر نے اپنا فیصلہ کن ووٹ استعمال کر کے ہندی کو بھارت کی قومی زبان بننے کا موقع فراہم کیا چنانچہ آج بھی ایک زندہ و متحرک زبان کی حیثیت سے دنیا کے ساڑھے چھ ارب نفوس کے درمیاں کم وبیش ڈیڑھ ارب افراد اردو زبان بول اور سمجھ سکتے ہیں جسے 'یونیسکو' نے 'ہندوستانی' کا نام دے کر اردو کے اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شامل ہونے کی راہ مسدود کی ہوئی ہے حالانکہ ہندوستان سمیت ہندوستانی نام کی زباں دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

قائداعظمؒ کی اردو سے والہانہ محبت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جب سر فیروز خاں نون نے انگریزی میں تقریر شروع کی تو ہر طرف سے اردو۔ اردو کا شور اُٹھا تو وہ اردو میں خطاب کرنے پر مجبور ہوئے لیکن چند منٹ بعد ہی پھر انگریزی میں بولنا شروع کیا۔ اردو کے لیے دوبارہ شور ہونے پر فرمایا کہ مسٹر جناح بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ قائدِ اعظم سے نہ رہا گیا اور انھوں نے کرسی صدارت سے اُٹھ کر یہ اعلان فرمایا کہ ''فیروز خاں نون نے میرے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی ہے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ

پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی'' آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ریکارڈ اور '' قائداعظم پیپرز'' جواب پاکستان آرکائیوز میں محفوظ کر لیے گئے ہیں گواہ ہیں کہ قائداعظم نے اپنی اس تقریر کے اختتام پر عظیم فارسی شاعر فردوسی کا یہ شعر بھی پڑھا:

''اگر صلح خواہی نہ خواہیم جنگ وگر جنگ جوئی نہ یابی درنگ''

اشارہ انگریز کی منافقانہ سیاست کی طرف تھا۔

''قومی زبان اچھی طرح نہ بول سکنے'' کی عذرخواہی پر ہم صدرِ گرامی کی توجہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی طرف دلانا چاہیں گے جو اُن کے مرحوم سسر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی بصیرت کے نتیجہ میں قوم کے مکمل اتفاق رائے کا نادر شاہکار ہے اور جس کے نتیجہ میں اردو کو سرکاری زبان کے منصب پر فائز کرنے کے لیے سرکاری ادارے بشمول 'مقتدرہ قومی زبان' قائم کیے گئے۔ جنھوں نے تکنیکی اعتبار سے ہماری قومی زبان کو جو اس وقت عالمی زبانوں میں سربرآوردہ حیثیت کی حامل ہے اُس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں قومی حمیت اور ضمیر کی آواز پر جاری کردہ ایک ہی حکم پر اُردو کا بطور سرکاری زبان فوری نفاذ عمل میں آسکتا ہے۔ مقتدرہ کی جانب سے معتبر تحقیق شائع ہو جانے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اردو کی لسانی ہمہ گیریت کی تہہ میں پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کی جڑیں پیوست ہیں اور ان سب کا یکساں رسم الخط قومی اتحاد و سالمیت کا بھی ضامن ہے۔

ان تمام بدیہی حقائق کے باوجود ہمارے ملک کے سب سے زیادہ آبادی والے صوبے میں انگریزی زبان کو پرائمری سطح ہی سے لازمی زبان قرار دے کر نئی نسل کو بھی ذہنی غلامی میں مبتلا کر دینے کی عاقبت نااندیشانہ کوشش کی گئی ہے ورنہ دنیا مین کہیں ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک نے اپنی قومی زبان کو پس پشت ڈال کر ترقی کی منازل طے کی ہوں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکی قیادت نے اپنی فاتحانہ ترنگ میں آکر شہنشاہِ جاپان سے پوچھا تھا کہ ''مانگو کیا مانگتے ہو'' تو مُحبِ وطن شہنشاہ نے جواب دیا۔ ''اپنے ملک میں اپنی زبان میں تعلیم'' چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جاپان۔ چین۔ جرمنی۔ فرانس۔ روس۔ کوریا نیز دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک کو قومی زبان میں

تعلیم ہی نے ہمدوشِ ثریّا کر دکھایا۔ حال ہی میں عدالت عظمیٰ نے ایک مستحسن فیصلہ یہ کیا ہے کہ تمام عدالتی فیصلوں کا اردو ترجمہ ویب سائٹ میں شامل کر کے اُسے عامتہ الناس کی دسترس میں دیدیا جائے لیکن یہ اقدام پھر بھی اُس وقت تک ناکافی رہے گا جب تک عدلیہ ہر سطح پر اردو میں فیصلے صادر کرنا نہ شروع کر دے یہ ایک آئینی ذمہ داری ہے جس کا صحیح ادراک چیف جسٹس آف پاکستان سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ عدالتوں میں انگریزی زبان کی حکمرانی عوام الناس کے ساتھ ایک ظالمانہ مذاق ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آزادی کے بعد سے آج تک ۶۶ سال کی طویل و صبر آزما مدت گزر جانے کے باجود ہمارا عدالتی نظام غیر ملکی حکمرانوں کے چھوڑے ہوئے نظام سے فی الفور آزادی حاصل نہ کر لے کیونکہ خود ایک امریکی ماہر قانون ڈاکٹر فریڈرک جو کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ اور یونیورسٹی آف ورجینیا میں پروفیسر کے منصب پر فائز رہا ہے اُس کی تمام تحریروں کا مرکز ومحور یہی ہے کہ قانون اور صرف قانون ہی قومی اقتدار اعلیٰ کی علامت ہوتا ہے۔

قارئین گرامی ! اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ جس نے حالیہ چند برسوں میں سماجی۔ اقتصادی اور انتظامی شعبوں میں شفاف انصاف مہیا کر کے تاریخ رقم کی ہے اپنی اولین آئینی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے قومی زبان کو ملک کی سرکاری و دفتری زبان قرار دے کر قوم کا سر فخر سے بلند کر دے اور جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا ملک کی اعلیٰ ترین آئینی سطح پر آرٹیکل ۲۵۱ کی جس طرح تحقیر و تذلیل کی گئی ہے اُس کا فوری نوٹس لیا جائے تا کہ آئین شکنی کی آئندہ کوئی جرأت نہ کر سکے۔ اس مبارک اقدام کے لیے حالات نہایت سازگار ہیں کہ گزشتہ جون کے آخری ہفتہ میں عدالت عالیہ لاہور اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی ایک آئینی درخواست سماعت کے لیے منظور کر چکی ہے اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو نوٹس بھی جاری کر دیئے گئے ہیں علاوہ ازیں ملک کے معروف قانون داں جناب محمد اسمٰعیل قریشی کی آئینی درخواست بھی کئی برسوں سے اس موضوع پر معرض التوا میں چلی آ رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری باصلاحیت انصاف پسند اور محب وطن عدلیہ انصاف میں مزید تاخیر کا الزام اپنے سر نہیں لے گی۔

ذیلی اداریہ

'کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی'

ابھی راقم الحروف کے عزیز دوست، رفیق دیرینہ اور راولپنڈی اسلام آباد کے ادبی اور صحافتی حلقوں کی معروف ومقبول اور غیور ومُحب وطن شخصیت جناب انوار فیروز کے سانحۂ رحلت کے زخم مندمل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ جہانِ علم وادب کے نیّرِ درخشاں اور برصغیر پاک وہند میں اردو تحقیق وتنقید کی آبرو حضرت ڈاکٹر فرمان فتحپوری داغِ مفارقت دے گئے۔

اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری جو ادبی صحافت میں بھی حضرت نیاز فتحپوری جیسی نابغۂ روزگار ہستی کا معنوی تسلسل تھے اُن کی رحلت کے بعد ''نگار'' جیسا تاریخ ساز مجلۂ علمی اُن کے دم قدم سے پاکستان میں باقی وقائم رہا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے تدبّر وذہانت کے ذاتی اوصاف سے قطع نظر اُن کی اکتسابی علمی صلاحیتوں نے انھیں معاصرین میں ایک بلند وبالا مقام عطا کیا تھا۔ وہ ایک قندیل علم تھے جس کی نُور پرور شعاعوں نے اردو ادب کی اقلیم کو سرچشمۂ انوار بنا دیا تھا۔ مجملہ دیگر، اُن کا عطا کردہ ورثہ شہرۂ آفاق تصانیف وتالیفات پر مشتمل ہے اور کون ہے جو اُن کی قلمی کاوشوں کی مظہر وقیع مطبوعات مثلاً 'اردو رباعی'، 'اردو کی منظوم داستان'، 'نیا اور پرانا ادب' 'مرزا شوق کی مثنویاں'۔ 'اردو اِملا اور رسم الخط'۔ 'اردو کی نعتیہ شاعری' 'اقبال سب کے لیے' اور 'غالب شاعرِ امروز وفردا' وغیرہ سے اہل قلم ہونے کے باوجود واقف نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ۱۹۵۰ء میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت اور ایسے ہی بے شمار اربابِ دانش وحکمت کی نقل مکانی یورپ میں 'احیائے علوم' کے عہد کی یاد تازہ کرتی ہے جو دانش ورانِ یونان کی اپنے آبائی مسکنوں سے ترکِ سکونت کا رہین منت تھا۔ ڈاکٹر فرمان کی زندگی تمامتر

حصولِ علم اور ترسیلِ علم سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی مکتبی تعلیم کو بھی نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ جامعہ کراچی سے اردو زبان و ادب میں اول پوزیشن لے کر ماسٹرز کیا۔ پھر اسی جامعہ سے اپنے تحقیقی مقالے بعنوان ''اُردو میں منظوم داستانیں'' پر ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کیا پھر ایک اور اہم موضوع ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' کے نتائج تحقیق پر ڈی۔ لٹ کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا اور یہ اعزاز پاکستان میں حاصل کرنے والے وہ پہلے شخص تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی علمی و تعلیمی خدمات بھی محتاجِ تعارف نہیں وہ جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو سے کم و بیش تیس برسوں تک وابستہ رہے اور ''اُردو ڈکشنری بورڈ'' کے چیف ایڈیٹر اور سکریٹری ہونے کا اعزاز بھی اُنھیں حاصل رہا اردو لغت کی تدوین میں اہم خدمات انجام دین یہ وہ منصب تھا جس پر جوش ملیح آبادی۔ نسیم امروہوی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسی شخصیات بھی فائز رہیں۔ ڈاکٹر فتح پوری کو ۱۹۸۵ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے ''ستارۂ امتیاز'' عطا کیا گیا۔

راقم الحروف کو یاد ہے کہ اَسّی کی دہائی کے آخر میں اپنے نانا مرحوم جناب سیّد عبدالوحید فدؔا گلاؤٹھوی (تلمیذ و نورتن نواب مرزا داغ دہلوی) کے انتخاب کلام (فارسی و اردو) اور اس پر ایک مفصّل تحقیقی مقالے کے ساتھ اپنی مُرتبہ کتاب ''برگ سبز'' کے سلسلہ میں جستجو تھی کہ یہ مصرع ''برگِ سبز است تحفۂ درویش'' کس کی تخلیق ہے اور اس کا مصرعۂ اوّل یا ثانی کیا ہے چنانچہ میں نے متعدد اہلِ علم سے رابطہ کیا جن میں فارسی کے استاد پروفیسر کرم حیدری مرحوم بھی شامل تھے سب ہی نے بتایا کہ مصرعۂ اول ہے ''چہ کند بے نوا ہمیں دارد'' لیکن میرے وجدان نے اس مصرع کو قبول نہ کیا۔ محترم ڈاکٹر جمیل جالبی اُن دنوں اسلام آباد ہی میں تھے۔ میں نے اُن سے بھی ایک ملاقات میں یہی پوچھا تو اُنھوں نے مجھے فوراً پروفیسر فرمان فتح پوری سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ چند دن بعد میرا کراچی جانا نکل آیا اور وہاں پہلی فرصت میں ''اردو ڈکشنری بورڈ'' کے دفتر جا پہنچا جہاں میرے حاضری دینے کا یہ دوسرا موقع تھا جب کہ پہلی بار اسی دفتر میں میری ملاقات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری سے یہ ملاقات ایک

علمی یادگار تھی جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا اُن کی ذہانت وفطانت اور کثیر الجہت آگہی کا نقش آج تک میری لوحِ حافظہ پر محفوظ ہے انھوں نے میرا مدعا سنتے ہی سعدیؒ کا شعر سنا دیا اور پسِ پشت دیوار پر موجود شیلف سے نکال کر 'کلیاتِ سعدیؒ' بھی دکھادی جس میں مکمل شعر اِس طرح موجود تھا کہ میرے وجدان کی خلش بھی دور ہوگئی !

مرہمِ زخمِ جان و خاطرِ ریش   برگِ سبز است تحفۂ درویش

مرحوم ڈاکٹر صاحب سہ ماہی 'الاقرباء' کے مدّاحین میں تھے جو میرے لیے باعث اعزاز تھا مجلّے کی انتظامیہ کی جانب سے بھیجے جانیوالے ایک مراسلہ کے جواب میں فرماتے ہیں:

''۔۔۔۔آپ کا الطاف نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ یاد فرمایا سرِ دست مصروفیت ایسی ہے کہ میں 'الاقرباء' کے پہلے شمارے میں شرکت سے محروم ہونگا۔ آئندہ شمارے میں انشاء اللہ شریک رہونگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقاصد میں کامران وشاد کام کرے۔ والسلام۔ منصور عاقل صاحب کو میرا سلام پہنچاسکیں تو بڑا احسان ہوگا۔ والسلام''

''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

البتہ مُحبّی انوار فیروز مرحوم سے صحافتی وادبی رفاقت وقرابت کا عرصہ کم وبیش نصف صدی پر مشتمل ہے۔ انشاء اللہ اُن کے اعلیٰ کردار، فکر شعر اور صحافتی اوصاف پر آئندہ کسی نشست میں تفصیلاً اظہار خیال کرونگا۔ 'الاقرباء' کے صفحات اکثر وبیشتر ان کے رشحاتِ قلم سے مزیّن رہے ہیں

''خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را''

سید انتخاب علی کمال

قرآن و احادیث کا جمال، فن تاریخ گوئی کا کمال

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ سورۃ الانعام کی آیت ۵۹ میں ارشاد فرماتا ہے۔ ''اور اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی انہیں وہی جانتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے۔ اور جو پتا گرتا ہے وہ اسے جانتا ہے اور کوئی دانہ نہیں زمین کی اندھیری میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک جو ایک روشن کتاب میں لکھا نہ ہو۔'' (ترجمہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی) اسی آیت مبارکہ کا ایک دوسرا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ ''اور اسی کے یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں خزانے تمام مخفی اشیاء کے ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے۔ جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی خشک اور تر چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں۔'' (ترجمہ حکیم الامت مولیٰنا اشرف علی تھانوی) یہاں راقم الحروف نے دو مختلف مترجمین کے تراجم پیش کئے تا کہ قارئین پر واضح ہو سکے کہ دونوں مکتبۂ فکر کا بنیادی مفہوم ایک ہی ہے۔

اسی سورۂ مبارکہ میں مزید ارشادِ ربانی ہے وَ تَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ (آیت ۱۵۴) ترجمہ ''ہر شے کا مفصل بیان ہے'' اور پھر آیت ۳۸ میں یہ بھی فرمادیا کہ ''اس کتاب میں ہم نے کوئی شے نہیں چھوڑی''۔ بلاشبہ تمام علوم کا منبع اور سرچشمہ قرآن پاک ہی ہے۔ حروفِ تہجی یا ''ابجد'' کے اٹھائیس (۲۸) حروف بھی سورۂ آلِ عمران کی ۱۵۴ ویں آیت میں ارشاد فرمادیئے۔ ثُمَّ اَنزَلَ عَلَيكُم... سے وَاللهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○ تک تمام حروفِ تہجی موجود ہیں۔ جب کہ سورۂ جن کی ۲۸ ویں آیت وَاَحصىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (ترجمہ اور اس نے ہر چیز کی گنتی شمار کر رکھی ہے) گویا جمیع اشیاء کی محدودیت، محصوریت اور متناہیت میں دراصل عدد، گنتی اور شماریات کا تصور موجود ہے۔ غالباً اسی لیے سورۂ النحل: آیت ۱۱ میں ارشاد فرمایا اِنَّ فِي ذٰلِكَ

لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْن ترجمہ: بے شک اس میں نشانی ہے دھیان کرنے والوں کے لیے۔ پھر اسی سُورت میں "یعقِلُوْن" (عقل مندوں) اور "یَذَّکَّرُوْن" (سمجھ داروں) کو بھی مخاطب کیا حرفِ "کُن" میں پوشیدہ مشیّتِ الٰہیہ کے اَمر تکوینی کے تصوُّر سے تو فرشتوں کے پَر جلتے ہیں مگر خالقِ حقیقی نے تخلیقِ کائنات کے اَمر میں حرف واعداد میں ایسے اسرار رکھے ہیں کہ جنھوں نے ہمیشہ مختلف قوموں اور علوم وفنون پر حُکمرانی کی ہے۔ بابل کی تہذیب ہو یا یونان کے حُکما کا دور، فیثا غورث کے افکار ہوں یا مُسلم عُرفاء وعُلما کی پُر نور دنیا، اپنے پہلے تعارُف سے، کمپیوٹر کے کرشمات تک۔ عدد کی حکومت مُسلّمہ رہی ہے۔ غور کریں تو حُروف واعداد کا سلسلہ خُدا اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جُڑا نظر آتا ہے۔

ماہر علوم مخفی محترم جناب محمد اکمل خان بلوچ صاحب نے لاہور کے جریدے مجریہ ۲۰۱۳ عیسوی میں "ضمیمہ جات مقبول وحواشی" کے حوالے سے لکھا ہے:

"تفسیرِ برہان میں بحوالہ تفسیر عیاشی بروایت محمد بن قیس منقول ہے کہ میں نے جناب امام محمد باقر علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ابو یاسر اور حُیَیّ بن اَخطب مع بخران کے یہودیوں کے ایک گروہ کے کچھ افراد جنابِ رَسُولِ خُدا کے پاس آئے اور عرض کی کہ "جو کچھ آپ پر نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں "الٓمٓ" بھی ہے؟" آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "ہاں ہے۔" اُنھوں نے عرض کی "آیا جبرائیل خدا کے پاس سے یہ حروف لائے ہیں؟" فرمایا "ہاں! لائے ہیں۔" اُنھوں نے عرض کی "آپ سے پہلے بہت سے نبی مبعوث ہو چکے مگر ہم سوائے آپ کے ایسے کسی نبی کو بھی نہیں جانتے جس نے اپنی شریعت کے تسلُّط کا زمانہ، اپنی اُمّت کے قیام کی مدّت بتلا دی ہو۔" یہ کہہ کر حُیَیّ ابنِ اَخطب اپنے اَصحاب کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا دیکھو "الف" کا "ایک" ہے "لام" کے "تیس" اور "میم" کے "چالیس" کُل اکہتر (۷۱) برس ہوئے۔ اُن لوگوں سے تعجّب ہے جو اپنے دین کو چھوڑیں اور ایسی اُمّت میں داخل ہوں جس کو اکہتر برس رہنا ہے۔" پھر آنحضرت صلی اللہ

علیہ وآلہ سلم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ "اے محمدؐ! آیا کوئی اور حرف بھی اس کے علاوہ نازل ہوا ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "ضرور نازل ہوا ہے۔" عرض کی "تو بیان کیجئے۔" آپ نے فرمایا "الٓمٓصٓ" اُس نے کہا "ہاں یہ تو زیادہ طویل اور زیادہ گراں ہے۔" "الف" ایک، "لام" تیس، "میم" = چالیس اور "صادؔ" = نوّے، یہ تو ۱۶۱ ہو گئے۔" پھر اس نے جناب رسولِ خُدا سے عرض کہ کی "کیا اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے؟" آپؐ نے فرمایا۔ "ضرور ہے۔" اُس نے عرض کی "تو اُسے بھی بیان کیجئے۔" فرمایا "الٓمٓرٰ" ۔اس نے کہا "یہ تو بہت زیادہ گراں اور طویل ہو گیا۔ الف = ایک ۔لام = تیس۔ میم = چالیس۔ را = دوسو۔" (۱+۳۰+۴۰+۲۰۰=۲۷۱) یہ حساب لگانے کے بعد اُس نے کہا۔ "اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔؟" آپ نے فرمایا۔ "ہے"۔ اِس پر اُس نے عرض کیا۔ "آپ کا معاملہ ہماری سمجھ سے باہر ہو گیا۔ ہم نہیں جانتے آپ کو کیا کیا دیا گیا ہے۔" پھر آنحضرت کے پاس سے اٹھ کر باہر آیا تو اُس وقت ابویاسر نے حیّ بن اخطب سے کہا۔ "تم کو کیا خبر ہے؟ شاید محمد کے لیے ان سب کا مجموعہ مدت مقرر ہوئی ہو یا اس سے بھی زیادہ!"

مُندرجہ بالا حوالہ رقم کرنے کا مقصد قارئین گرامی پہ یہ واضح کرنا ہے کہ حروف کے اعداد یا حروف کی قیمت یا علم الاعداد کی حقانیت دورِ نبوی میں بھی تھی۔ یہ درست کہ تاریخ گوئی کا پہلا تصور فارسی شعراء میں ابوشکور بلخیؒ کے ذہن میں ۳۳۳ ہجری میں آیا۔ اس سے زیادہ نُمایاں نقش، جو تاریخ گوئی اور فنِ جمل سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے وہ فردوسی طوسیؒ (ابوالقاسم ابن شرف شاہ) کے ذہن میں آیا۔ اس کے بعد انوریؒ، شیخ سعدیؒ اور حافظ شیرازیؒ کے نقوش مزید توجہات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ فنِ تاریخ گوئی عروج پاتا رہا۔ اور یہاں تک بعض شعراء نے قرآنی آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تاریخیں نکالی ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں بڑی تلاش و تحقیق کے بعد راقم الحروف نے ایسی ہی تاریخیں اکٹھا کی ہیں جو نذرِ قارئین ہیں۔ اس کی ترتیب سن وار کی جا رہی ہے:

۱۱۱۳ہجری مطابق ۱۷۰۱عیسوی:

(۱) میر غلام علی (بن سیّد محمد نوح) آزاد بلگرامی۔(ولادت: ۱۷۰۴عیسوی مطابق ۱۱۱۶ ہجری۔وفات: ۱۷۸۵عیسوی مطابق ۱۲۰۰ہجری۔)(صاحبِ "خزانۂ عامرہ" اور "سُبحۃُ المرجان" وغیرہ۔) نے نوراللہ برادر شاہ لدھا کی وفات (۱۷۰۱عیسوی مطابق ۱۱۱۳ہجری) کے لیے ذیل کی آیۂ قرآنی سے تاریخ نکالی۔نوراللہ برادر شاہ لدھا کی وفات کے وقت آزاد بلگرامی کی عمر صرف تین سال تھی لہٰذا قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ تاریخ بعد میں کسی وقت کہی ہوگی۔غالباً ۱۱۴۲ ہجری کے قریب کسی سال۔تاریخِ آیتِ مذکور یہ ہے۔

"بُشریٰکُم الیَومَ جَنّات"

۱۱ ہجری ۱۳

اشاریہ: اصل آیت سُورۃُ الحَدید، پارہ ۲۷۔رکوع ۱۸۔"بُشریٰ لکُم الیو مَ جَنّٰت" ہے۔(ترجمہ) ان سے فرمایا جارہا ہے کہ آج تمہاری سب سے زیادہ خوشی کی بات وہ جنّتیں ہیں"۔ آیتِ مذکور میں لفظ "جَنّٰت" جمع کے صیغے میں آیا ہے۔لہٰذا "جنّات" لکھا جاسکتا ہے۔صرف اعداد کی مجبوری نہیں ہے۔(کمالؔ)

۱۱۳۱ہجری مطابق ۱۷۱۸عیسوی:۔

(۲) عبدالجلیل واسطی بلگرامی (ابن امیر احمد) نے ۱۷۱۸عیسوی مطابق ۱۱۳۱ہجری میں جلوس محمد شاہ ابن شاہ عالم بہادر شاہ کی تاریخیں ان آیاتِ قرآنی سے نکالیں۔

(الف) "اِنَّکَ عَلیٰ صِراطٍ مُّستَقِیم"

۱۱ ہجری ۱۳۱

(پارہ ۲۵، سورۃ الزخرف: آیت ۴۳)

(اشاریہ): (ترجمہ) بے شک تم سیدھی راہ پر ہو۔

(ب) "وَاللّٰہُ یَقضِی الحَق"

۱۱ ہجری ۳۱

(پارہ نمبر ۲۴، سورۃ المومن، آیت ۷۸)

(اشاریہ): (الف) اصل آیت یہ ہے۔ فَإِذَا جَآءَ أَمْرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالْحَقِّ ترجمہ: پھر جب اللہ کا حکم آئے گا۔ سچا فیصلہ فرمایا جائے۔ اصل آیت میں "بِـــالْـحَــقِّ" وارد ہوا ہے۔ جب کہ عبدالجلیل واسطی نے "اَلْحَقِّ" سے تاریخ نکالی ہے۔

(ب) عبدالجلیل واسطی بلگرامی کی مندرجہ بالا تاریخوں کی آیات مذکورہ میں واقعۂ متعلقہ پر دلالت کرنیوالے الفاظ نہیں ہیں۔ (کمال)

بحوالہ تذکرہ درفشاں ص ۴۷۳۔ مقالات الشعراء ص ۴۰۹۔ ماخوذ از مفتاح التوریخ ص ۲۹۰

۱۱۳۸ ہجری مطابق ۱۷۲۵ عیسوی:

(۳) آزاد بلگرامی نے عبدالجلیل واسطی بلگرامی (ابن امیر احمد) کی وفات ۱۷۲۵ عیسوی مطابق ۱۱۳۸ ہجری پر موصوف کی تاریخ وفات مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے نکالی:

(الف) اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ ہ جَنّٰتُ عَدْنٍ

۱۱ ہجری ۳۸

(پارہ نمبر ۱۳، سورۂ رعد آیت ۲۲/۲۳)

(اشاریہ) مندرجہ بالا تاریخ دو آیات سے مرکب ہے۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ۔ آیت ۲۲ کا آخری ٹکڑا ہے۔ جس کا ترجمہ: انہیں کے لیے پچھلے گھر کا نفع ہے۔" اور "جنّٰتُ عَدْنٍ" آیت ۲۳ سے ہے۔ جَنّٰتُ عَدن کا مطلب "ہمیشہ رہنے والی جنتیں" عَدن باب ضَرَبَ سے مصدر ہے بمعنے مقیم ہونا۔ (کمال)

آزاد نے عبدالجلیل بلگرامی کی وفات کی اور تاریخ بھی آیتِ قرآنی سے نکالی۔

(ب) "لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُو الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ"

۱۱ ہجری ۳۸

(سورہ یونس آیت ۲۶)

ماخوذ: مقالات الشعراء ص ۱۳/۳۱۴۔ از تذکرہ درفشاں ص ۴۵

(اشاریہ): ترجمہ: "بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے۔ اور اس سے بھی زائد" (کنزالایمان) بظاہر اس تاریخ کا حُسن اس ترجمہ سے واضح نہیں ہوتا۔ لیکن آیت مذکور "لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُو الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ" کی تفسیر پر نظر ڈالیں تو اس تاریخ کی خوبی دوچند ہو جاتی ہے اور آزاد بلگرامی کے لیے

داد کے کلمات نکل پڑتے ہیں۔آپ بھی تفسیر ملاحظہ فرمائیں: ''بھلائی والوں سے اللہ کے فرماں بردار بندے مومنین مراد ہیں۔اور یہ جو فرمایا کہ اُن کے لیے بھلائی ہے اس بھلائی سے مُراد جنّت ہے اور زیادت اس پر دیدارِ الٰہی ہے۔(خزائن العرفان فی تفسیر القرآن)

۱۱۴۳ ہجری مطابق ۱۷۳۰ عیسوی

(۴) میر لطف اللہ عرف شاہ لدھا (بن سیّد کرم اللہ) کی وفات (۱۱۴۳ ہجری/۱۷۳۰ عیسوی) پر آزاد بلگرامی نے تین آیاتِ قرآنی سے تین تاریخ ہائے وفات حاصل کیں۔

(الف) مُقَرَّبُوْنَ ۝ فِی جَنّٰتِ النَّعِیمِ ۝

۱۱ ہجری ۴۳

(سورۂ واقعہ آیت ۱۱-۱۲)

(اشاریہ): مذکورہ بالا تاریخ آزاد نے سورہ واقعہ کی دو آیات سے حاصل کی ہے۔آیت ۱۱ اور آیت ۱۲

(ب) وَلَهُم رِزْقُهُم فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا

۱۱ ہجری ۴۳

(سورۂ مریم: آیت ۶۲)

(ج) رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيكُم اَهلَ البَيتِ اِنَّهٗ حَمِيد'' مَجِيد''

۱۱ ہجری ۴۳

(سورۂ ہود: آیت ۷۳)۔اصل آیت میں رَحمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عليكم اَهلَ البيت ہے۔

(مندرجہ بالا تینوں تاریخیں تذکرۂ درفشاں سے ماخوذ ہیں)

۱۲۰۹ ہجری مطابق ۱۷۹۴ عیسوی

(۵) انگریزی زبان کی کتاب ''Arabic, Arwi and Parsian in Sarandib and Tamil Nadu'' کے صفحہ ۳۴۳ پر لکھا ہے: (معذرت چاہتا ہوں کہ سہواً کتاب کی خاتون مُصنفہ اور ناشر کا نام میں نوٹ نہیں کر سکا اور ذہن سے نکل گیا ہے قارئین کرام اگر میری رہنمائی فرمائیں تو ممنون رہوں گا)

" Makkanlal Khirad, a student of saint "Abdul Ali Bahrul Ulum of Madras, a very well-known scholar in Arabic and Persian wrote the following line

as a chronogram for the "MASJID WALAJAHI" at TRIPLICANE waich was built in 1209 AH."

"The line is: ''ذِکرُ اللّٰہِ اکبر'' dhkrullahi adkbar"

۱۲ ہجری ۰۹

۱۲۶۴ ہجری مطابق ۱۸۴۷ عیسوی

(۶) ۱۲۶۴ ہجری مطابق ۱۸۴۷ عیسوی میں کسی مظہر علی شاہ نامی شخص کی وفات ہوئی تو احمد مُرادآبادی احمد حُسین نے ان کی تاریخ وفات کہی

"اَلعَاقِبَۃُ لِلمُتَّقِین"

۱۲ ہجری ۶۴

بحوالہ "غرائب الجُمل" ص ۱۰۹۔ تذکرۂ دُرفشاں ص ۶۰

۱۲۷۷ ہجری مطابق ۱۸۶۰ عیسوی:

(۷) مولوی الطاف حُسین، حالی پانی پتی نے ۱۲۷۷ ہجری مطابق ۱۸۶۰ عیسوی میں نواب مُحمد مُصطفیٰ خاں شیفتہ (شاگرد مرزا اسداللہ خاں، غالب دہلوی) کا انتقال ہوا تو حالی نے تاریخ کہی:

جَزاءُ ھُم بِمَا صَبَرو اجَنّاتُ وَّحَرِیرًا"

۱۲ ۷۷

(سورۂ دھر: آیت ۱۲)۔ تذکرۂ درفشاں

(اشاریہ) : سورہ دہر: آیت ۱۲ دراصل اس طرح وارد ہوئی ہے۔ "وَجَزٰ ھُم بِمَا صَبَرُو واجَنَّۃً وَّحَرِیرًا" جس کا ترجمہ کنزالایمان میں یہ ہے "اور اُن کے صبر پر اُنہیں جنّت اور ریشمی کپڑے صِلہ میں دیئے۔" اور اشرف علی تھانوی نے اپنے ترجمہ میں یہ لکھا ہے۔ "اور اُن کی پختگی (یعنی استقامت فی الدین) کے بدلے میں اُن کو جنّت اور ریشمی لباس دے گا"، یعنی دونوں مترجمین نے "جَنَّۃ" کو صیغہ واحد میں ترجمہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے "جَنَّۃ" و احد ہی ہے "جَنّات" جمع ہے اور اس کا ترجمہ جنّتیں ہوگا۔ مگر تذکرۂ دُرفشاں کے مؤلف و مرتب قبلہ مہر تقوی ۔ جے پوری

نے لکھا ہے "چونکہ تاریخِ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی ہے اس لیے حالی نے "جَــنَّــة" کی جگہ "جَــنَّــات" استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں مجتہد العصر مولوی دلدار علی نے بجائے "فَرَوحٌ" وَّرَيحَانٌ" O وَجَنَّتُ نَعِيمٍ O "سورہ واقعہ: آیت ۸۹ کے "هٰهُنـا رَوحٌ" وَّرَيحَانٌ" و جَنَّاتُ النَّعِيمِ" کر دیا ہے۔ اس کے بعد صاحبِ تذکرۂ دُرفشاں مزید تحریر فرماتے ہیں کہ چونکہ نواب شیفتہ نے شدائدِ مرض کا بڑے صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس لیے اس آیت کا مضمون اُن کی وفات کے لیے نہایت مناسب تصور کیا گیا۔ یعنی جنابِ باری تعالیٰ نے بعوض اُن کے صبر کے بہشت اور بہشت کا ریشمی لباس ان کو عنایت کیا۔ (مقالہ نگار)

۱۲۸۳ہجری مطابق ۱۸۶۶ءعیسوی

(۸) جمشید جی نامی ایک پارسی شخص کا ۱۲۸۳ہجری مطابق ۱۸۶۶عیسوی میں انتقال ہوا تو جویا مرادآبادی (صاحبِ سرودِ غیبی) نے قرآنی آیت سے مندرجہ ذیل تاریخ کہی:

"اُولٰئكَ اَصحَابُ النَّارِ هُم فِيهَا خَالِدُونَ"

۱۲ ہجری ۸۳

(تذکرۂ درفشاں اور سرورِ غیبی۔)

(اشاریہ): سُورۃ البقرہ: آیت ۲۱۷ قرآنِ حکیم میں اس طرح نازل ہوئی ہے۔ "اُولٰـــئك اَصحَابُ النَّارِ هُم فِيهَا خَالِدُونَ O" ترجمہ اور وہ دوزخ والے ہیں۔ انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اس ترجمہ کے مطابق پارسی شخص کی موت کے لیے نہایت موزوں تاریخ کہی ہے۔

۱۲۸۹ہجری مطابق ۱۸۷۲عیسوی:

(۹) جویا مرادآبادی ۔ جے پوری (میر محمد علی ابن حکیم سیّد نجف علی۔) کے برادرِ عزیز سید خورشید علی ۱۲۸۹ ہجری مطابق ۱۸۷۲عیسوی میں جے پور سے مرادآباد جانے لگے تو جویا مرادآبادی (صاحبِ سَرودِ غیبی) نے مندرجہ ذیل قرآنی آیت سے یہ تاریخ کہی:

"وَاللّـــهُ خَيـرٌ حَـافِظـاً"

۱۸ عیسوی ۷۲

(اشاریہ) : مندرجہ بالا تاریخ سورۂ یوسف کی آیت ۶۴ یعنی "فَاللّٰہُ خَیر" حَافِظاً ترجمہ: تو اللہ سب سے بہتر نگہبان ہے۔" سے اَخذ کی گئی ہے۔ جسے راقم الحروف نے تذکرۂ درفشاں سے لیا ہے۔

۱۲۹۰ ہجری مطابق ۱۸۷۳ عیسوی:

(۱۰) مولوی معشوق حسین، اطہر ہاپوڑی جے پوری (خلف سیّد اُمراؤ علی ابن سیّد ثناء اللہ) کی ولادت ۱۰ شعبان ۱۲۹۰ ہجری مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۸۷۳ عیسوی کو ہوئی۔ اس موقعہ پر کسی نامعلوم صاحب نے قرآنی آیت سے ان کی تاریخ ولادت کہی:

"لَقَد خَلَقنَا الاِنسَانَ فِي اَحسَنِ تَقوِيم "

۱۸ عیسوی ۷۳

(اشاریہ): (پارہ نمبر ۳۰، سورۂ التین، آیت نمبر ۴ ترجمہ: "بے شک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا۔") (تذکرۂ درفشاں نمبر ۷۷)

۱۳۰۳ ہجری مطابق ۱۸۸۵ عیسوی:

(۱۱) مولانا الطاف حسین، حالی پانی پتی نے اپنے بھائی کی وفات پر اس آیتِ مبارکہ سے اس طرح تاریخ وفات نکالی۔

"سَلٰم" عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطفٰی "

۱۳ ہجری ۰۳

(سورۂ النمل آیت ۵۹)۔ تذکرۂ درفشاں ص ۱۲۲

(اشارہ) سورۂ النمل کی آیت ۱۵۹ اس طرح وارد ہوئی۔ قُلِ الحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلٰم" عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطفٰی آللّٰہُ خَیر" اَمَّا یُشرِکُون ط ترجمہ: تم کہو: سب خوبیاں اللہ کو اور سلام اس کے چنے ہوئے بندوں پر؛ کیا اللہ بہتر ہے یا ان کے ساختہ شریک۔" (کنز الایمان)

۱۳۰۴ ہجری مطابق ۱۸۸۶ عیسوی:

(۱۲) ۴ ربیع الاوّل ۱۳۰۴ ہجری مطابق ۲ دسمبر ۱۸۸۶ عیسوی میں حکیم سید انوار

احمد ابن سید نور الحسن کا دہلی میں انتقال ہوا۔ آپ کی وفات پر کسی گمنام صاحب نے آپ کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی تھی۔

"سَلَامٌ" عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

۱۳ ہجری ۰۴

(سورۃ النمل آیت ۵۹۔ نقوش لاہور ص ۱۱۳)

۱۳۱۵ ہجری مطابق ۱۸۹۷ عیسوی:

(۱۳) خواجہ الطاف حسین حالی نے "حیاتِ جاوید" میں نام کی صراحت کے بغیر سر سید احمد خاں کی تاریخ وفات پر یہ آیت قرآنی لکھی ہے۔

"اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ"

۱۳ ہجری ۱۵

(سورہ آل عمران: آیت ۵۵)۔ "حیاتِ جاوید" الطاف حسین حالی۔

"سر سید کا ماتم" از منشی وجاہت حسین جھنجھانوی "سرود رفتہ" از غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری۔ ماخوذ تذکرہ درفشاں۔ سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری

۱۳۳۰ ہجری مطابق ۱۹۱۱ عیسوی:

(۱۴) انڈیا (بھارت) سے شائع ہونیوالی انگریزی زبان کی کتاب "عربک، آروی اینڈ پرشین (فارسی) اِن سراندیپ اینڈ تامل ناڈو" کی صاحب کتاب ہندو خاتون نے کتاب کے صفحہ ۳۴۴ پر لکھا ہے:

" In Al.Masjidul Jadid (New Mosque) in Vaniyambadi, the following verse is found, denoting the year of its the construction 1330 A.H:

"وَقَالَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ"

۱۳ ہجری ۳۰

(پارہ نمبر ۲، سُورۃ البقرۃ۔ آیت ۱۴۹)

(اشاریہ): ترجمہ: اور اللہ واحد نے کہا "اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کرو" اس جملے میں "اپنا منہ

مسجد الحرام کی طرف کرو" قرآنی آیت کے الفاظ ہیں۔۔۔افسوس صاحب کتاب نے یہ حوالہ نہیں دیا کہ اس جملے کو عددوں سے ہم آہنگ کس نے کیا (کمال)

۱۳۳۲ ہجری مطابق ۱۹۱۳ عیسوی:

(۱۵) متذکرہ بالا انگریزی زبان کی کتاب صفحہ نمبر ۳۴۴ پر ہی ایک اور تاریخ بھی ہے:

" In the Big Mosque at Baqiyat, Velllore the following chronogram is inscribed denoting 1332 AH, the year of its construcion"

" اُذکُروا اللّٰہ قِیٰمًا وَّقُعُودًا"

۱۳ ہجری ۳۰

کتاب "عربک، آردو اینڈ پرشین اِن سراندیب اینڈ تامل ناڈو کے صفحہ نمبر ۳۴۴ کی ۲۷ ویں سطر پر یہ آیت اسی طرح لکھی ہے۔ جیسی راقم الحروف نے سطرِ بالا میں لکھا ہے۔ موجودہ حالت میں آیت مذکورہ کے اعداد ۱۳۳۳ ہوتے ہیں اور کتاب میں مسجد کی تعمیر ۱۳۳۲ لکھی ہوئی ہے۔ جب کہ قرآنِ حکیم کی سورہ النساء کی آیت ۱۰۳ میں فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُودًا لکھا ہے۔ مندرجہ بالا تاریخ میں "قِیامًا" چھپا ہوا ہے اگر اسے "قِیٰمًا" لکھا جائے تو اعداد میں ایک عدد کی زیادتی دُور ہو جائے گی اور مسجدِ ہذا کی تعمیر کا صحیح سنہ ۱۳۳۲ حاصل ہو جائے گا۔ یہ غلطی صاحب کتاب یا کتاب کے کمپوزر نے کی ہے۔ نیز تاریخ گو کا نام اس تاریخ میں بھی نہیں ہے غالباً تاریخ گو کا نام ظاہر کرنے یا تلاش کرنے کی طرف توجہ صاحب کتاب کی نہیں رہی (کمال)

۱۳۴۶ ہجری مطابق ۱۹۲۶ عیسوی:

(۱۶) ۱۳۴۶ ہجری مطابق ۱۹۲۶ عیسوی برلن (جرمنی) کی جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ تو پروفیسر حامد حسن قادری (ابنِ مولوی "قرآن و احادیث کا جمال، فنِ تاریخ گوئی کا کوئی"۔ از انتخاب علی کمال احمد حسین قادری بچھرایونی (مؤلف داستانِ تاریخ اردو۔ شاگرد حضرتِ راز رام پوری) نے اس مسجد کی تاریخ اذان کے کلمات سے نکالی:۔

"حَيَّ عَلَى الصَّلٰوۃِ ط حَيَّ عَلَى الصَّلٰوۃ ط حَيَّ عَلَى الفَلَاحِ ط حَيَّ عَلَى الفَلَاحِ ط"

۱۹ عیسوی ۲۶

(ماخوذ: روزنامہ امروز کراچی ۱۹۵۷ء۔ تذکرہ درفشاں ص ۱۳۸۴)

(اشاریہ): (الف) حامد حسن قادری قرآنی آیات سے تاریخ نکالنے میں کافی مہارت رکھتے تھے انھوں نے متعدد موقعوں پر قرآنی آیات سے تاریخیں نکالی ہیں۔ موصوف کی اُن تاریخوں کا ذکر راقم الحروف اکتوبر/دسمبر ۲۰۱۱ عیسوی مطابق ۱۴۳۳ ہجری میں شائع ہونے والے سہ ماہی ''الاقرباء'' اسلام آباد میں بھی کر چکا ہے لہٰذا دلچسپی رکھنے والے قارئین مُندرجہ بالا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں ان کی دیگر تاریخوں کا مزید ذکر باعث طوالت ہوگا۔

(ب) اس تاریخ میں پروفیسر صاحب نے ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوۃِ'' میں تائے مُدوّرہ کے چار سو (۴۰۰) شمار کیے ہیں۔

جبکہ خود پروفیسر صاحب نے ''وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی'' (جو اُنھوں نے ۱۹۰۰ عیسوی مطابق ۱۳۱۸ ہجری میں امیر مینائی کی وفات پر کہی تھی۔) میں ''آخـــرۃ'' کی تائے مُدوّرہ کے پانچ عدد شمار کیے ہیں۔ جو اصولی طور پر غیر صحیح ہے۔ بالخصوص ایسی صُورت میں جبکہ آواز بھی ''ت'' کی پیدا ہورہی ہو۔ ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوۃِ'' ایک بار ساکن ہے۔ دوسری بار متحرک۔ تو متحرک ''تا'' میں آواز بھی ''ت'' ہوگی اور ساکن میں ''ہ'' کی۔ لہٰذا متحرک ''ۃِ'' میں عدد (۴۰۰) ہوں گے ساکن ''ہ'' میں پانچ عدد شمار ہوں گے۔ پروفیسر صاحب کا دونوں مقامات پر ''تائے مُدوّرہ'' کے ۴۰۰ عدد شمار کرنا اُصولی طور پر غیر صحیح ہے۔

۱۳۸۰ ہجری مطابق ۱۹۶۰ عیسوی:

(۱۷) متذکرہ بالا انگلش کتاب کے صفحہ نمبر ۳۴۴ پر ایک اور تاریخ ملتی ہے:

"In the Mosque at Jamial Mohamed College Trichy,the following words are used to denote the Christian era of its construction, 1960 AD:

"إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ"

۱۹ عیسوی ٦٠

Innassalata tanha anil fahsha i walmunkar. Meaning: Undoubtedly, prayer forbids from indecency and evil things.

(۱۸) اسی کتاب میں ایک اور ہجری سنہ کی تاریخ بھی موجود ہے:

And to denote the corresponsing Hijra year, 1380, following words which are also very apt have been formed:

Ma Arafnaka Haqqa Ma rifatika

مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ

۱۳ ہجری ۸۰

Meaning: (Oh Allah !) We have not properly understood you in the way we should have done. (This is part of a tasbih, normally recited after every fard prayer).

(اشاریہ): راقم الحروف نے سطورِ بالا میں بھی عرض کیا ہے کہ "عربک، آردی اور پرشین ان سراندیب اینڈ تامی ناڈو" کی خاتون مصنفہ نے سوائے مکھن لال خرد کی تاریخ کے کسی تاریخ میں تاریخ نکالنے والے تاریخ گو کا نام پیش نہیں کیا۔ موصوفہ اگر تاریخوں کے ساتھ ساتھ تاریخ کہنے والے یا قرآنی آیات سے مطلوبہ تاریخ حاصل کرنے والوں کے نام بھی لکھ دیتیں تو بہت اچھا ہوتا۔ تاریخ حاصل کرنے والوں کی کاوشیں اتنی غیر اہم نہیں کہ کاوش کار کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ میں نے "نقاشِ ثانی بہتر کشد زاوّل" کے ماتحت ان تاریخوں کو شامل کرلیا ہے۔ کہ شاید آئندہ کوئی میری اس پیش کش کی خامیوں کو بھی دور کرے اور بطور ضمیمہ یا تکملہ کوئی معقول اور ٹھوس اضافہ کرے۔

۱۴۱۲ ہجری مطابق ۱۹۹۱ء

(۱۹) راقم الحروف (سید انتخاب علی کمالؔ، مقالہ نگار ہذا) نے ۱۴۱۲ ہجری مطابق ۱۹۹۱ عیسوی کو ایک مسجد "مسجدِ قبا" کورنگی (جس کا سنگِ بنیاد حضرت شاہ احمد نورانی رحمتہ اللہ علیہ نے رکھا) کی تاریخِ آغازِ تعمیر کہی:

''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا '' (سُورۃ النساء: آیت ۱۰۳)

۱۴ ہجری ۱۲

ترجمہ: یاد کرو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے۔ (از کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن)

۱۴۱۳ ہجری مطابق ۱۹۹۲ عیسوی:

(۲۰) ۱۴۱۳ ہجری مطابق ۱۹۹۲ء کو سر تاج المساجد۔ ملیر کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا مفتی راجہ دلدار علی نظامی نے سنگِ بنیاد رکھا اور راقم الحروف سے تاریخ کی فرمائش کی لہٰذا گذشتہ سال مسجدِ قبا کورنگی کے لیے جو تاریخ کہی تھی اُسی میں معمولی تبدیلی کی۔

''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا ''

۱۴ ہجری ۱۳

(اشاریہ): ۲۰۱۳ء میں مقالہ ہٰذا کی تیاری کے لیے انگلش کتاب نظر سے گزری تو اس کے صفحہ ۳۴۴ پر کسی گمنام صاحب کی وہ تاریخ ملی جو اوپر سیریل نمبر ۱۵ پر درج ہے۔ یعنی رقم الحروف سے تقریباً اَسّی سال قبل کہی جا چکی تھی۔ میں اس کو توارُد کہہ سکتا ہوں۔ کیونکہ جس وقت میں نے مندرجہ بالا تاریخ کہی اس وقت وہ کتاب نہیں دیکھی تھی۔ (کمال)

۱۴۲۴ ہجری مطابق ۲۰۰۳ عیسوی:

(۲۱) ۱۴۲۴ ہجری مطابق ۲۰۰۳ عیسوی میں ناظم آباد نمبر ۴ میں مسجدِ طیبہ کی تعمیر مکمل ہوئی تو ایک دُعائیہ نشست میں کمیٹی کے صدر الحاج پروفیسر اقبال حُسین اصلاحی کی درخواست پر مندرجہ ذیل تاریخ کہی:

''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ''

۱۴ ہجری ۲۴

(سورۃ الضُّحیٰ: آیت ۱۱)

ترجمہ: اور اپنے ربّ کی نعمت کا خوب چرچا کرو۔ (از محولہ بالا)

''(اشاریہ): مقالہ ہٰذا میں تمام ہجری و عیسوی سنین کی مطابقت ''تقویم ہجری و عیسوی'' مرتبہ ابوالنصر

محمد خالدی۔ اشاعتِ چہارم ۱۹۹۳ء کے بموجب کی گئی ہے۔ (مقالہ نگار)

اس تاریخ کے ساتھ ہی مقالہ ہٰذا کو ختم کرتا ہوں۔

عمارت کار جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۳ جنوری تا جون ۲۰۱۱ عیسوی میں راقم الحروف کا مقالہ بعنوان ''تعمیرات اور فنِ تاریخ گوئی'' مدیر گرامی جناب حیات رضوی امروہوی صاحب نے اس قدر محبت اور انفرادی توجہ و اہتمام سے اپنے منفرد جریدے میں شائع فرما کر اس ناچیز کو اعزاز بخشا کہ میں اُن کی اس محبت اور حوصلہ افزائی کو فراموش نہ کر سکا اور جب راقم الحروف فریضۂ حج کی ادائیگی کے دوران جیسے ہی ''مسجدِ قبلتین'' میں داخل ہوا موصوف کا مضمون ''بیت المقدس اور قبۃ الصخرہ'' بے ساختہ یاد آ گیا تو نوافل کی اَدائیگی کے بعد مسجدِ ہٰذا اور خانہ کعبہ میں موصوف کے لیے اور عمارت کار کے لیے خوب دعائیں کیں۔ اللہ اُنھیں اردو ادب اور عمارت کاری کے اس عظیم کام میں ثابت قدم رکھے۔

غیر مطبوعہ/ ترجیحاً تازہ نگارشات

(قلمی معاونین کی خدمت میں گزارش)

ہم اپنے معزز قلمی معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ ''الاقرباء'' کو صرف ایسی نگارشات نظم و نثر مرحمت فرمائیں جو غیر مطبوعہ اور ترجیحاً تازہ تخلیقات ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم بعض ایسی نگارشات کو شائع نہیں کر سکتے ہیں جن کی قبل ازیں اشاعت ہمارے علم میں آئی ہے۔ بہر حال ہم شکر گزار ہوں گے اگر ''الاقرباء'' کے لیے ترسیلات پر ''غیر مطبوعہ'' کے الفاظ لکھ دیے جائیں (ادارہ)

محمد طارق غازی۔ آٹوا۔ (کینیڈا)

عثمان خاں کی وصیت کا تجزیہ

عثمان خاں کی وصیت کے تجزیہ سے پہلے دو ایک باتیں ذہن میں رکھنی ہیں۔ یہ کوئی تحریری بیان نہیں تھا جو پڑھ کر سنا دیا گیا ہو۔ اس کے نکات بھی اس انداز پر سوچے سمجھے نہیں تھے کہ ان میں کوئی ترتیب اور تسلسل نظر آئے بے شک یہ سارے خیالات عثمان خاں کے تجرباتِ زندگی کے ماحصل کے طور پر اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھے، لیکن وہ صاحب فراش تھا اور ساری باتیں جس طرح ذہن میں آتی گئیں وہ اسی طرح انہیں بیان کرتا چلا گیا اس اعتبار سے یہ ایک برجستہ تقریر تھی جس میں بعض نکات ایک سے زائد بار بھی بیان ہوئے ہیں اس کی ایک وجہ تو ان پر اصرار ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عثمان خاں کے ذہن میں یہ نہ رہا ہو کہ وہ نکتہ پہلے ذکر میں آچکا ہے اہم ترین بات یہ ہے یہ پورا بیان بڑی خوبی اور خاصی تفصیل سے امور سلطنت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس بیان کو چار شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) دین و شریعت (۲) سیاست و مالیات (۳) خواص (۴) عوام

دین پہ مبنی حکمتِ عملی

عثمان خاں کے نزدیک دین و شریعت کے معاملات صرف ذاتی اشغالِ عبادت تک محدود نہیں تھے، بلکہ اس کی پھیلتی ہوئی سلطنت کے آئین کی ایک اہم دفعہ تھے اس سلسلہ میں اس نے واضح اُصول مرتب کر دئے تھے وصیت کی رو سے عثمان خاں کی سیاست کا اصل اصول یہ تھا کہ دین و شریعت کے مطابق عمل سے روگردانی سلطنت کے زوال کا باعث بنے گی، لہٰذا اس کی ہدایت تھی کہ اس کی جانشیں نسلیں رسولؐ اللہ کی سنت کی پیروی کرتی رہیں امور سلطنت میں احکام

شریعت سے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ شریعت ہی انسانوں میں عدل کا ذریعہ تھی عدل پر دیگر فقروں میں بھی اصرار کیا گیا تھا اس کا واضح حکم تھا کہ اس کی سلطنت میں دین کو دیگر تمام امور پر برتری حاصل رہنی چاہیئے ۔ اسی ذیل میں عثمان خاں نے علمائے دین اور ان کے فیضان کا ذکر کیا جس کی تفصیل خواص کے ذیل میں آئے گی عثمان خاں نے ہدایت کی تھی کہ مستقبل کے عثمانی سلاطین ''دین محمدی، اہل ایمان اور دیگر پیروؤں کی حفاظت'' کے ذمہ دار رہیں چنانچہ اس نے حقوق اللہ کی ادائیگی پر اصرار کیا۔ مالیات کا نظام بھی شرعی احکام کے مطابق مرتب کرنے کی ہدایت تھی، اور حکم تھا کہ سلطنت کے اخراجات شرع کے مطابق طے کئے جائیں۔

سلطنت عثمانیہ کے بانی کو فی الجملہ ایک سیاسی اسلامی نظام قائم کرنے سے دلچسپی تھی اور یہ اس کی نصیحت کا ایک حصہ تھا یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگرچہ عثمان خاں کو خلافت راشدہ کے بعد مسلم دنیا میں کسی خالص سیاسی اسلامی نظام کا سراغ نہیں ملا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ خود اس کا ذہن جس نظام کی تصویر کشی کر رہا تھا وہ کس نوعیت کا ہو سکتا تھا، پھر بھی اس کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں مروجہ سیاسی نظام سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ تاریخ کا ایک معمہ یہ ہے کہ عثمان خاں، اگر اس سنگین مسئلہ پر غور و فکر کرتا اور اس نظام کا کوئی خاکہ یا نقشہ مرتب کرنے کی تگ و دو میں پڑتا جو مسلمانوں کے سیاسی نظام کو واپس اس کی اصل تک لا سکے تو وہ اناطولیہ میں ابن تیمیہ کا دوسرا ہم عصر سیاسی مفکر یا دوسرا فارابی یا دوسرا ماوردی بن کر رہ جاتا۔ اُس سے پہلے سات سو سال کی مدت میں مسلم علماء سیاسیات مسلم سلاطین اور حکمرانوں کو دین و شریعت کے مطابق حکومت کرنے کی ہدایات ضرور کرتے رہے مگر وہ بزرگ بھی خلافت راشدہ کے بعد اسے ارتقائی نظام سیاست بنا کر پیش نہ کر سکے۔

قیاس یہ ہے کہ عثمان خاں کو اگر اپنی علمی بے بضاعتی کا احساس تھا تو ساتھ ہی یہ خیال بھی کہ فقط فلسفہ پیش کرنے سے نتائج نہیں نکلتے نتائج کے لیے عملی سیاست اور اقتدار و سطوت لازمی ہیں اس بنیاد پر اس نے اپنی وصیت میں اسلامی سیاسی نظام کے قیام کا ایک اشارہ دیا جس میں یہ نکتہ

بھی پوشیدہ تھا کہ آنے والے زمانوں میں اس کی سلطنت میں ایسے علماء پیدا ہوں جو سلاطین کے قریب بھی ہوں، ان پر اثر انداز بھی ہوں اور ساتھ ہی کسی ایسے نظام کے مفکر بھی ہوں جسے اسلامی سیاسی نظام کہا جاسکے اور جسے وہ مفکر علماء اور موثر سلاطین باہم مشورے سے سلطنت میں نافذ بھی کرسکیں۔

عثمان خاں کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی وہ سیاست داں تھا افلاطون کی خواہش بھی پوری نہیں ہوئی تھی وہ فلسفی تھا۔

عملی سیاست کے پہلو

دفاع و مالیات: دفاع وجدال عملی سیاست کے دو پہلو ہیں، یہ دونوں پہلو عثمان خاں کے پیش نظر تھے اس کی بیلیق اور پھر سلطنت کے وجود کا انحصار ہی جدال و دفاع پر تھا رومی سلجوقی سلطنت میں ارطغرل کا عروج وترقی جنگ ہی کا مرہون منت تھا مسلسل حربی کارروائیوں ہی کے نتیجہ میں ارطغرل کی چھوٹی سی بیلیق عثمان خاں کی وسعت پذیر سلطنت میں تبدیل ہوئی تھی عثمان خاں کی رائے تھی کہ آنے والے زمانہ میں بھی عثمانی سیاست کا بڑا انحصار اس کی حربی استعداد اور فوجی حکمت عملی پر رہنا ضروری ہے اور اگر اس پہلو کو نظر انداز کیا گیا تو سلطنت باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ عثمان خاں نے سلطانی سیاست کے اس رخ کو غیر معمولی اہمیت دی اس کی وصیت کا پہلا جملہ اسی موضوع پر تھا اور اس کے مخاطب تمام اراکین سلطنت تھے، فقط اس کا جانشیں نہیں مستقبل کی تاریخ میں سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کا سارا تجزیہ فقط اسی ایک نکتہ کی تفہیم، تشریح، تعمیل اور تردید کی داستان ہے۔

جنگ دو قسم کی ہوتی ہے منگولوں سے نبرد آزمائی کی داستانوں کے ذریعہ عثمان خاں کو اس فرق کا اندازہ تھا۔

ایک جنگ ظالمانہ و وحشیانہ، سفاکی و تاراجی کا سبب بنتی ہے۔ انسانی تاریخ ایسی جنگوں سے بھری پڑی ہے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی عدل ہمیشہ اس نوعیت کی جنگوں کا پہلا شکار ہوتا آیا

ہے وہ ایران پر سکندر کی فوج کشی (۱۷۹ ق ھ/۳۳۱ ق م) ہو یا کلنگا پر اشوک موریہ کا حملہ (۹۰۵ ھ/۲۶۵ ق م)، فارس روم کی حربی آویزشیں (۶۲۹-۲۳۰/ ۷ ھ، ۸۰۵ ق ھ) ہوں، یا پہلی (۱۰۹۹-۱۰۹۵/۴۹۲-۴۸۸) اور چوتھی (۱۲۰۴-۱۲۰۱/۶۰۰-۵۹۷) صلیبی جنگیں یا بچوں کی صلیبی مہم (۱۲۱۲/۶۰۹)، یورپ کی تیس سالہ جنگ (۱۰۵۸-۱۰۲۸/ ۱۶۴۸-۱۶۱۸) ہو یا پہلی (۱۹۱۸-۱۹۱۴/ ۱۳۳۶-۱۳۳۲) اور دوسری (۱۹۴۵-۱۹۳۹/۱۳۶۴-۱۳۵۸) عالمی جنگیں، افغانستان پر سوویت یونین کی جارحیت (۱۹۸۹-۱۹۷۹/ ۱۴۰۹-۱۳۹۹) ہو یا عراق ایران خلیجی جنگ (۱۹۸۸-۱۹۸۰/ ۱۴۰۸-۱۴۰۰) ان سب کی قدر مشترک عدل کا خاتمہ اور ظلم کا عام ہونا تھا۔

دوسری قسم کی جنگ وہ ہوتی ہے جس کا مقصد ظالم کو ظلم کرنے سے روکنا ہوتا ہے انسانوں کو عزت اور فراخی کی زندگی کی ضمانت دی جاتی ہے، ان کے حقوق۔ جن کو اسلامی اصطلاح میں حقوق العباد کہا جاتا ہے۔ کا تحفظ کیا جاتا ہے اور معاشرہ کو عدل اور مساوات سے بھر دیا جاتا ہے ان جنگوں میں بے ضرر انسانوں کا قتل عام نہیں کیا جاتا، عام شہریوں پر زمین اور آسمان سے آگ نہیں برسائی جاتی، بستیوں میں عوام کی املاک لوٹی نہیں جاتیں، کھیتیوں، اور باغوں کو تباہ و برباد نہیں کیا جاتا، کھڑی فصلوں کو گھوڑوں کے سموں اور فوجی بوٹوں تلے روندا نہیں جاتا، نہ ان میں آگ لگائی جاتی ہے، صنعت گاہوں کو زمین بوس نہیں کیا جاتا اسی دوسرے طرز کی جنگوں کو عدل اور قیام عدل کا ایک نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے مگر اصل عدل خود جنگ سے نہیں بلکہ حالت امن سے تعلق رکھتا ہے، جس کی تفصیل برصغیر کی مکمل آزادی پر مرکوز ریشمی رومال تحریک کے سرخیل مولانا محمد میاں منصور انصاری، مہاجر کابل، نے 'انواع الدول وحریت الملل' میں بیان کی ہے۔(۱)

دنیا میں ظلم اور عدل کی تاریخ نہیں لکھی گئی لوگ ناموں اور حکمرانوں کی جلالت سے مرعوب ہو کر ان کے بارے میں بعض ایسے تصورات کے پابند ہو جاتے ہیں جو کسی خاص عہد کی سچی تصویر کشی نہیں ہونے دیتے ایسے ناموں میں ایک سکندر مقدونی کا نام ہے جس کی عظمت کے اعتراف میں اس کے نام میں لاحقہ کے طور پر 'اعظم' کا اضافہ کیا جاتا ہے، مگر چیدہ چیدہ

بادشاہوں کے اس لقب کے لیے کچھ واضح شرائط کبھی متعین نہیں کی گئیں۔ یہ ایک مستقل بحث ہے کہ اگر اس پر توجہ دی جائے تو کچھ ادوار کی تاریخ پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ ان میں سے ایک عہد خود مقدونیہ کے حاکم سکندر کا ہے جو محض اس وجہ سے اس کا مستحق ٹھہرا کہ ۲۰ برس کی عمر میں دنیا فتح کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا اور پھر اسے گھر واپس آنا نصیب ہوا نہ اس کی فتوحات کا کوئی انسانی مقصد طے ہو سکا۔

سکندر نے (پیدائش: ۳۵۶ق م/ ۹۷۸ ق ھ) تخت نشینی کے دو سال بعد ۳۳۴ ق م میں ایشیائے کوچک سے اپنی فتوحات کا آغاز کیا اس کے بارے میں خیال یہ ہے کہ اس نے یونانی تہذیب ایشیا اور افریقہ کو دی یہ حقیقت ہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں چند عشروں کے لیے ایشیا اور افریقہ کے نقطۂ اتصال پر یونان میں ایک بڑی علمی تہذیب کا شعلہ روشن ہوا تھا جب کہ باقی دنیا میں عموماً تاریکی تھی لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔ یہاں قابل غور نکتہ بس یہ ہے کہ ۳۳۲ ق م/ ۹۵۶ ق ھ میں سکندر کی موت کے بعد اس کی ۱۲ سالہ بادشاہت ایک دن بھی باقی نہ رہی ایشیا میں اس کا ایک جنرل سلیوکس نکیٹر حاکم بن بیٹھا، مصر کا نیا فرعون سکندر کا دوسرا جنرل بطلیموس سوطر ٹھہرا اور خود سکندر کا اپنا وطن مقدونیہ نیز یونان ایک طویل عرصہ تک تاراج کا شکار رہے، سکندر کی موت کے ۲۰ سال بعد ایشیائے کوچک سے شمالی ہندوستان تک پھیلی ہوئی نکیٹری ریاست ۳۱۲ ق م/ ۹۳۴ ھ میں قائم ہوئی اور تاریخی اعتبار سے ۶۳ ق م/ ۶۸۵ ھ تک باقی رہی، مگر اس ۲۴۹ سال کی مدت میں شمالی ہند، باختریہ، خراسان، فارس، بابلونیہ، اسوریہ اور اناطولیہ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جسے تاریخ ساز کہا جا سکے چنانچہ سلیوکس نکیٹر کا خاندان اگر اس خطہ یا اس کے ٹکڑوں پر حکومت کرتا رہا تو اس کا سبب خود اس خاندان کی لیاقت سے زیادہ علاقائی سیاسی افسردگی تھی۔

مصر میں بطالمہ کی حکومت سکندر کی موت کے ۲۵ برس بعد قائم ہوئی تھی اور ۲۷۳ سال باقی رہی جس میں ایک طویل مدت رومیوں کے باجگزار اور صوبہ دار کی تھی اس پوری مدت میں فقط

ایک، بطلیموس کاڈیس (۱۶۸-۹۰/ ۴۶۹ھ-۵۴۹ھ)، اپنے فلکیاتی کام کی بنا پر معروف ہوا، یا شہوت رانی کے لیے مشہور اسکندریہ کی آخری بطلیموسہ، قلوپطرہ، کا نام ایک عیاش رومی صوبہ دار کی حیثیت سے مصر کی تاریخ میں باقی رہ گیا۔

چنگیزی ریاست کا حشر بھی اسکندری ریاست سے مختلف نہیں ہوا چنگیز کی موت (۱۲۲۷/ ۶۲۴) کے بعد اس کے مفتوحہ علاقے تین خودمختار ریاستوں میں بٹ گئے تھے سب سے پہلے ۱۲۴۹/۶۲۴ میں روس میں سنہرے غول کی حکومت قائم ہوئی جو ۲۶۲ سال بعد ۱۵۰۲ میں گم نامی کا شکار ہوگئی ہلاکو نے ۱۲۵۶/ ۶۵۳ میں فارس اور مغربی ایشیا میں اپنی ایلخانی حکومت قائم کی جو صرف ۷۹ سال بعد ۱۳۳۵/ ۷۳۵ میں ختم ہوگئی۔ آخری اصل منگولی حکومت قبلائی خاں نے چین میں ۱۲۷۱/ ۶۶۹ میں قائم کی جو ۹۷ سال بعد ۱۳۸۶/ ۷۸۷ میں معدوم ہوگئی ان تینوں حکومتوں نے کوئی تہذیبی میراث نہیں چھوڑی۔

چودھویں صدی میں چنگیزی نسل کا مسلم حکمران تیمور لنگ ماورالنہر سے اناطولیہ تک کے علاقہ پر قابض ہوا مگر اس کی یہ وسیع وعریض سلطنت ۳۵ سال سے زائد باقی نہ رہی اور ۱۴۰۵/ ۸۰۷ میں مٹ گئی اس کا نام تاریخ میں ہے کوئی کام نہیں ہے۔

برصغیر میں برطانوی راج ایک صدی کی مدت پوری نہ کرسکا اگر سراج الدولہ کی شکست اور موت (۱۷۵۷/۱۱۷۰) سے سلسلہ ملایا جائے تو وہ حکومت بس ۱۹۰ برس رہی اس نظام نے زبان، لباس کی غلامی چھوڑی مگر دنیا میں جہاں بھی اس کے قدم گئے وہاں سے فقط علم ہی نہیں علمی مزاج بھی مٹ گیا۔

اس تاریخی پس منظر میں یہ جاننا اہم ہے کہ عثمان خاں کی جنگیں کس مزاج کی تھیں اور ان سے وہ کیا سیاسی کام لینا چاہتا تھا

عثمانی سیاست کا فرق

اس سوال کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اگر عثمان خاں بھی سکندر اور سلیوکس، چنگیزی

حکمرانوں، تیمور لنگ اور برطانوی راج کے حاکموں کی طرح ایک ظالم فوجی سالار ہوتا تو اپنی وصیت میں عدل پر اصرار نہ کرتا اور اس کی تاریخ میں شہروں اور ملکوں کی بربادی کی داستانوں کا ایک بڑا حصہ ہوتا اس کی پھیلتی ہوئی سلطنت میں آبادی کا ایک وسیع طبقہ غیر مسلم عیسائی رعایا پر مشتمل تھا وہ حربی طاقت کے ذریعہ ان کا حاکم بن چکا تھا وہ چاہتا تو اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بے انصافی کرنے کی طاقت اس میں تھی وہ ان کے حقوق غصب کرسکتا تھا، ان کی املاک پر قبضہ کر سکتا تھا ان کی معاشی خوشحالی کے امکانات کو مسدود کرسکتا تھا ان کی معاشرتی، تہذیبی اور لسانی روایات کا خاتمہ کرسکتا تھا۔ ان پر اپنا دین عقیدہ، اپنی زبان، اپنی معاشرت تھوپ سکتا تھا مگر اس نے یہ سب نہیں کیا تھا۔

عثمان خاں نے جہاد کو اعلیٰ مرتبہ تک پہنچانے کی وصیت کی تھی اس فقرہ کے دو مفہوم تھے ایک تو یہ کہ بطور حربی اصول اس معاملہ میں مکمل طور پر قانون نبوت کا نفاذ ہو یعنی کمزوروں، ضعیفوں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر شمشیر دراز نہ کی جائے اور جو لوگ اپنا ذاتی دفاع کرنے کے قابل نہ ہوں ان پر تلوار نہ اٹھائی جائے کھیتوں کھلیانوں میں لوٹ مار نہ کی جائے، نہ ہی کھڑی فصلوں میں آگ لگائی جائے انسانی بستیوں اور آبادیوں میں قتل وخون کا بازار گرم نہ کیا جائے اور نہ وہاں نجی اور عامی املاک میں غارت گری مچائی جائے جس قدر ممکن ہو جنگ سے پہلے اور بعد عفو و درگزر سے کام لیا جائے اسی کے پیش نظر عثمان خاں نے ظاہر کیا کہ فوج اور مالیات دونوں سلطنت میں عدل قائم رکھنے میں معاون ہیں اور اس مقصد کے لیے ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

جہاد کو اعلیٰ مرتبہ تک پہنچانے کی وصیت کا دوسرا مفہوم یہ تھا کہ حدیث نبوی میں جنگ کو جہاد اصغر اور اپنی ذات اور کردار کی اصلاح کو جہاد اکبر قرار دیا گیا ہے فوجیوں کا ذاتی کرزدار درست اور ان کا مزاج اعتدال پر ہوگا تو وہ کبھی ظلم نہیں کریں گے یہی جہاد کو اعلیٰ مرتبہ تک پہنچانے کی وصیت کا اصل منشا تھا اس لیے اس کا حکم تھا کہ دیگر تمام امور پر دین کو فوقیت دی جائے اب اگر دین کی فوقیت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسلام غیر مسلم رعایا پر جبراً تھوپ دیا جائے تو اس حکم کا مقصد

سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ دینی احکامات کے مطابق مسلم و غیر مسلم رعایا کے ساتھ انصاف و عدل کیا جائے، حقوق العباد کی بلا کم و کاست ادائیگی کی جاتی رہے عوامی املاک کی مکمل حفاظت کا نظام موثر رہے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب حکمرانوں کے دل میں عوام کا احترام ہوگا عدل کرنے کے سلسلہ میں اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک بڑے مفکر کی مانند عثمان خان کی وصیت کا یہ جملہ یادگار ہے کہ جس کے دل میں اللہ کا خوف نہیں ہوتا اس کے دل میں اللہ کی مخلوق کا ڈر بھی نہیں ہوسکتا۔

یہاں ظلم کے خلاف دوسرا پہلو عثمان خاں کی سیاست کا ابھرنا ہے اس نے کہا کہ سلطنت کے کاموں میں ظالموں اور وہمی لوگوں کا ہرگز کوئی دخل نہ ہو تو ہمات میں مبتلا لوگ کمزور شخصیتیں رکھتے ہیں اور نا اہل ہوتے ہیں، چنانچہ ایسے افراد کبھی بھی حکومت کی طاقت کا سبب نہیں بن سکتے۔ ان کے اوہام انہیں ظلم و فساد پر آمادہ کرتے ہیں عثمان خاں کا نقطۂ نظر تھا کہ توہمات زوال کا باعث بنتے ہیں اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا ظلم بھی ریاست کے زوال کا سبب بنتا ہے اس لیے توہم اور ظلم دونوں سے اجتناب لازمی ہے۔

اقتصادیات کا نظریہ

گزشتہ تاریخ میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ عثمان خاں کی حربی حکمت عملی بجائے خود مقصود نہیں تھی بلکہ دراصل اس کی اقتصادی حکمت عملی کا ایک جزو تھی اپنی بیلیق کی توسیع اس لیے اسے مطلوب تھی کہ ان خطوں کو بیلیق اور پھر سلطنت کا حصہ بنایا جائے جو معاشی مقاصد میں نہایت مفید تھے مگر حاکموں کی نااہلی اور غفلت کے سبب بے کار پڑے ہوئے تھے جب ایسے خطے عثمانی حکومت کے ماتحت آئے تو ان کی ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی اور ان کے منافع تمام رعایا کے لیے عام کر دیئے گئے عثمان خاں کی وصیت میں معاشیات پر بھی یکساں اصرار پایا جاتا ہے۔ وہ فضول اخراجات پر روک لگانے کا حامی تھا لیکن ضروری امور پر خرچ کی تاکید کرتا تھا اس کا کہنا تھا کہ ریاست کے اخراجات شرع اسلامی کے مطابق رہیں گے تو ملک میں عدل کا ذریعہ بنیں گے

ہنگامی حالات سے نپٹنے کے لیے وہ مال میں بچت کا حامی تھا اور اسی کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ مالیات میں مسلسل اضافہ کی کوششیں جاری رہنی چاہئیں اضافہ اور بچت کے اصولوں کے تحت چونکہ خزانہ میں مال کی فراوانی ہوگی تو عثمان خاں تہدید کرتا ہے کہ حکمرانوں کی اس کثرت مال پر فخر اور غرور میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے فخر اور غرور عدل سے روکتے ہیں، ظلم کرنے پر مائل کرتے ہیں اور ریاست کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔

مال میں تکثیر د اضافہ کا ایک ذریعہ تو عثمان خاں کی ابتدائی حربی سیاست میں سامنے آ گیا لیکن ظاہر ہے یہ پائیدار ذریعہ نہیں تھا۔ عثمان خاں نے ایک ذہین حکمران کی طرح اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی اس نے وصیت کی کہ علماء ادباء اور اہل حرفہ کسی بھی ریاست کا ڈھانچہ ہوتے ہیں اس لیے ان کی تعداد میں مستقل اضافہ ہوتا رہنا چاہیئے۔ یہ عثمان خاں کی تعلیمی پالیسی کی بنیاد تھی اس کا حکم تھا کہ تعلیم پر خرچ میں کمی نہیں آنی چاہیئے اس کا نقطۂ نظر افادی تھا، فلسفیانہ نہیں تعلیم کا مقصد اس کے نزدیک محض اچھی ذاتی معاش نہیں بلکہ رشد و ہدایت کا ایک منضبط نظام قائم کرنا تھا وہ چاہتا تھا کہ ہمہ قسم کے علوم دینی تعلیمات کے تابع رہیں تا کہ رشد و ہدایت کا سلسلہ موقوف نہ ہو اور معاشرہ عدل و انصاف کی راہ پر بڑھتا رہے اور علوم کی اشاعت اور توسیع فلاح عامہ کا باعث بنے، نفع اندوزی کا وسیلہ نہیں وہ وصیت کرتا ہے کہ علماء کی تعداد میں اضافہ کیا جاتا رہے ظاہر ہے علماء کی تعداد بڑھے گی تو ان کی علمی کوششوں سے علم کی توسیع ہوگی جو سلطنت کو قابل، مفید اور اچھی استعداد کے لوگوں کی فراہمی کا باعث ہوگی۔

طبقۂ خواص کی تعریف

عام طور پر باور کیا جاتا ہے کہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز اور معاشرہ کا بالائی طبقہ خواص ہوتے ہیں۔ عثمان خاں اس عام غلط فہمی میں مبتلا نہ تھا اس کی وصیت کا غائر مطالعہ یہ نکتہ واضح کرتا ہے کہ خواص سے اس کی مراد وہ لوگ تھے جو عدل میں معاون ہوں چنانچہ اس کی تعریفِ خواص میں چار گروہ ابھرتے ہیں: افواج، مدبرین سلطنت، علماء، اہل حرفہ۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دفاعی حکمت کے ماتحت عثمانی افواج سلطنت میں عدل کے قیام اور نفاذ کا بڑا بنیادی ذریعہ تھیں۔ اسی لیے اس کا نقطۂ نظر تھا کہ صرف اچھے اور قابل افراد ہی کو افواج کی سالاری اور مدبرین ریاست کا منصب دیا جانا چاہیئے ان مناصب پر تقرر کی شرائط بھی وہ طے کر دیتا ہے: ظالم، لالچی، وہمی اور گناہ کبیرہ میں مبتلا اشخاص اعلیٰ سرکاری عہدوں کے لیے نااہل قرار دئے گئے اپنے جانشینوں کو مدبرین ریاست کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہوئے عثمان خان مرحوم افسران کے پس ماندگان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیتا ہے تا کہ ان کی ملی اور سلطنتی خدمات پر شکر گزاری کا حق ادا ہو سکے مرحوم افسروں اور مدبرین کے پسماندگان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی ضروریات کی کفالت کی ہدایت وظیفہ اور پنشن کا اصول طے کرتی ہے۔

عثمان خاں کی وصیت میں علماء کی اہمیت پر بار بار اصرار ملتا ہے وہ علماء کو سلطنت یا حکمرانوں کے ماتحت رعایا یا عامۃ الناس کا ایک طبقہ نہیں سمجھتا بلکہ ان کو تمام دیگر معاشرتی گروہوں پر فوقیت دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ ریاست کی عمارت علماء اور اہل ادب، نیز اہل حرفہ کی مستحکم بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے چنانچہ بالخصوص علماء کے ساتھ تواضع اور اکرام سے پیش آنے کا واضح حکم دیتا ہے اور ان کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنے کو اپنے بعد آنے والوں پر لازم قرار دیتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر تھا کہ علماء کو ریاست یا دیگر اہل خیر کا دست نگر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ علماء کو فارغ البال کرے تا کہ ان کا تمام تر وقت علوم کی خدمت اور توسیع اور معاشرہ کی نگرانی میں صرف ہو اسی مقصد کے لیے وہ تعلیمی نظام کی توسیع پر توجہ دلاتا ہے۔

سلطنت کا اساسی گروہ

عثمان خاں کے نزدیک عوام طبقۂ خواص۔ سالارانِ افواج، مدبرینِ سیاست، علماء اور ادباء، نیز اہل حرفہ۔ سے الگ بھیڑ بکریوں کا گلہ قسم کا کوئی ایسا گروہ نہیں تھے جن کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہو اور سیاسی مقاصد پر بلا تامل قربان بھی اس کے نزدیک یہ سب سے اہم معاشرتی گروہ تھا کیونکہ سلطنت انہیں کی اساس پر قائم ہوتی ہے اور انہیں کے لیے عملاً مؤثر ہوتی ہے عوام

کا وجود نہ ہوتو خواص معدوم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ عثمان خاں کی سیاسی حکمت میں معاشرہ کے تمام گروہ عوام میں داخل اور ان میں شامل تھے اصولی طور پر خواص اپنی حقیقت میں عوام ہی کا ایک حصہ ہوتے ہیں جن کی خداداد صلاحیتوں سے کوئی خاص کام لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً سپاہ کو عثمان خاں بیک وقت عوام اور خواص میں شمار کرتا ہے ایک شخص کی بدنی اور ذہنی استعداد کی بنا پر اسے کسی فوجی منصب پر مقرر کر دیا جاتا ہے مگر اس کے انسانی حقوق حقوق العباد کے زمرہ میں برقرار رہتے ہیں اور تحفظ کا مطالبہ کرتے ہیں چنانچہ عثمان خاں سپاہ کے ساتھ عزیزوں جیسا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اسی طرح اہل حرفہ کو ریاست کا ڈھانچہ قرار دے کے ان کو ضروری مراعات اور سہولتیں مہیا کرنے پر توجہ دلاتا ہے۔ عوام ہی میں اہل ایمان کا خاص گروہ بھی شامل ہے یہ بے نام لوگ سلطنت عثمانیہ کی فکری ریڑھ کی ہڈی تھے اور اندیشہ تھا کہ حربی صورت حال میں یہ طبقہ دشمن کا راست نشانہ بھی ہوگا اور سب سے زیادہ نقصان بھی اٹھائے گا۔ لہٰذا عثمان اس گروہ کو تحفظ مہیا کرنے پر اصرار کرتا ہے مگر یہ کام دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرف عدم توجہ کا سبب نہیں بن سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں عدل کا منشا پورا نہ ہوتا اور ظلم کا رستہ کھل جاتا عثمان خاں اس معاملہ میں اللہ پر بھروسہ کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ جو شخص یا گروہ ظلم کے خاتمہ کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ظالم قوتیں آسانی سے ہار نہیں مان لیا کرتیں اور اس شخص یا ادارے کے خلاف پوری طاقت لگا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جو ظلم کے خاتمہ پر کمر بستہ ہو تو ظلم کے خاتمہ کے لیے اللہ پر بھروسہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جو افراد ایسے نظام کی مدد کے بغیر ظلم کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں وہ اپنے مقصد میں ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں کیونکہ انہیں کہیں سے کمک نہیں ملتی ظلم اندرونی اور داخلی فساد کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے اور بیرونی یورش سے بھی پیدا ہو سکتا ہے دونوں صورتوں میں ریاست پر عوام کا حق ہوتا ہے کہ ان کی جان، مال، آبرو کا دفاع کیا جائے اور ظلم سے انہیں پناہ دی جائے عوام کا سب سے بڑا حق یہ ہوتا ہے اور اُسی کو عام طور سے اہل سیاست کی

فسادمزاجی کا نشانہ بننا پڑتا ہے کیونکہ خودعوام کے پاس اپنے دفاع کی قوت نہیں ہوتی۔ یہ کیفیت ہر سیاسی نظام میں پائی جاتی ہے۔

فقط ایک دیانت دار حکومت ہی عوام کے اس حق کی غیر مشروط ضمانت دیتی ہے عثمان خان نے ایک جملہ میں وہ ضمانت دی جو چھ صدیوں تک موثر رہی اور دنیا میں ظلم کی قوتیں چھ سو سال تک اس ضمانت کو ختم کرنے کے درپے رہیں اور بالآخر ۱۹۲۳/۱۳۴۱ میں اس ضمانت کا شامیانہ آدھی دنیا کے بے زبان عوام کے سروں سے اتار پھینکا گیا۔

عثمان خاں کی یہ ضمانت ایک تاریخی جملہ میں دی گئی تھی جو آج کسی کو یاد نہیں رہا۔ اس کے مؤرخوں کو بھی نہیں اپنی وصیت کے آخر میں عثمان خان نے کہا تھا:

جس کے دل میں خالق کا خوف نہیں ہوتا اس کے دل میں مخلوق کا خوف بھی نہیں ہوتا! اور یاد رہے یہ جملہ دنیا کا ہر انسان نہیں کہہ سکتا۔

حاشیہ

۱۔ انصاری مولانا منصور، نواع الدول وحریت الملل مطبوعہ افغانستان تقریباً ۱۹۲۰ء ص ۱۵-۱۶

محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

اردو ادب میں مشاعرے کی روایت ☆

برصغیر پاک و ہند میں اردو ادب کے حوالے سے مشاعرے کی روایت کم وبیش اُتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ اردو زبان میں شعر گوئی۔ اردو زبان اپنے ارتقائی پس منظر میں لسانی تبدیلیوں کی ایک طویل داستان رکھتی ہے اس داستان میں مقامی علاقائی زبانوں بالخصوص سنسکرت اور ہندی کے الفاظ محاوروں اور روزمرہ کے انجذاب کا عمل بھی شامل ہے۔ غیر ملکی زبانوں سے لسانی اکتساب کے سلسلہ میں عربی اور فارسی نمایاں ہیں۔ خود لفظِ اردو ترکی زبان سے ماخوذ ہے چنانچہ ماضی پر محیط اپنے پس منظر سے حال کے پیش منظر تک یہ زبان اپنے لسانی تنوع اور ہمہ گیریت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے جسے اقوام متحدہ کے معروف ادارے یونیسکو نے بھی حالیہ برسوں میں ہونے والے ایک جائزہ میں تسلیم کیا ہے مگر ''ہندوستانی'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جب کہ اس نام کی زبان دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی بلکہ ہندوستان میں بھی نہیں جہاں قومی و سرکاری زبان 'ہندی' ہے بہر حال اس جملۂ معترضہ سے صرف نظر کرتے ہوئے مشاعرہ کی روایت کے لیے اردو ادب عربی و فارسی ادب کا خاص طور پر مرہونِ منت ہے۔

لفظِ مشاعرہ کے لغوی معنی ''مجلسِ شعر خوانی'' ہے اور اِس لفظ کا مادّہ یعنی مصدر ''مُشاعَ'' ہے جس کا لغوی مفہوم ہر وہ شے یا عمل ہے جو مشترک ہو چنانچہ مشاعرہ بھی ایک سے زیادہ افراد یعنی شعراء کے اشتراکِ عمل کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح شعراء شاعر کا صیغۂ جمع ہے

☆ اس موضوع پر واشنگٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے شعبۂ اردو کی جانب سے جناب پروفیسر جعفری کو حال ہی میں خصوصی لیکچر کی دعوت دی گئی تھی جس میں طلباء اور فیکلٹی اراکین نے شرکت کی پروفیسر موصوف کے یادگار لیکچر پرمبنی زیرِ نظر تحقیقی دستاویز 'الاقرباء' کے معزز قارئین کی نذر کی جارہی ہے (ادارہ)

جس کا مادّہ یا مصدر ''شعر'' ہے جس کے لغوی معنی موزوں و مقفّٰی کلام کے ہیں۔ شعراء و حکماء نے اپنے اپنے انداز میں لفظ ''شعر'' کے مفہوم و معنی بیان کیے ہیں مثلاً اہل عرب کو اپنے کمالِ شاعری پر اس قدر ناز تھا کہ وہ باقی تمام دنیا کو 'عجم' یعنی گونگوں کی دنیا سمجھتے اور کہتے تھے وہیں کے ایک شاعر اور نقادِ سخن (اغلباً اصمعی) نے شعر کی تعریف یوں کی کہ شعر وہ کلام ہے کہ اگر کوئی اُسے سنے تو یہ خیال کرے کہ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں جب کہنا چاہے تو نہ کہہ سکے'' انسائیکلو پیڈیا براٹینیکا کے مطابق ''منظوم و مقفّٰے عبارت میں انسانی جذباتِ لطیفہ کا اظہار شاعری ہے''، مگر حکیم الامّت حضرت علاّمہ اقبال نے جس خوبصورت اور دلپذیر انداز میں شعر کا حقیقی و حتمی تصور پیش کیا اُس کا اندازہ اُن کے درج ذیل شعر سے کیا جا سکتا ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　　شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

علامہ مرحوم چونکہ حالی کے مکتب فکر کا معنوی تسلسل تھے اِس لیے علامہ کے فارسی شعر کے ساتھ ہی خواجہ الطاف حسین حالی کا یہ اردو شعر بھی ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے:

اے شعر دلفریب نہ ہو تُو تو غم نہیں　　　پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تُو

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کا پہلا شاعر کون ہے جس نے پہلا شعر کہا۔ اس سلسلہ میں تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ اردو کے پہلے شاعر ہونے کا اعزاز حضرت امیر خسروؒ کو حاصل تھا۔ اردو کی پہلی غزل جو اُن سے منسوب ہے اس کے ہر شعر کا ایک مصرع فارسی اور ایک اردو میں تھا ظاہر ہے کہ ابتدائی اردو کی شکل وہ نہیں تھی جو آج ہے اس لیے اس پر وہ اثرات غالب تھے جن کا مشاہدہ خسرو کی پہیلیوں اور دوہوں وغیرہ میں بھی کیا جا سکتا ہے فارسی شاعری میں خسرو کو جو عظیم مقام و مرتبہ حاصل تھا اس کے سبب انھیں آج تک ''طوطیِ ہند'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُن کی ولادت تیرھویں صدی عیسوی میں اور وفات چودھویں صدی عیسوی (۱۳۲۵ء) میں ہوئی اس طرح متعدد شاہانِ دہلی بالخصوص غیاث الدین بلبن اور معز الدین کیقباد وغیرہ کے

درباروں میں اُنھیں بحیثیت کثیر اللسان شاعر عظمت وتفاخُر کا مقام حاصل رہا۔ وہ فن موسیقی میں بھی مرتبۂ کمال پر فائز تھے اس حیثیت میں ان کے اردو کلام کو بھی فروغ حاصل ہوا جس میں بلاشبہ ہندی الفاظ بھی شامل تھے لیکن یہی کلام اور اُنکا یہی عہد مستقبل کے روایتی مشاعروں کی عظیم الشان عمارت کی خشتِ اوّل ثابت ہوا۔ عہدِ جہانگیری کا ایک درباری شاعر مُلّا نوری بھی تھا جو شعر کے لسانی اجزائے ترکیبی میں خسرو کا معتقد تھا۔ اُس کا ایک شعر:

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بتر سد	فارسی
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے	اردو

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ ''دورِ خسروی'' میں شعر اور موسیقی اپنے بھرپور وجود کے باوصف 'مشاعرہ' نام کی محفلوں سے ناآشنا ہوں گے لیکن اُس دور کے اُمراء کے درباروں میں شعر و موسیقی کو باریابی حاصل تھی مغل عہد جو تین صدیوں سے زیادہ مُدّت پر محیط ہے فنون لطیفہ بالخصوص شاعری و موسیقی کے تیز تر فروغ و ارتقاء کے لیے زبردست معاون ثابت ہوا اور ہر چند کہ شاہی دربار شاعر و شعر دونوں کے مُربّی بنے رہے نجی شعری محفلیں بھی ہئیت و ماحول کے اعتبار سے مشاعروں کا رنگ روپ اختیار کرتی گئیں جن میں حیدرآباد دکن میں آصف جاہ اوّل نظام الملک سے آخری نظام میر عثمان علی خان تک۔ شاہانِ اودھ میں نواب سعادت علی خان برہان الملک سے واجد علی شاہ تک اور ریاست رامپور میں نواب محمد علی خاں سے نواب رضا علی خاں تک شعری نشستیں باقاعدہ مشاعروں کی شکل اختیار کر چکی تھیں طرحی مشاعروں کا آغاز و عروج اِسی عہد شکوہ کا مرہونِ منت ہے اور صوبہ یو۔ پی میں آگرہ، صوبۂ بہار میں عظیم آباد جو بعد میں پٹنہ کہلایا مشاعروں کے یادگار مراکز بن گئے۔ یہی نہیں بلکہ صوبۂ سندھ میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقاء پر میر شعر علی قانع اپنی تصنیف ''مقالات الشعراء'' میں لکھتے ہیں کہ میر جعفر بینوا دہلی سے ٹھٹھہ آئے اور علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کے بعد جو عربی۔ فارسی اور اردو زبانوں کے عظیم شاعر تھے شیخ محمد علی حزیں نے ایران سے ہندوستان آتے ہوئے ٹھٹھہ میں قیام کیا۔

اسی دور (۱۶۸۵ تا ۱۸۵۰) میں برصغیر کے متعدد شعراء کی نقل مکانی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ولی دکنی اورنگ آباد سے دہلی آئے جب کہ سلطان قلی قطب شاہ کے جانشین اور اُس کے بیٹے سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے والد کا دیوان مرتب کیا اور وہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قرار پائے۔ عظیم آباد (بہار) سے مرزا عبدالقادر بیدل جن کی شاعرانہ عظمت کو مرزا غالب نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ دہلی آئے غالب کا شعر

رنگِ بیدل میں ریختہ کہنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

خان آرزو آگرہ سے جسے اکبر آباد کہا جاتا تھا ۱۷۲۳ء میں دہلی منتقل ہوئے۔ مرزا مظہر جانجاناں نے بھی اکبر آباد سے ترکِ سکونت کیا اور دہلی میں بود و باش اختیار کی۔ مرزا مظہر کے بعد دہلی میں میر تقی میر نے اردو شاعری کو معراج کمال تک پہنچایا جس کا سبب ان اساتذۂ مذکور کی ملک گیر نقل مکانی کے باعث مشاعروں میں پیدا ہونے والی گرم جوشی کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے چنانچہ دہلی کے ساتھ ساتھ عظیم آباد، مرشد آباد، فرخ آباد، رامپور، بریلی، نجیب آباد، فیض آباد، لکھنؤ، الہ آباد، لاہور، ٹونک اور بھوپال وغیرہ شاعری اور مشاعروں کے عظیم مراکز بن گئے۔ سودا، میر اور سوز جو دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آئے تھے آخر عمر تک وہیں رہے اور وہیں مدفون ہیں۔

نصف انیسویں صدی کے لگ بھگ اودھ میں واجد علی شاہ کے دور کا آغاز ہوا اور انگریزوں کے ہاتھوں ۱۸۵۷ء میں شاہ کی معزولی پر اختتام پذیر ہوا۔ واجد علی شاہ کے دور میں فحاش، مبتذل اور اخلاق باختہ شاعری کا دور دورہ رہا جس کا ذمہ دار عیش پرست بادشاہ خود تھا۔ یہ دور اردو شاعری کا شرمناک ترین دور تھا جس نے تمام معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ شعراء جنسی غلاظت پر مبنی افکار و مضامین نظم کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لینے میں لگے رہتے تھے۔ اور اودھ گزیدہ شاعری فنی اعتبار سے بھی پراگندگی کا شکار تھی۔ اس دور کی تخلیق درج ذیل مصرعہ میں 'رعائتِ لفظی' کی بدترین مثال ملتی ہے اور یہی آئے دن ہونے والے طرحی و غیر طرحی مشاعروں کا حال تھا:

ع بھیڑیئے ملتے ہیں گردن تری گرگابی پر

مشاعروں کی روایت متقدمین ہی کے دور سے جڑیں پکڑنے لگی تھی جس کے سرخیل ولی دکنی تھے۔ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز اگرچہ محمد افضل جھنجھانوی سے ہوا تاہم عہد اکبری میں بادشاہ نے مقامی آبادی کو شیر وشکر کرنے کی اپنی پالیسی کے تحت ہندی و سنسکرت پر زیادہ توجہ دی اور خود بھی ہندی زبان میں شعر کہے۔ فیضی نے اکثر ہندی دوہے کہے۔ عبدالرحیم خانِ خاناں بھی ہندی کا اچھا خاصا شاعر تھا چنانچہ اِس ماحول میں ان مقامی زبانوں میں جو شاعری ہوئی وہ بھی اردو زبان کے عمل ارتقاء کا ایک حصہ بن گئی اور شاہی دربار میں شعروسخن کی محفلوں نے مشاعروں کو بنیاد فراہم کی۔ یہی ماحول شاہانِ گولکنڈہ و بیجاپور کے درباروں کی بھی رونق بنا۔ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی بھی باصلاحیت اور باذوق حکمران تھے انھوں نے فنِ موسیقی پر ہندی زبان میں ایک کتاب بھی لکھی۔ عادل شاہ اول بھی اہلِ علم کا قدردان تھا جس کے دربار کے مشہور شاعر کی تصانیف میں مشہور زمانہ مثنوی 'گلشنِ عشق' شامل ہے۔ شعراء کی اس کہکشاں میں جب ولی دکنی ایک ماہتاب درخشاں بن کر اُبھرا تو شعری ماحول اور بھی جگمگانے لگا جسے مشاعروں کی روایت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ ولی کا کلام شمالی ہند کے اہلِ شعر کے لیے نمونۂ کمال بن گیا جس نے شعر خوانی کو اور بھی مہمیز کیا اور شعرائے دہلی آئے دن ہونے والے مشاعروں کی زینت بنتے چلے گئے۔ اردو شاعری فارسی کے شانہ بہ شانہ ترقی کرتی گئی۔

ولی کے تتبع میں بہت سے شعراء منصۂ شہود پر آئے جن میں نمایاں ترین شاہ حاتم، خانِ آرزو، شاکر ناجی، شرف الدین مضمون اور آبرو جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ قدیم شعرائے دہلی کو بلاشبہ باضابطہ اردو شاعری کا نقیب اور مشاعروں کا موجد کہا جا سکتا ہے اور اُنھیں بجا طور پر تذکرہ نگاروں نے میر اور سودا کے عظیم الشان عہد کا فاضل پیشرو قرار دیا ہے۔ میر اور سودا کے اس عہد زریں کو مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، سوز، قائم اور یقین جیسے معاصرین نے اور بھی چار چاند لگا دیئے لیکن اس عہد میں شعراء کے درمیان رقابت و مسابقت کا رجحان نمایاں ہونے لگا مولوی محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میر صاحب سے ''لکھنؤ میں کسی نے پوچھا

کیوں حضرت آج کل شاعر کون ہے۔ کہا ایک تو سودا اور دوسرا یہ خاکسار ہے اور تامّل کر کے کہا آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت سوز صاحب! چیں بہ چیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ اُس شخص نے کہا کہ آخر نواب آصف الدولہ کے استاد ہیں۔ کہا ''خیر یہ ہے تو پونے تین سہی''

لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک سامعین کی تعداد سینکڑوں سے ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی جہاں شعراء کے درمیان ایک دوسرے پر چوٹیں بھی ہوتی تھیں اور داد و تحسین بھی۔ میر تقی میر دہلی سے کس مپرسی کے عالم میں جب لکھنؤ پہنچے تو ایک سرائے میں قیام کیا وہیں پتہ چلا کہ ایک جگہ مشاعرہ ہے رہ نہ سکے اور اُسی وقت غزل کہی اور مشاعرے میں جا شامل ہوئے۔ اُن کی مخصوص وضع قطع دیکھ کر لکھنؤ کے بانکوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میر صاحب دل شکستہ ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر اہل محفل کی نظروں میں آئے بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے فی البدیہہ ایک قطعہ کہا اور غزل میں شامل کر لیا۔ فرمایا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ... ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ... رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا

ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

میر صاحب کے اس قطعہ نے جو اردو شاعری اور اردو مشاعروں کی تاریخ میں یادگار بن چکا ہے محفل کا رنگ ہی پلٹ کر رکھ دیا۔ بہت معذرت کی گئی اور یہ خبر کہ میر صاحب لکھنؤ تشریف لا چکے ہیں نواب آصف الدولہ تک پہنچی جنھوں نے ازرہِ قدر دانی وظیفہ مقرر فرما دیا۔ لیکن یہ دور جب انشاء مصحفی اور ناسخ و آتش کے زمانہ تک پہنچا تو شاعرانہ رقابتیں۔ اُستادی کے دعوے اور

شعراء کے درمیان مسابقت وحسد اس قدر بڑھے کہ مشاعروں کی فضا مسموم ہو کر رہ گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ مشاعرے اکھاڑہ بن گئے ہیں جہاں پہلوانانِ سخن نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے نہایت نامانوس۔ مبتذل اور مشکل ردیف وقوانی کے استعمال کے علاوہ کسی بھی نوع کی پھکڑ بازی سے گریز نہیں کیا اگر چہ اس عہد کے شعراء نہایت ذہین وفطین تھے جن میں مصحفی وانشاء اور ناسخ وآتش بہت ہی طباع تھے۔ دہلی میں مشاعرہ بازی کی فضا اپنے عروج پر تھی کہ انشاء اللہ خاں انشاء کی سودا کے شاگرد مرزا عظیم بیگ سے ٹھن گئی۔ غرور سے مرزا عظیم بیگ کا دماغ بھی آسمان پر رہتا تھا حالانکہ موصوف شاعری کی صرف شُد بد ہی رکھتے تھے۔ ایک غزل کہی اور ایسی جگہ سنائی کہ جہاں انشاء جیسے استادِ فن بھی موجود تھے۔ ناواقفیت کی بنا پر غزل میں دو بحریں رجز اور رَمل استعمال ہو گئیں☆ انشاء نے مصلحتاً "تعریف کی اور کہا کہ مرزا صاحب آپ یہ غزل مشاعرہ میں ضرور پڑھیں۔ جب پڑھی گئی تو انشاء نے برسرِ مشاعرہ مرزا عظیم بیگ سے تقطیع کرنے کی فرمائش کردی اور بیچارے مرزا عظیم بیگ کے لینے کے دینے پڑ گئے۔ انشاء اللہ خاں نے ایک مخمس پڑھا جس کا مطلع یہ تھا:

گر تُو مشاعرے میں صبا آج کل چلے　　کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے　　پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

مرزا کی بڑی ہیٹی ہوئی مگر انتقام سر پر سوار ہو گیا اور گھر پہنچ کر انھوں نے بھی ایک مخمس کہا جو معائب شعری اور بیہودگی کا مرقع تھا۔ چند مصرعے

☆ بحرِ رجز: مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔
بحرِ رَمل: فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن

ـــ تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

ـــ ننگری تلے سے عرفی و قُدسی نکل چلے

ـــ ناحق جو تم ازار سے باہر نکل چلے

جیسا کہ کہا گیا شعراء اور مشاعروں کے اس دورِ خلفشار میں ہمارے ان بزرگوں نے اپنی اکثر صلاحیتیں شعری خرافات تخلیق کرنے میں صرف کر دیں اور استادی کا رعب جمانے کے لیے مشکل ردیف وقوافی کو بچھاڑنے کے لیے ذہنی پہلوانی کا پورا پورا زور لگایا۔ انشاء کی مشاعرے میں پیش کردہ ایک غزل کے چند شعر:

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے	کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چُوں مرے آگے
کیا آ کے ڈراوے مجھے زلفِ شبِ یلدا	ہے دیو سفید سحری جُوں مرے آگے
وہ مارِ فلک کا ہکشاں نام ہے جس کا	کیا دخل جو بل کھا کے کرے فُوں مرے آگے

ایک اور غزل کے دو شعر:

ہیں زورِ حسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر	نامِ خدا نگاہ پڑے کیوں نہ ڈنڈ پر
گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ	بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

انشاء و مصحفی کا ایک ایک مزید شعر:

انشاء	دیکھ اس کی پڑی خاتم یاقوت میں انگلی	ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی
مصحفی	تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ	رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

استغفر اللہ!

شیخ قلندر بخش جرأت بھی انشاء و مصحفی کے معاصر تھے جو نابینا تھے ایک روز سید انشاء ان کی

طرف جا نکلے۔ جرأت فکر شعر میں غرق بیٹھے تھے۔ انشاء کے پوچھنے پر بتایا کہ ایک مصرع ہوا ہے جب تک دوسرا نہیں ہو جائیگا سناؤنگا نہیں۔ بہت اصرار پر جرأت نے مصرع سنایا

اُس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

انشاء نے برجستہ کہا: ''اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی'' جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اُٹھا کر انشاء کو ٹٹولتے پھرے مگر انشاء ہاتھ نہ آئے۔ جرأت کے غزل پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ مرزا محمد تقی کے مکان پر اکثر مشاعرہ ہوتا جہاں جرأت مشاعرہ پر چھائے رہتے تھے۔ مصحفی کی شاعرانہ طبّاعی کا یہ عالم تھا کہ آٹھ دیوان لکھ ڈالے چنانچہ ان کی مشاقی اور پُر گوئی کو تذکرہ نویسوں نے تسلیم کیا ہے۔ مشاعروں میں نہ جانے کتنے جعلی شاعر ہوتے جو اُن سے غزلیں خرید کر پڑھتے اور خوب داد وصول کرتے۔ مصحفی اپنی تنگ دستی کے سبب غزلیں فروخت کرتے تھے بقول آزاد'' دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں۔ جب مشاعرہ قریب ہوتا تو اُن پر اور مختلف کاغذوں پر طرح مشاعرہ پر شعر لکھنا شروع کرتے تھے اور برابر لکھتے جاتے تھے۔ لکھنؤ مشاعروں کا شہر تھا۔ عین مشاعرے کے دن لوگ آتے۔ آٹھ آنے سے ایک روپے تک اور جہاں تک جس کا شوق ہوتا مدد کرتا۔ چنانچہ جو بچتا وہ خود لیتے اور مشاعروں میں پڑھ دیتے۔ وہی غزلیں دیوانوں میں لکھی چلی آتی ہیں۔ بلکہ ایک مشاعرہ میں جب شعروں پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو انھوں نے تنگ آ کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ روئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہیں اس بات کا چرچا ہوا تو عقدہ کھلا کہ ان کی غزلیں بکتی ہیں اچھے شعر تو لوگ مول لے جاتے ہیں جو رہ جاتے ہیں وہ ان کے حصہ میں آتے ہیں۔ دوسری طرف مصحفی اور انشاء کے درمیان مشاعروں میں چوٹوں کا سلسلہ اتنا چلا کہ مشاعروں کی فضا متبذل شاعری سے آلودہ ہو کر رہ گئی۔ انشا کی ایک غزل کے جواب میں مصحفی نے بھی فخریہ غزل کہی جس کے چند شعر:

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری   ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو   برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے   سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

اس کے بعد اسی زمین میں فارسی اشعار کا اضافہ کرتے ہیں

فارسی

اے مصحفی زگوشۂ خلوت بروں خرام   خالی ست از برائے تو خود جائے شاعری
مجنوں منم چرا دگرے رنج می دہد   درحصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

انشاء نے پھر ایک اور غزل داغ دی جس کے دو شعر

توڑوں گا خُمِ بادۂ انگور کی گردن   رکھو دونگا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن
آئینے کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے   سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

شیخ مصحفی بھلا کہاں چوکنے والے تھے اسی زمیں میں غزل کہہ ڈالی:

لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں   کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لیے وضع ہے ناداں   بے جام ہے خم بادۂ انگور کی گردن

جب یہ دور بڑھ کر آتش و ناسخ کے عہد میں داخل ہوتا ہے تو شعراء کی باہمی رقابت و مسابقت سے مشاعرے اور بھی دو آتشہ ہو جاتے ہیں۔ میر حسن کے صاحبزادے میر مستحسن خلیق نے ۱۶ برس کی عمر میں مشق سخن شروع کی۔ مشاعروں کے روایتی میزبان مرزا تقی نے چاہا کہ فیض آباد میں شعر و سخن کا چرچا ہو۔ مشاعرہ میں خواجہ حیدر علی آتش کو بلایا۔ تجویز تھی کہ اُنھیں وہیں رکھیں۔ مشاعرہ میں میر خلیق نے جو غزل پڑھی اُس کا مطلع تھا:

رشکِ آئینہ ہے اُس رشکِ قمر کا پہلو   صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت!

میر خلیق کا ایک اور واقعہ جس سے اُس عہد کی ادبی فضا اور مشاعروں کے پس منظر و پیش منظر پر نظر پڑتی ہے۔ میر خلیق کی پُر گوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک لڑکا آیا اُس نے کہا میر صاحب آٹھوں کا میلہ ہے ہم جائیں گے ایک غزل کہہ دیجیے۔ اچھا بھئی! کہہ دیں گے۔ میر صاحب میلہ تو کل ہے ہم کل جائیں گے ابھی کہہ دیجیے۔ اُسی وقت غزل لکھ دی۔ اُس نے کہا یاد بھی کرا دیجیے۔ اُن دنوں بھی غزلیں بکا کرتی تھیں جیسے کہ مصحفی اپنا کلام بیچتے تھے۔ میر خلیق بھی غزلیں کہہ کر فروخت کرتے تھے۔ ایک دن ایک خریدار آیا اور اپنا تخلص ڈلوا کر شیخ ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح کر دیجیے۔ شیخ صاحب نے غزل کو پڑھ کر اُس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا۔ "ابے تیرا منہ ہے جو یہ غزل کہے گا۔ ہم زباں پہچانتے نہیں یہ وہی پیر بخارا والا ہے" (میر مستحسن خلیق جب لکھنؤ آتے تو سرائے پیر بخارا میں ٹھہرتے تھے)

اب ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے جب اردو زبان اپنی ہیئت اور معانی و مفہوم کے اعتبار سے اپنے عروج کی حدیں چھونے لگتی ہے اور مشاعروں کی گہما گہمی اسے خواص و عوام میں بے پناہ مقبولیت کی منزلوں تک پہنچا دیتی ہے۔ اس دور کا سرخیل شاہ نصیر کو کہا جا سکتا ہے جسے غالب و مومن، ذوق و ظفر (آخری مغل تاجدار) اور حکیم آغا جان عیش دہلوی جیسی ہستیوں نے چار چاند لگا دیئے اور یہی دور قلعۂ معلّٰی کے ان یادگار و لافانی مشاعروں کا دور بھی تھا جس نے مشاعروں کی روایت کو اردو زبان کی مقبولیت کا اہم ترین ذریعہ بنا دیا۔ شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کی شہرت رکھتے تھے۔ ذوق کو بھی اُن سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ گرمیِ کلام سے وہ مشاعرہ کو تڑپا دیتے تھے رنگ کے سیاہ فام ہونے کے سبب لوگ انھیں میاں کلو بھی کہتے تھے۔ ایک معرکہ کے مشاعرہ میں انھوں نے داد و تحسین اور فرمائشوں کے درمیان آٹھ غزلیں پڑھیں۔ ایک غزل کا قافیہ و ردیف اُن کی مشکل پسندی کے سبب عَسل کی مکھی۔ مَحَل کی مکھی تھا۔ اُس دور میں سامعین مشاعرہ بھی نکتہ سنج و نکتہ رس ہوتے تھے چنانچہ محفل سے آواز بلند ہوئی کہ سبحان اللہ کیا خوب مکھی بیٹھی ہے

پھر آواز آئی یہ مکھی تو نہ بیٹھی اور ایک شخص نے بہ آواز بلند کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے اسی وقت کہا کہ جنھیں سخن کی چاشنی کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اُٹھاتے ہیں ہاں جنھیں صفرائے حسد کا زور ہے اُن کا جی متلائے گا۔'' شاہ صاحب کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی مثالی تھی وہ شعر کہنے سے کبھی نہ تھکتے تھے اکثر مشاعروں میں اوروں کے غزل پڑھتے پڑھتے اشعار برجستہ موزوں کر کے غزل میں شامل کر لیتے۔ مشاعرے میں غزل پڑھتے تو ساری محفل پر چھا جاتے تھے۔

قلعہ معلیٰ کے مشاعروں میں بھی نوک جھونک کا نہایت لطیف انداز ہماری شعری تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصہ بن چکا ہے۔ غالب کے بعض معاصرین کو اُن کی مشکل پسندی میں ابہام گوئی نمایاں دکھائی دیتی تھی چنانچہ حکیم آغا جان عیش نے ایک مشاعرہ میں غالب کے روبرو یہ قطعہ پڑھ دیا

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے   مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب نے ایک رباعی میں جواب دیا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سن سن کے جسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

شاہی مشاعروں میں معاصرین بالخصوص غالب و ذوق کے درمیان خاصی چشمک اور مسابقت کی فضا موجود تھی جس کا اندازہ مرزا کی غزل کے اِس مطلع سے ہوتا ہے:

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے   چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمائش ہے

بہادر شاہ ظفر غالب کا بھی احترام کرتے تھے لیکن ذوق سے نسبت تلمذ کے سبب اُنھیں

فوقیت دیتے۔ ایک مرتبہ قلعۂ معلیٰ جاتے ہوئے ذوق کی سواری جس راستے سے گزری وہاں مرزا اتفاقاً موجود تھے اور اُن کی یہ پھبتی شیخ ابراہیم کے کان بھنک پڑ گئی کہ 'بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے اتراتا'، بادشاہ سلامت تک شکایت پہنچی تو مرزا سے شکوہ کیا گیا۔ ارتجالاً فرمایا کہ حضور میں تو اپنی ایک غزل کسی صاحب کی فرمائش پر اُنھیں سنا رہا تھا جس کا مقطع تھا:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　　ورگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب کی اس طباعی کا کوئی جواب نہ تھا اور بات آئی گئی ہوئی مگر ''شہزادہ جواں بخت'' کے سہرے میں ''سخن گسترانہ بات'' آپڑی یعنی مرزا نے براہِ رست ذوق کو چیلنج کیا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں　　　دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

بہر حال اس جسارت پر اشعار کے ذریعہ مرزا کو شاہ سے معذرت کرنا پڑی

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی　　　اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری　　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر　　　دیکھا کہ چارہ جز ز اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات　　　مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ　　　کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مرثیہ ایک قدیم صنفِ شاعری ہے میر مستحسن خلیق کے فرزند میر ببر علی انیس اور مرزا دبیر کے زمانے میں صنفِ مرثیہ کو عروج اور مجالسِ مرثیہ خوانی کو رواج حاصل ہوا۔ جنھیں مشاعرہ جیسی ہی ایک صنف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اودھ میں سلطان واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد اور دلی پر

۱۸۵۷ء کی قیامت ٹوٹنے کے بعد امیر۔داغ۔جلال اور تسلیم وغیرہ اپنا وطن چھوڑ کر مسلمان ریاستوں خاص کر رامپور اور حیدر آباد (دکن) ہجرت کر گئے کیونکہ والیانِ رامپور وحیدر آباد اہل علم اور اردو زبان کے قدر دان سمجھے جاتے تھے۔ دربار میں اور روساء کے گھروں پر بکثرت مشاعرے ہوتے تھے۔امیر مینائی اپنے پیش روؤں کے معتقد اور داغ اپنی بیساختگی میں طاق تھے۔ جلال فنِ عروض کے استاد اور میر کی عظمت کے پرستار۔اُن کا ایک شعر ہے:

کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہی وہی طرز　　لیکن سخنِ میر تقی میر کی کیا بات

حکیم مومن خاں مومن جن کے نامی گرامی شاگرد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرہ "گلشن بے خار" تھے جب دہلی سے رامپور پہنچے تو یہ شعر کہا:

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق　　ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

لیکن اس "ویرانہ تر" میں بھی خوب شعری محفلیں سجیں اور مشاعرے ہوئے۔ مشاعروں کو خاص طور پر فروغ داغ اور امیر مینائی کے تلامذہ ومعاصرین کے عہد عروج میں اس طرح ہوا کہ برصغیر کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ایسا ہو جس کی مقامی تہذیب وثقافت میں مشاعروں کی گونج نہ سنائی دیتی ہو۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس دور کے شعراء کی ایک بڑی اکثریت اعلیٰ درجہ کی غزل کہنے پر قادر تھی پھر اس دور کے مشاعروں میں ترنم سے کلام پیش کرنے کی روایت کو مزید فروغ حاصل ہوا۔نواب مرزا داغ اور امیر مینائی کے شاگردیوں تو سینکڑوں اور ہزاروں میں تھے لیکن جن حضرات کی ہر مشاعرہ میں شرکت اہل ذوق کے لیے بلکہ اکثر عامہ الناس کے لئے بھی باعث کشش ہوتی ان میں دیگر معاصرین کے علاوہ جن ناموں کا سکّہ جم چکا تھا ان میں شاگردانِ داغ میں حضرات علامہ اقبال۔پروفیسر احسن مارہروی۔داغ کے داماد نواب سراج الدین سائل دہلوی ،بیخود بدایونی۔عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی، سیماب اکبر آبادی۔وفار رامپوری۔جگر مُراد

آبادی، نسیم بھرتپوری۔ جوش ملسیانی اور آغا شاعر دہلوی جبکہ امیر مینائی کے اہم ترین تلامذہ کے ناموں میں ریاض خیر آبادی۔ جلیل مانک پوری۔ محسن کاکوروی۔ شاد عظیم آبادی۔ اصغر گونڈوی آرزو لکھنوی ۔ حسرت موہانی۔ یاس یگانہ چنگیزی۔ ناطق گلاؤٹھوی۔ اطہر ہاپوڑی۔ ناطق لکھنوی۔ صفی لکھنوی۔ ثاقب لکھنوی۔ آسی اُلدنی (شارح غالب) برجموہن دتاتریہ کیفی اور مضطر گاؤٹھوی شامل تھے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کے انتقال کے بعد اُن کی یاد میں جو سب سے بڑی تقریب منعقد ہوئی وہ ایک عظیم الشان کُل ہند طرحی مشاعرہ تھا جو ماہِ اپریل (۱۹۳۸ء) ہی میں علامہ کی ایک غزل کے مصرع ''چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری'' دہلی کی مشہور ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں منعقد ہوا جو تین دن تک جاری رہا اور جس کی نشستوں کی صدارت معروف و مقبول اساتذۂ وقت نے کی ۔ آل انڈیا ریڈیو نے اس سہ روزہ مشاعرہ کو ہارڈنگ لائبریری ہال سے براہِ راست نشر کیا۔ اس کے بعد ریڈیو جیسے موثر نشریاتی ادارہ کا کردار بھی بڑے مشاعروں کے فروغ وارتقاء میں شامل ہو گیا۔ ملک بھر میں مشاعروں کا رواج عام ہو گیا تقسیم برصغیر تک مشاعروں کی ثقافت اہل علم اور صاحبان ذوق کی پہچان بن گئی۔ ہر چند کہ مشاعروں میں مختلف الفکر شعراء کے درمیان طنز وتنقید کا رجحان باقی رہا لیکن ادب وشائستگی کی حدود میں۔ اس تمام عہد میں مشاعروں کا حسن نکھرتا گیا جس نے آدابِ مجلسی کے ایک نئے تہذیبی رویے کی بنیاد رکھی۔

دیگر شعری مراکز سے قطع نظر دہلی میں بڑھتی ہوئی ادبی نشستوں نے سماں باندھ دیا۔ پنڈت امرناتھ ساحر دہلی میں نجی نشستوں کی میزبانی میں سبقت لے گئے۔ یہ دور تلامذۂ امیر وداغ کا تھا جن کی گرفت میں تمام ملک کے مشاعرے آچکے تھے۔ چالیس کی دہائی میں نوجوان شعراء کا ایک ایسا گروہ کہکشاں بن کر مطلع فن پر جلوہ بار ہوا جس نے مشاعروں کے وقار اور مقبولیت کو نقطۂ عروج پر پہنچادیا خاص کر مترنم شعراء جو حسرت۔ اصغر۔ جگر اور فانی جیسے عظیم غزل گو شعراء کا عکسِ جمیل ثابت ہوئے۔ ان میں اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی۔ شکیل بدایونی ۔ مجروح سلطان

پوری۔ خمار بارہ بنکوی وغیرہ شامل تھے۔ یہ دور جب برصغیر کی تقسیم کے مرحلہ تک پہنچا تو مشاعرہ ایک مکمل فنی تجربہ بن چکا تھا۔ اور اسٹیج سے کاروائی چلانے کا انداز، مسندِ صدارت سے قادر الکلامی، شعراء کے تعارف اور کلام پر تبصرہ وتنقید کے اچھوتے اُسلوب باذوق سامعین مشاعرہ کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ اس ضمن میں رضا علی وحشت کلکتوی اور خواجہ شفیع دہلوی کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ یہ حضرات شعراء کے تعارف اور اُن کے کلام پر ایسی خوبصورت اور پُرمعنی وذومعنی گفتگو کرتے کہ رات بھر مشاعرہ جاری رہنے کے بعد اور سپیدۂ سحری نمودار ہونے سے قبل جب اختتام کو پہنچتا تو سامعین مشاعرہ کا دل ایسی محفل سے اُٹھنے کو نہ چاہتا کیونکہ سامعینِ مشاعرہ اپنے داد وتحسین کے انداز سے بسا اوقات محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتے تھے ایک طرحی مشاعرہ میں جس میں جگر مرحوم نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا تھا کہ

کس کا خیال کونسی منزل نظر میں ہے　　　صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

ایک شاعر تشریف لائے اور غزل سرائی کے دوران پانی طلب کیا تو فوراً سامعین میں سے کسی منچلے نے کہا کہ

"پانی کا انتظام تری چشم تر میں ہے"

ایسے لطائف وظرائف اُس زمانے میں مشاعروں کو اور بھی پُرکشش بنا دیتے تھے لیکن مشاعروں میں چشمک کی روایت بھی بدستور قائم تھی ہر چند کہ انداز میں تبدیلی آچکی تھی چنانچہ اسی مشاعرہ میں جگر نے یہ شعر بھی پڑھا کہ

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر　　　سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

ایک اور خوبصورت اندا جو مسند صدارت یا نظامت کی طرف سے متعارف ہوا وہ فی البدیہہ وبرجستہ منظوم تبصرہ تھا جو شعراء کے کلام پر ہوتا اور اسی بحر اور ردیف وقوانی میں ہوتا جس

میں شاعر نے اپنا کلام پیش کیا ہوتا۔ اس ضمن میں سلسلۂ داغ کے شاعر اور دہلی سے آغاز اشاعت کرنے والے روزنامہ ''جنگ'' کے مدیر شہیر علامہ قابل گلاؤٹھوی نے جنکا ایک قطعہ اخبار میں حالات حاضرہ کے حوالے سے ہر روز شائع ہوتا اپنی بدیہہ گوئی کا ایسا سکہ جمایا کہ دہلی کے اُن مشاعروں کی شہرت، شہرت دوام بن گئی۔

ملک تقسیم ہوا اور پاکستان عالم وجود میں آیا تو چشم فلک نے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا تبادلہ آبادی کا منظر دیکھا چنانچہ تاریخ نے اپنے آپ کو اس طرح دہرایا کہ ڈھاکہ کے ایک مشاعرہ نے لکھنؤ کے اُس مشاعرہ کی یاد تازہ کردی جس میں میر تقی میر نے ''یورپ کے ساکنو'' کو اپنے ''اُجڑے دیار'' دہلی کا احوال سنایا اُسی طرح حیدر دہلوی مرحوم نے جنھیں دہلی والوں نے ''خیام الہند'' کا خطاب دیا تھا ہجرت کے بعد ڈھاکہ پہنچ کر یوں ایک اجنبی کے طور پر ایک محفلِ مشاعرہ میں اپنا تعارف کرایا۔

جو کچھ تھا میسّر وہ لٹا کے آئے　　　ارباب سیاست پہ گنوا کے آئے
اک قلعۂ ارباب طرب تھی دلّی　　　اُس قلعہ کو ہم چھوڑ کے ڈھاکے آئے

چوتھے مصرع میں ''ڈھاکے'' کا قافیہ کس قدر ذومعنی ہے کہ ایسا استعمال حیدر جیسے قادر الکلام ہی کا حصہ تھا اسی محفل میں مرحوم نے درجِ ذیل قطعہ بھی پڑھا

ہر چند کہ ہجرت زدہ انسان ہوں میں　　　معتوبِ سیاست ہوں پریشان ہوں میں
اے ابنِ ادب تنگ نگاہی سے نہ دیکھ　　　اس دور کی تاریخ کا عنوان ہوں میں

آزادی سے قبل طرحی مشاعروں کا خاصا رواج تھا۔ اکثر اساتذہ کا ایسا کلام جسے فن اور حسن معانی کا شاہکار کہا جا سکتا ہے اور جو اُن کے دواوین کا آج بھی قیمتی سرمایہ ہے وہ طرحی مشاعروں ہی کا فیضان ہے حسرت ۔ اصغر۔ جگر۔ فانی اور دیگر معاصرین کا شاعری میں

مقام و منصب کا تعین اُن کے بالالتزم کہے ہوئے کلام کو پیش نظر رکھے بغیر ممکن نہیں مثلاً جگر کی وہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے

کسی صورت نمودِ سوز پنہانی نہیں جاتی بُجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

اور یہ شعر تو زبان زد خاص و عام ہوا کہ

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

اس طرحی مشاعرہ میں حیدر دہلوی بھی شریک تھے اُن کی غزل کا مطلع اور ایک شعر

جنونِ عشق کی گہوارہ جنبانی نہیں جاتی نہیں جاتی طبیعت کی پریشانی نہیں جاتی

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بودوباش اچھی بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

حیدر کا شعر ثانی آج بھی زبان زد خاص و عام ہے ہر چند کہ بہت سوں کو شاعر کا نام معلوم نہیں اسی غزل کا مقطع ان کے عرفانِ ذات کی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں

ابھی ماحول عرفانِ ہنر میں پست ہے حیدر یکا یک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

احسان دانش جنھیں شاعر مزدور کی حیثیت سے شہرت ملی اُن کا واقعہ ہے کہ چالیس ہی کی دہائی میں کچھ شعراء لاہور سے کپورتھلہ (ریاست) کے ایک مشاعرہ میں گئے وہاں انھوں نے اپنی نظم "مزدور کی بیٹی کی رخصتی" پڑھی جس نے اچھے اچھوں کے چراغ گُل کر دیئے خاص طور سے لاہور سے اُن کے ہمراہیوں کی بڑی سبکی ہوئی اور وہ اس لیے کہ احسان نئے نئے ابھر رہے تھے جو اُن کے ہم عصروں کے لیے ایک چیلنج تھا چنانچہ افواہ پھیلا دی گئی کہ احسان کی یہ نظم کسی اور کی کہی ہوئی ہے۔ جیسا کہ رواج رہا ہے کہ ایسے مواقع پر مہمان شعراء کے اعزاز میں نجی شعری

نشستیں ہوتی ہیں چنانچہ ایسی ہی اک نشست کے دعوت نامہ پر احسان دانش نے یہ شرط رکھی کہ مشاعرہ فی البدیہہ ہوگا تو وہ شرکت کریں گے۔ چنانچہ مشاعرہ ہوا اول تو کچھ حضرات ویسے ہی غائب ہو گئے جن چند شعراء نے شرکت کی ان میں دوسرے نمبر پر احسان نے سب سے زیادہ شعر کہے پہلے نمبر پر علامہ قابل گلاؤٹھوی تھے۔ اس واقعہ کا ذکر احسان مرحوم نے اپنی خودنوشت سوانح ''جہانِ دانش میں کیا ہے۔

تقسیم برصغیر کے وقت ''ہجرتِ عظیم'' کے نتیجے میں دیگر کے علاوہ اکثر شعراء بھی رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہوئے اس کے بعد برصغیر میں ''انڈو پاک'' مشاعروں کا دور شروع ہوتا ہے چنانچہ انڈیا سے جن شعراء نے پاکستان کے مشاعروں میں شرکت کی اُن میں جگر مرادآبادی، خمار بارہ بنکوی آنند نرائن مُلا ار مجروح سلطانپوری وغیرہ کثرت سے آئے گئے جب کہ پاکستان ہجرت کر کے آجانے والوں میں محشر بدایونی۔ تابش دہلوی۔ حیدر دہلوی۔ علامہ قابل گلاؤٹھوی۔ حفیظ جالندھری۔ حفیظ ہوشیار پوری۔ بہزاد لکھنوی اقبال صفی پوری۔ جمیل مظہری۔ راغب مراد آبادی۔ حمایت علی شاعر۔ محسن بھوپالی پروفیسر منظور حسین شور (علیگ) ناصر کاظمی، عاصی کرنالی اور متعدد مزید بلند پایہ شعراء جن کے نام حافظے میں نہیں آرہے۔ خوش قسمتی سے پاکستان میں پہلے ہی نامور شعراء کی ایک کہکشاں موجود تھی جن میں ڈاکٹر تاثیر۔ عابد علی عابد عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ احسان دانش شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی اور فیض احمد فیض یہ سب حضرات لاہور میں تھے پشاور میں آغائے ابولکیف کیفی۔ مرزا محمود سرحدی۔ فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی خاطر غزنوی۔ محسن احسان اور احمد فراز وغیرہ راولپنڈی میں سید ضمیر جعفری عبدالعزیز فطرت۔ الطاف پرواز۔ صادق نسیم اور جمیل ملک وغیرہ پاکستان سے انڈیا جانیوالوں میں پنڈت ترلوک چند محروم کا خانوادہ جن میں ان کے فرزند جگن ناتھ آزاد تھے انہیں آج تک پاک سرزمین کے اہل ذوق یاد کرتے ہیں۔ ملتان میں اسد ملتانی جنھوں نے علامہ اقبال کے اُسلوب کو اپنایا اور ارشد ملتانی۔ ریاست بہاولپور کے شعراء میں آزاد خانپوری۔ حکیم عبدالحق شوق۔ معین الدین

حاوی۔ علی احمد رفعت۔ محی الدین شان وغیرہ۔ ریاست بھاولپور میں آزادی کے بعد ہجرت کر کے آنے والوں میں سید مسعود حسن شہاب دہلوی سب سے نمایاں تھے۔ وہ خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کے خاص شاگردوں میں شامل تھے اُن کے دم قدم سے بھاولپور میں شعری نشستوں اور شاعروں کو فروغ حاصل ہوا۔

شعراء اور شاعروں کے باب میں سب سے اہم واقعہ جوش ملیح آبادی کا پاکستان آنا تھا۔ وہ غالباً انڈیا سے آنے والے معروف شعراء میں سب سے بعد میں آئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اُس وقت پاکستان میں حکومت کی اعلیٰ ترین سطح پر اُنھیں مدعو کیا گیا تھا حالانکہ انڈیا میں بھی حکومت بالخصوص نہرو فیملی ان کی سرپرستی کر رہی تھی۔ انہیں انڈیا کا اعلیٰ ترین اعزاز ''پدم بھوشن'' بھی مل چکا تھا۔ بہرحال پاکستان آنے کے بعد یہاں کی ادبی فضا میں ارتعاش پیدا ہوا اور مشاعروں کی گہما گہمی میں اچانک اضافہ ہو گیا لیکن غزل گو شعراء کی نسبت ان کا رویہ وہی رہا جس کا اظہار بھی وہ ایک رباعی میں کر چکے تھے جس کے آخری دو مصرعے یہ تھے:

بُو آئی جو فرسودہ غزل بافوں کی   میں راستے سے ناک بند کر کے گزرا

جوش صاحب دہلی میں سرکاری ماہنامہ ''آجکل'' کے مدیرِ اعلیٰ رہ چکے تھے۔ پاکستان میں اُس جیسا سرکاری مجلّہ ''ماہِ نو'' تھا جو آج بھی ہے۔ چنانچہ پاکستان آنے کے فوراً بعد ''ماہِ نو'' میں فضل احمد کریم فضلی کے ساتھ جو ایک اعلیٰ بیوروکریٹ اور غزل کے بلند پایہ شاعر تھے اُن کی چپقلش چل نکلی۔ اس سلسلہ میں فضلی مرحوم کا یہ شعر یادگار ہے۔

ہر اک کی دسترس میں کہاں سرِ دلبراں   وہ نظم گو ہوا جو غزل خواں نہ ہو سکا

بہرحال شاعرِ انقلاب حضرت جوش پاکستان تشریف لائے تو اپنے ساتھ مشاعروں کی روایات بھی ساتھ لائے جن میں مشاعروں میں شعراء کے درمیان تقدیم و تاخیر کی روایت کو

خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور اِس روایت کے مطابق جوش صاحب نے ہندوستان یا پاکستان کے کسی ایسے مشاعرے میں شرکت نہیں کی جس کے آخری شاعر وہ خود نہ ہوں کیونکہ یہ مقام و منصب ہمیشہ سنیئر ترین شاعر کے لیے وقف رہا۔ ایسے دو مواقع قابل ذکر ہیں جب منتظمین مشاعرہ کو دو عظیم شعراء کی موجودگی میں تقدیم و تاخیر" کے جاں گسل مرحلے سے گزرنا پڑا۔ قیامِ پاکستان سے قبل انڈیا میں ایک فلم "مہندی" نے بڑی شہرت حاصل کی تھی جوش و جگر دونوں ہی اپنے وقت کے عظیم شعراء کو ایک مشاعرہ میں پردۂ سیمیں پر دکھایا گیا اور اس خوبصورت احتیاط کے ساتھ کہ حضرت جگر مراد آبادی کی صدارت میں جب مشاعرہ صدرِ مشاعرہ کے کلام کے ساتھ مشاعرہ کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔ تو دکھایا گیا کہ شاعرِ انقلاب تشریف لائے اور سیدھے سٹیج پر پہنچ کر سخن سرا ہوئے اس طرح فلم کے ڈائریکٹر نے احترام کی اس روایت کو قائم رکھا کہ صدر مشاعرہ کے کلام کے ساتھ ہی محفل کا اختتام ہوا اور اس طرح حضرت جوش کو انفرادی حیثیت دے کر تقدیم و تاخیر کی چپقلش ہی کا سدِ باب کر دیا گیا۔

بعینہٖ ایک ایسی ہی صورت حال غالباً ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء میں سکھر کے ایک مشاعرہ میں پیدا ہو گئی جس کی صدارت جوش صاحب کو کرنا تھی لیکن جوش صاحب نے بھی نصف شب سے قبل مشاعرہ میں نہ پہنچنے کی اپنی ذاتی روایت کو برقرار رکھا چنانچہ سامعین مشاعرہ کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے منتظمین مشاعرہ نے جناب فیض احمد فیض کی صدارت میں مشاعرہ کا آغاز کرا دیا اور وہ نازک لمحہ آ پہنچا جب صرف فیض و جوش باقی رہ گئے اور اس طرح کہ جوش صاحب خود کو صدر مشاعرہ سمجھے بیٹھے تھے اور لگ رہا تھا کہ سٹیج سکریٹری نے اگر حسبِ روایت جوش صاحب کے بعد بحیثیت صدر مشاعرہ فیض صاحب کو پڑھوا دیا تو قیامت برپا ہو جائے گی کیونکہ کراچی سے آئے ہوئے شعراء "مصرعہ اُٹھانے" کے لیے جوش صاحب کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے نہ جانے سٹیج سکریٹری منصور عاقل صاحب کے ذہن پر ڈاکٹر تاثیر مرحوم کی نظم "ید بیضا" کا یہ شعر کیسے نازل ہوا جسے پڑھ کر انھوں نے مائیک اِن دو شعراء کے درمیان رکھ دیا اور جناب فیض نے پہل کر کے

سروں پر آئی ہوئی قیامت کو ٹال دیا:

شکارِ ماہ کہ تسخیرِ آفتاب کروں میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

شروع شروع میں ریڈیو سے اکثر مشاعرے نشر ہوتے تھے پھر ساٹھ کی دھائی کے آغاز میں ریڈیو کی جگہ ٹیلیوژن کے مشاعروں نے لے لی جس کے نتیجہ میں رات رات بھر ہونے والے مشاعرے ماند پڑ گئے اور اب تو حال یہ ہے کہ:

اب زباں پر بھی کہیں الفت کا نام آتا نہیں اگلے مکتوبوں میں کچھ رسم کتابت ہو تو ہو

بہرحال ایک نہایت خوش آئند بات یہ ہے کہ بیرونِ ملک پاکستانیوں نے مشاعرہ کی روایت کو قائم رکھا ہوا ہے اور برصغیر کے وہ عظیم الشان مشاعرے جو اب اک قصۂ پارینہ بن چکے ہیں محبانِ اردو و تارکین وطن کے دم قدم سے ابھی تک خلیجی ریاستوں۔ سعودی عرب۔ برطانیہ۔ امریکہ اور کینیڈا وغیرہ میں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ برصغیر کے تشنگانِ شعر و ادب کی پیاس بھی بجھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد شارق (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔انڈیا)

سید ابوالحسن علی ندوی کا اسلوبِ نگارش

مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی مقبولیت برصغیر پاک و ہند سے لے کر تمام عالم اسلام تک پھیلی ہوئی ہے جو مقبولیت اور اعتماد ان کو ملا وہ پہلے کسی اور کو نہیں مل سکا، ان کی عالمی شہرت کا راز ان کی علم کی وسعت، تصانیف کی کثرت، عربی اردو اور دیگر متعدد زبانوں پر قدرت اور اسلوب نگارش کے جمال میں پوشیدہ ہے ان کے گلدستۂ نگارشات میں قرآنیات، سیرت نبویؐ، حدیث، تاریخ، علم کلام، سوانح و خاکہ نگاری اور سماجی و معاشرتی موضوعات وغیرہ شامل ہیں، ان کا پہلا کارنامہ اردو ادب میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" ہے۔ پھر "ماذا خسر العالم" سے عربی ادب کو نوازا کلام اقبال کا بہت خوبصورت عربی نثر میں ترجمہ کیا، پھر تاریخ دعوت و عزیمت کی پانچ جلدیں اور دیگر متعدد وقیع کتابیں منظر عام پر آئیں اور قارئین کی جانب سے داد و تحسین سے سرفراز ہوئیں، مولانا کو اصل مناسبت تاریخ نویسی اور تذکرہ و سوانح نگاری سے تھی اور یہی ان کا خاص فن اور موضوع تھا، ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز تذکرہ و سوانح سے ہوا، سولہ سترہ برس کی عمر میں ان کے برادر معظم حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے "توحید" امرتسر میں شائع شدہ مولانا محی الدین قصوری کا ایک اردو مضمون "تیرھویں صدی کا مجاہد اعظم" عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے دیا جو علامہ سید رشید رضا کی ادارت میں نکلنے والے وقیع ترین رسالہ "المنار" میں بالاقساط شائع ہوا اور بعد میں انہوں نے اس کو علاحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کثیر الجہات اور کثیر الابعاد شخصیت کے مالک تھے وہ ایک بلند پایہ مصنف، جادو بیان مقرر، داعی و مصلح، انسانیت کے پیکر، منفرد اسلوب کے حامل ادیب، مؤرخ اسلام اور بہترین سیرت و سوانح نگار تھے، ان کی خدمات بہت وسیع اور متنوع ہیں، یوں تو ان کے تمام کارنامے بہت عظیم ہیں مگر ان میں سب سے ناقابل فراموش اور غیر معمولی اہمیت

کے حامل ان کے تصنیفی کارنامے ہیں جس کا فیضان رہتی دنیا تک جاری وساری رہے گا اور ہر کتاب اپنے موضوع اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ہمیشہ سرفہرست اور نمایاں رہے گی۔

مولانا کا اپنا ایک مخصوص اسلوب نگارش ہے، حلاوت، شگفتگی اور روانی اس کے عناصر ترکیبی ہیں، اردو کے مقابلے میں عربی زیادہ اچھی لکھتے تھے اور ان کی عربی تحریریں فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اردو سے بہتر اور افضل ہوتی تھیں، جیسا کہ معروف ہے کہ مولانا کی شہرت بحیثیت سیرت وسوانح نگار اور تذکرہ نگار زیادہ نمایاں ہے، وہ سیرت نگاری کی صف اوّل کے مصنف ہیں، ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''السیرۃ النبویۃ'' اپنے اسلوب بیان کی وجہ سے برصغیر کی عربی سیرت نگاری کا لعل بدخشاں ہے، یہ زبان کی سلاست، اسلوب کی دلکشی اور دعوتی انداز بیان کے لحاظ سے بھی نہایت اچھی کتاب ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی، مفاہیم ومعانی کے لحاظ سے بھی یہ وقیع اور اہم ہے، اس میں انہوں نے عہد جاہلیت کے عرب کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کے منظر کو بھی پیش کیا جو مولانا کے اسلوب بیان اور انداز نگارش کی وجہ سے سب سے پہلی سیرت نبوی کا درجہ رکھتا ہے وہ اپنی بات، اپنے بیان اور استدلال کو مستند کرنے کے لیے آیات کریمہ کو پیوست و چسپاں کر دیتے ہیں، اصولی طور پر اہل سیَر و مفکرین کے سرچشمہ سے استدلال واستناد کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر عملاً اس کا فقدان ہے، عام طور پر سیرت نگار حضرات کے یہاں قرآن کریم سے استناد خال خال ہی نظر آتا ہے، مولانا کا یہ خاص کارنامہ اور اسلوب نگارش ہے کہ وہ موقعہ ومحل سے متعلق آیات کریمہ کو بیان کرتے ہیں، اپنے بیانیہ میں بھی جابجا آیات کریمہ سجاتے چلے جاتے ہیں، ان کی دونوں کتب سیرت خاتم النبیینؐ اور السیرۃ النبویۃ اس پر شاہد ہیں۔

ان کی سوانحی کتب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتب سوانح میں صرف واقعات زندگی، حوادث زمانہ اور شب وروز کے تسلسل کو بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا جو عام سوانحی کتب کا طرز نگارش اور اسلوب بیان ہے بلکہ انہوں نے شخصیات کے بنیادی پہلوؤں کو اجاگر

کرنے پر زیادہ توجہ مبذول کی ہے جس سے شخصیت کے بنیادی واصلاحی کارنامے واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں اوراس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان کے سوانحی اسلوب کی ایک دوسری عام خصوصیت یہ ہے کہ وہ صاحب سوانح کے خاندانی پس منظر کو بالعموم بیان کرتے ہیں کیوں کہ شخصیت کی نشو ونما و تشکیل میں خاندانی پس منظر کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، خاندانی پس منظر بیان کرنے کے اسباب انہوں نے ''حیات عبدالحیؒ'' اور ''المرتضیٰ'' میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

ایک تذکرہ نگار میں یہ صلاحیت ضرور اجاگر ہونی چاہیے کہ کسی حد تک ہی سہی اس راکھ میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا کر سکے جسے ایک جیتی جاگتی شخصیت اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہے کیوں کہ بہت ساری باتیں، یادداشتیں، زندگی کے قابل توجہ حقائق اور حادثات جن کا تعلق کسی شخص سے ہوتا ہے، تاریخی اسباب کے نتیجے میں جمود کا شکار رہتے ہیں، یہ تذکرہ نگار کی دقت نظر، وسعت مطالعہ، تاریخی بصیرت، نفسیات انسانی کی عمیق نباضی اور سب سے بڑھ کر اس کے ادبی پیرایۂ بیان پر موقوف ہے کہ وہ پھر سے اصلی رنگ روپ والا چہرہ قاری کو دکھا سکے اور ایک اچھی پیکر تراشی کا نمونہ پیش کر سکے، مجموعی حیثیت سے مذکورہ سبھی صفات کا عکس مولانا علی میاں ندویؒ کی تحریروں میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، کسی شخصیت کے احوال وکوائف، گرمی گفتار و کردار کی سچی پیکر تراشی کے لیے مولانا کی ذات مناسب ترین شخصیت ہے۔

مولانا کی اقلیم ادب میں تذکرہ و خاکہ نگاری ان کا خاص حصہ ہے، اس موضوع پر ان کی مشہور کتاب ''پرانے چراغ'' کی ادبی حلاوت و لطافت اور انشاپردازی کے لحاظ سے بڑی اہم ہے، ان کی جادو نگاری اور دلآویز طرز نگارش کی خوبیاں دکھانے کے لیے ایک مختصر سا اقتباس حاضر خدمت ہے انہوں نے متعدد علمی، ادبی اور دینی شخصیتوں کا سراپا بھی بیان کیا ہے جس کی ابتدا اپنے موقر استاد مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذکر سے کی ہے، ملاحظہ ہو:

''سراپا وقار، مجسم متانت، قد میانہ مائل بہ پستی، چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں،

دیکھ کر دل شہادت دیتا تھا کہ ان میں دوسروں کو ایذا پہنچانے کی صلاحیت ہی نہیں، لباس نہایت صاف ستھرا جس پر کہیں کسی نکتہ چیں اور دور بیں کو بھی کوئی دھبہ یا شکن نظر نہ آئے، نفاست اور نستعلیقیت پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف۔۔۔"

مولانا کی تذکرہ نگاری کے اسلوب کے جو بدیہی حقائق سامنے آتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ:

۱۔ وہ احوال زندگی کے بیان میں دیگر مستند علما بالخصوص قریب ترین افراد کے اہم اور تحقیق شدہ اقتباسات کو اپنی تحریروں میں ضرور جگہ دیتے ہیں

۲۔ قدماء کے انداز پر شعراء کے کلام کو جگہ جگہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کا سہارا بناتے ہیں جس سے ادبی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

۳۔ وہ اقتباسات حوالوں کے ساتھ نقل کرتے ہیں، قدیم علما میں یہ اسلوب مفقود ہے، یہ انداز تحریر جدید دور کے تحقیقی اسلوب کا غماز ہے۔

۴۔ زبان عام طور پر وہ سیدھی سادی، عام فہم اور معلومات افزا استعمال کرتے ہیں ساتھ میں جگہ جگہ ان کی عبارت میں دل سوزی اور رعنائی کا رنگ بھی ابھرتا ہے۔

مولانا تاریخ کے اس عہد کے سب سے بڑے نباض تھے، وہ تاریخ جدید کا سب سے بڑا انقلاب انگیز اقدام اور وقت کا سب سے اہم اور مقدس کام یہ قرار دیتے ہیں کہ خود تہذیب جدید کی رہنمائی کی جائے، اس میں نئی روح پھونکی جائے، اس کو صالح مقاصد اور سفر کی صحیح منزل عطا کی جائے، ان کو فن تاریخ سے دلچسپی موروثی تھی، ان کے والد محترم اور جد گرامی کا بھی خاص فن یہی تھا، مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی اس موضوع پر تمام تحریریں طویل غور و فکر اور عمیق مشاہدہ کا نچوڑ ہیں، اپنی اسی خصوصیت کا ذکر خود انہوں نے "پرانے چراغ" میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"سیر و تراجم کے ذوق و مطالعہ پر خصوصیت کے ساتھ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا سید عبدالحیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی جلیل القدر تصنیف یا کتب خانہ "نزہۃ الخواطر" کی آٹھ

جلدوں کے بار بار مطالعہ وخدمت نے شخصیتوں کو غور سے دیکھنے اور ان کی خصوصیات و اخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے اور ان کو اسلاف کے معیار پر جانچنے کی عادت پیدا کر دی۔'' پرانے چراغ''۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی جلد اول صفحہ ۱۰۹ نامی پریس لکھنؤ۔

ان کے اسلوب نگارش اور انداز بیان کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ خاص طور سے تاریخ پر لکھتے وقت اس کی کمی اور کم مائیگی کی جا بجا نشاندہی کرتے ہیں مثلاً طبقات و تراجم رجال کی ہندوستانی تصنیفات کا ایک نقص اختصار ہے یعنی ان میں چند ہی اشخاص کا تذکرہ ہے پورے ہندوستان کا احاطہ نہیں ہے، بعض کتابیں تو دو ہی یا تین صدی کے حالات پر ختم ہو جاتی ہیں اور اکثر کسی خاص طبقہ، مسلک یا فرقہ کے ساتھ مخصوص ہیں، دوسری کمی یہ ہے کہ ان کتابوں میں اپنے زمانہ کا ذوق و رجحان اور ایرانی طرز تحریر و انشاء چھایا ہوا تھا جس کا امتیاز پر تکلف عبارات، استعارات اور تشبیہات کی کثرت اور ضائع و بدائع کی رعایت ہے ان میں کسی کی سیرت و شخصیت کا مکمل ڈھانچہ کھڑا کرنے، شخصیت کا صحیح تخیل قائم ہونے اور اس کے خد و خال اور حقیقی کارناموں پر روشنی پڑنے والے بنیادی اور کار آمد تاریخی مواد کی بڑی کمی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علم و ادب کا رشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، خشک اور علمی موضوع کو بھی ان کا بہار آفریں قلم شگفتہ اور تازہ بنا دیتا ہے، تاریخ و سوانح کی کتابوں کو ان کے بیان کی دلآویزی اور تحریر کی حلاوت ادب و انشاء کا ایک حسین گلدستہ بنا دیتی ہے وہ اپنے فطری ادبی ذوق اور انشاء پردازی کے خداداد ملکہ سے سادہ واقعات اور خشک تحریروں میں ایسی کشش اور جاذبیت پیدا کر دیتے ہیں کہ دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگتا ہے اور وجدانی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے، ان کے خاص اسلوب بیان اور منفرد طرز تحریر کی اصل خوبی تاثیر اور دل نشینی ہے یہی دراصل کسی کلام کی جان ہے، مولانا کا کمال یہ ہے کہ ان کی رعنائی بیان اور حسن اسلوب نے ان کی تحریر میں جادو کا سا اثر پیدا کر دیا ہے۔

مسلم شمیم

ادب میں نراجیت کی تشکیلات اور اظہار

نراجیت (Anarchism) بنیادی طور پر ایک سیاسی نظریہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی میں باضابطہ ایک نظریے کے طور پر Bakunin اور Prince Kropotkin کے حوالے سے حلقۂ علم و دانش میں مباحثے اور عالمی تناظر میں زیر بحث آیا۔ سب سے پہلے Proud Dhan نے ۱۸۴۰ء میں Anarchy کی اصطلاح کو بغیر حکومت معاشرے کے قیام سے موسوم کیا۔ اس نظریے کا بنیادی تصور ریاست کے بغیر معاشرے میں فرد کی شخصیت کی تکمیل کا خواب ہے۔ اس نظریے کا براہ راست تعلق تو ریاست کے وجود و عدم سے ہے مگر اس نظریے کی صدائے بازگشت معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں سنائی دیتی ہے اور ادب کی دنیا میں اس کے مظاہر رونما ہوتے رہے ہیں فرانسیسی فلسفی روسو کی شہرۂ آفاق کتاب "Social Contract" کا ابتدائی جملہ کہ Man is Born free but everywhere he is chains. یعنی انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ نراجیت روسو کی کتاب کا موضوع نہیں ہے مگر آزادی اُس کے نزدیک شرف بشر کی سب سے بڑی علامت ہے۔ روسو کی مذکورہ کتاب اس پہلے جملے کی تفسیر ہی کہی جا سکتی ہے اُس کے نظریے کے مطابق انسان جب معاشرے اور ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے State of Nature میں کلیتہً آزاد اور ہر قسم کی پابندی کے آزار سے ناآشنا جنت ارضی میں راحت و انبساط کی زندگی بسر کر رہا تھا، یہ آزادی کی نعمت بقول روسو ریاست کے وجود میں آنے کے نتیجے میں اُس سے چھن گئی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ انسان طرح طرح کی زنجیروں میں اسیر ہوتا چلا گیا۔ نراجیت کے نظریے کے حامی مفکرین ریاست اور حکومت سے نجات کے لیے اسی آزادیٔ کامل کے حصول کے لیے سرگرداں رہے۔ گویا ہر قسم کے قواعد و ضوابط، عقائد اور سماجی روایات و اقدار سے آزاد زندگی اُن کا آدرش ٹھہرتا

تھا۔ یہ مادر پدر آزادی کا منفی تصور کبھی اور کہیں عملی روپ نہیں دھار سکا، کم از کم معاشرے میں کبھی اسے اعتبار حاصل نہیں ہوا، مگر واضح رہے کہ اس قسم کی آزادی کا خواب اور خبط ہر دور میں کسی نہ کسی حلقے میں ضرور پایا جاتا رہا ہے۔ قدیم یونان میں مشہور فلسفی زینو (Zeno. 342-270 BC) جو Stoic Phiosophy کا بانی تھا افلاطون (Plato) کی مجوزہ Utopia یعنی خیالی ریاست بھی اُسی نہج پر استوار کی گئی تھی۔ اس فہرست میں عہدِ وسطیٰ کے کئی نام بھی شامل ہیں۔ نراجیت کا نظریہ ہمارے عہد میں انتشار اور بحران سے دوچار معاشرے اور ملک سے موسوم کیا جاتا ہے جہاں اربابِ اقتدار قانون کی پامالی میں قیادت وسیادت کے فرائض انجام دے کر ملک و معاشرہ کو Bad Governance بلکہ Non.Governance کی ابتلا میں مبتلا کر دینے کے درپے ہوتے ہیں اور قانون کی بالادستی کا سارا بوجھ مظلوم اور مقہور عوام کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔

اقلیم ادب میں نراجیت کی کہانی اردو ادب کے حوالے سے بہت پرانی نہیں ہے۔ مگر نراجیت کا اظہار بھی سفرِ تاریخ میں حادثاتی طور پر سامنے نہیں آیا بلکہ بدلتے ہوئے سماجی اور ثقافتی حالات کا عطیہ کہا جا سکتا ہے۔ اپنی ادبی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہیں تو سب سے پہلے صدیوں سے رائج عروضی قواعد وضوابط سے پہلوتہی اور انحراف کی روایت سامنے آتی ہے، یعنی ہئیت اور اسلوب میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہئیت اور اسلوب کی تبدیلی بھی سماجی ارتقا کے نتیجے میں رونما ہوئی۔ عہدِ مغلیہ کا زوال اور انحطاط محض سلطنت مغلیہ کا زوال نہ تھا بلکہ ایک تہذیب اور ثقافت کا انحطاط اور زوال تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد زوال اور انحطاط انتشار اور بحران کی صورت اختیار کرتا گیا۔ سیاسی طور پر سات سمندر پار کی ایسٹ انڈیا کمپنی (قائم شدہ ۱۶۰۰ء) ہندوستان کے طول وعرض میں سیلاب بلاخیز کی طرح پھیلتی گئی اور ۱۸۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتح دراصل جاگیردارانہ نظام کی ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں شکست تھی۔ جنگ پلاسی کی شکست کو کچھ سادہ لوح مورخین میر جعفر کی

غداری قرار دے کر یہ بھول جاتے ہیں کہ ۱۷۶۵ء میں بکسر کی جنگ میں ہندوستان کی تین فوجوں یعنی اودھ، بنگال اور دہلی کی مشترکہ فوج کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے شکست دے کر فیصلہ کن فتح حاصل کی تھی۔ یہ دراصل تاریخی تناظر میں ترقی کے مدمقابل پس ماندگی کی شکست تھی۔ اس دوران دہلی کے تاجدار شاہ عالم ثانی نے کمپنی کو لینڈ ریونیو کی وصولی کا فرمان مرحمت فرمایا، گویا عملی طور پر عنانِ حکومت کمپنی کے حوالے کر دی۔ واضح رہے کہ رفتہ رفتہ سارا ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں آ گیا اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر کمپنی کی حکومت قائم ہو گئی اور تاجدار ہند یعنی سلطنت مغلیہ کی نمایندگی کرنے والے شہنشاہ کی حکمرانی لال قلعے کے حدود تک محدود ہو گئی اور بادشاہ سلامت کمپنی کے وظیفہ خوار ہو گئے اور یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا اور کمپنی نے بادشاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج کر جہانِ فانی سے رخصت کر دیا۔

ہندوستان میں نوآبادیاتی تسلط کے نتیجے میں یہاں انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام کی آمد سے ہندوستانی سماج ہر اعتبار سے اتھل پتھل ہوا، بہت سی دیرینہ قدریں شکست وریخت سے دو چار ہوئیں۔ نتیجے کے طور پر ہمارے اجتماعی شعور اور حسیت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ شعور و احساس کی ان تبدیلیوں کا براہِ راست اثر ہمارے ادب وشعر پر پڑنا ناگزیر ٹھہرا چنانچہ ہماری مروجہ اصنافِ شاعری اور ہیئت واسلوب پر نظرِ ثانی کا آغاز ہوا۔ غزل کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں نظم نگاری کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرائی گئی، آزاد اور معرا نظموں کے تجربے کیے گئے۔ یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ تبدیلی کا عمل فطری عمل ہے۔ معاشرتی تبدیلیوں کے جلو میں فکر واحساس میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں پوری ثقافتی زندگی میں رونما ہوتی ہیں اور شعر وادب اسی دائرے میں تبدیلیوں سے روشناس ہو کر سفر ارتقا پر گامزن ہوتے ہیں۔ ان تبدیلیوں میں نئے اسالیب اور نئی جہتوں کو بھی قبولیت اور رواج حاصل ہوتا ہے بلکہ مروجہ جہتوں کو بھی نئی صورت اور نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

ہیئت اور اسلوب میں نئے نئے تجربے گویا نراجیت کی جانب آغازِ سفر کہا جا سکتا ہے۔ آزاد

نظم سے شروع ہونے والا یہ تخلیقی سفر ہئیت اور اسلوب کی نئی جہتوں سے روشناس ہوا اور بات نثری نظم تک پہنچ گئی۔ نثری نظم کے حوالے سے فیض احمد فیض اور ڈاکٹر وزیر آغا کی آرا کم و بیش ایک جیسی ہیں اور نثری نظم کو دونوں دائرۂ شاعری میں کوئی جگہ دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ ایک حلقہ نثری نظم کی لفظی ترکیب پر معترض ہے اور باعتبار لغت نثر و نظم کو یک جا کرنا محال گردانتا ہے، کیونکہ نثر کے معنی بکھیرنے کے اور نظم کے معنی پرونے کے ہیں، اور ان دونوں حالتوں کا بیک وقت جمع ہونا ممکن نہیں، چنانچہ اس حلقۂ فکر کے نزدیک نثری نظم کی ترکیب ناقابل فہم ہے۔ اس ضمن میں جناب احمد ہمدانی کا فکر انگیز مضمون نثری نظم کا قضیہ، جو ان کی کتاب 'سلسلہ سوالوں کا' میں شامل ہے اہم حوالہ ہے۔

نظریاتی اور فکری اعتبار سے ادب میں نراجیت کا اظہار وجودیت کے حوالے سے ہوا ہے اس رویے نے ادب میں فردیت، ابہام، احساس تنہائی اور مسلمہ ادبی قدار سے انحراف کی صورت پیدا کی اور پوری ادبی روایت سے بے تعلق ہونے پر زور دیا۔ معاشرے میں اس سے نراجیت کا رجحان پیدا ہوا۔ وجودیت کا اظہار ادب اور فن میں جدیدیت کی اصطلاح سے منسوب ہوا ہے۔ بے گانگی اور تنہائی کا احساس بھی اسی وجودی فلسفے سے وابستہ ہے جو جذبہ و احساس کی دنیا میں اتھل پتھل کا باعث بنا اور نراجیت، یعنی ہر قسم کی روایت اور پابندی سے بغاوت کا رویہ پیدا ہوا۔ ادب کی خود مختاری کا نظریہ ادب کی معنویت اور مقصدیت سے محروم کرنے کا وسیلہ ثابت ہوا، ساختیات اور بعد ساختیات بھی اس زمرے میں آتی ہیں اور تخلیق اور تخلیق کار کے درمیان فاصلے کی پرچارک ہیں اور متن سے معنی و مفہوم کی جستجو کی قائل ہیں اور ان کے مطابق تخلیق کار کو اس مشق سخن آفرینی اور سخن فہمی میں کوئی جگہ نہیں دی جانی چاہیے۔ جدیدیت کے ابتدائی عشرے، یعنی ۱۹۶۰ء کی دہائی میں علامت نگاری اور ابہام کی نت نئی صورت اور روایت برتے جانے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ افسانے سے کہانی نکلتی چلی گئی اور یوں افسانہ اپنے قاری سے دور ہوتا چلا گیا، افسانہ گویا زوال پذیر ہو گیا بہر حال افسانے میں یہ نراجیت کی کارفرمائی زیادہ دیر

تک نہیں رہی اور ۱۹۸۰ء کی دہائی سے صنف افسانہ میں کہانی کی واپسی سے افسانے کو نئی زندگی ملی۔ اس قسم کی نراجیت سے ادب کی دوسری اصناف خصوصیت کے ساتھ نظم و غزل کو دوچار ہونا پڑا، چنانچہ اس تاریخی پس منظر اور تناظر میں ایک حلقے کی طرف سے مجموعی طور پر ادب کے زوال پذیر ہونے کا نظریہ سامنے آیا اور ادبی حلقوں میں زیر بحث رہا۔

نراجیت کی ایک اور شکل ادب اور نظریے کے حوالے سے موضوع بحث بنی۔ ادب اور نظریے کے باہمی رشتے کے باب میں سب سے شدید موقف یہ سامنے آیا کہ نظریہ ادب کی تخلیقیت کو مجروح کرتا ہے بلکہ ادب کو غیر ادب بنا دیتا ہے۔ اس مکتبۂ فکر کے امام سید انتظار حسین نے فیض کی شاعری کو باوجود نظریے سے یک جان و دو قالب ہونے کے بڑی شاعری قرار دیا ہے اور شاعرانہ عظمت کا حامل مانا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ فیض کی مقبولیت اُن حلقوں میں بھی ہے جو فیض کے آدرش یعنی اشتراکی نظریے کے مخالف ہیں۔ اس میں کیا کلام ہے کہ سید انتظار حسین اس عہد کے معتبر صاحب فکر و دانش اور نقد و نظر کے شعبے کا بڑا حوالہ ہیں۔ بہرحال معنوی شعبۂ ادب میں یہ نراجیت کی شکل ہے اور ادب کو سماجی کردار سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ بالفاظِ دیگر اس حلقے کے مطابق ادب کو کلیتہً بے سمتی کا شکار اور مجذوب کی بڑ کے منصب پر فائز رہنا چاہیے، یعنی ادب سماج اور انسانیت کی خدمت سے مکمل روگردانی کی روش اختیار کرے اور اس نراجی روش کو تخلیقیت اور ادبی جمالیات کا سرچشمہ سمجھے۔

واضح رہے کہ ترقی پسند تحریک نے ہیئت اور مواد، ہر دو شعبوں میں نئے تجربات سے کبھی روگردانی نہیں کی، مگر کبھی کسی مرحلے پر کسی منفی رویے اور رجحان کی نہ تو تائید کی اور نہ پذیرائی بخشی ترقی پسندی مشروط ہے ادب کی معنویت اور سماجی مقصدیت سے ادب کا سب سے بڑا منصب انسانیت کی خدمت اور سماج کے سفر ارتقا میں ہم رکاب و ہم سفر رہنا ہے۔ یہ آدرش اور کاز (Cause) ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی ترجیح ہے، مگر ادبی جمالیات کی پاس داری بھی اس کے نصب العین میں شامل ہے۔ اس تناظر میں نراجیت کے لیے ترقی پسند حلقوں میں نرم گوشے کی

تلاش سعیِ لا حاصل ہے۔ ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں سجاد ظہیر نے اپنے ناول 'لندن کی ایک رات' میں شعور کی رو (Stream of Consciousness) تکنیک کو برتا اور شعری مجموعے 'پگھلا نیلم' میں نثری نظم کی صنف کی بھی توجیہہ کی اور یہ ثابت کرنے کی اپنی سی پہلی کاری کی کہ ترقی پسندی کسی جدید تجربے سے انحراف کی قائل نہیں، مگر کسی منفی رویے اور رجحان کی پذیرائی بعید از قیاس ہے، چنانچہ نراجیت کی کسی شکل وصورت میں ترقی پسند ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ اظہار کی آزادی کو تو زندگی کو حسین تر بنانے کے عملِ تخلیق سے مشروط رہنا چاہیے۔ فکری نراجیت، قنوطیت اور یاسیت کی ترویج کی صورت میں بھی ادب کو یہ مراحل درپیش آتے رہے ہیں۔ ماورائیت اور فری تجریدیت بھی نراجیت کے فروغ میں حصہ دار رہی ہیں اور ابہامِ محض کو عین حُسنِ تخلیق قرار دے کر بھی یہ فریضہ ادا کیا گیا ہے۔ ترقی پسندیدیت ادب کو درپیش ہر نوعیت کی نراجیت سے دامن کشاں رہی ہے۔ ہئیت کے نت نئے تجربوں سے ادب کی ثروت مندی میں اگر اضافہ ہوتا ہے تو اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے۔

ڈاکٹر عارفہ بشریٰ۔ سری نگر (کشمیر)

اردو شاعری میں تانیثیت

''تانیثیت''(Feminism) ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی کوئی ٹھوس اور ہر ایک کے لیے قابلِ قبول تعریف(Definition) نہیں کی جا سکی ہے۔ تانیثیت کی اصطلاح مغرب سے مشرق کی زبانوں کے ادب میں آئی ہے اور چونکہ خود مغرب میں مابعد جدید تصورِ ادب (Post Modern Concept of Literature) کے حوالے سے تانیثیت کی مختلف اور متضاد تعبیریں پیش کی جاتی رہی ہیں اس لیے اُردو میں بھی الگ الگ ناقدین نے ''تانیثیت'' کی اصطلاح کے معنی و مفہوم کی وضاحت الگ الگ انداز میں کی ہے۔ لیکن اردو میں بھی مغرب کی ہی طرح ایک بات پر تمام ناقدین اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ ''تانیثیت'' وہ ادبی رویہ یا رجحان ہے جو مرد اساس معاشرے میں ''عورت'' کے مساوی تشخص(Equal Identity) کی حمایت کرتا ہے۔ عورت کو مرد کے برابر تشخص قائم کرنے کی آزادی دینے کی حمایت کرنے والے مانتے ہیں کہ بیسویں صدی میں یونیورسل ہیومن لبرلزم کی تحریک بھی عورت کی مفرد شناخت کو ختم کر کے اُسے (عورت کو) مرد غالب معاشرے (Male Dominatied Society) میں دوسرے درجے کا شہری بنا رہی ہے۔ لیکن کچھ دانشوروں کے مطابق ''کسی بھی ادبی تحریر میں جب عورت کے جذبات و احساسات اور تجربات کو فنی و جمالیاتی در و بست کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تو اس تحریر کو تانیثی ادب کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔'' تانیثیت کے تحت ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے عورت اور مرد کے مابین فرق کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ عورت اور مرد کے بیچ ایک فرق تو صنف یا جنس(Gender) کا ہے اس فرق میں عورت اور مرد کی حیاتیاتی لازمیت(Biological Essentialism) کو بہت زیادہ اہم بلکہ بنیادی فرق مانا جاتا ہے صنفی فرق کو بدلا نہیں جا سکتا لیکن صرف اس کی بنیاد پر عورت اور مرد میں فرق کرنا اور عورت کو مرد سے کم تر درجہ دینا غلط ہے۔ دوسری بات یہ کہ عورتوں کی نفسیات

اور مسائل، مردوں کی نفسیات اور مسائل سے الگ ہوتے ہیں اس لیے مرد تخلیق کار ان کی نمائندگی یا ترجمانی نہیں کر سکتے۔ مرد ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں مرد غالب اور عورت مخالف تعصبات اور رویوں کا اظہار ابتدا سے ہی ہوتا رہا ہے۔ چاہے وہ معشوقہ یا محبوبہ کی بے وفائی، جور و جفا اور ستم کاری کے فرضی موضوعات کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ مغرب کی طرح مشرق میں خصوصاً اردو ہندی جیسی زبانوں میں تانیثیت کسی تحریک کی پیداوار نہیں ہے اور نہ ہی اردو میں ایسی شاعری منصوبہ بند طور پر کی گئی ہے۔ جیسی کہ مغربی زبانوں میں ملتی ہے۔ بلکہ اردو میں ابتدائی دور سے ہی ایسی شاعری ملتی ہے جس میں ہندوستانی لوگ گیتوں کے اثر سے مرد شاعروں نے نہ صرف عورت کو موضوع بنایا ہے بلکہ عورتوں کی زبان اور لب ولہجہ میں ہی اردو گیت اور اشعار کہے ہیں۔ اس طرح کی شاعری میں اکثر تانیثیت کی بُو باس تو نظر آتی ہے لیکن وفا یا جفا، حسن یا عشق، شوق یا رقابت، وصال یا ہجر کے حوالے سے۔ لہٰذا اس طرح کی شاعری میں تانیثیت کے نقوش کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اسکے لیے اردو میں شاعری کے ارتقا پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔

تاریخی اعتبار سے ہندوستان میں شعر و ادب کا باضابطہ ارتقا سولہویں صدی سے ہوتا ہے۔ علاء الدین خلجی نے ۱۳۱۰ء میں دکن فتح کر لیا تھا اور محمد تغلق نے ۱۳۳۴ میں اپنا دارالخلافہ دہلی سے دکن منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دکن میں سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ نے سب سے پہلے مسلم سلطنت ۱۳۵۳ء کے آس پاس قائم کی۔ اس وقت تک اردو زبان اور شاعری دونوں ہی تشکیلی دور سے گزر رہی تھیں اس دور میں مرد شاعروں نے دکنی اردو میں جو شاعری کی اس میں تانیثیت کے نام پر محض مونث یا عورت کے حوالے سے عورت کی زبان میں ہی عشقیہ جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مختلف شاعروں کے درج ذیل اشعار دیکھے جا سکتے ہیں:

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا — تمہیں ہیں چاند، میں ہوں جوں تارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور سا جنا یوں — کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

محمد قلی قطب شاہ

تو پیاری عشق بھی تیرا ہے پیارا لگیا بہت تج سوں دل ہمارا
سکھی آمل کہ تل تل ذوق کر لیں دنیا میں کوئی نہیں آیا دوبارا

----- عبداللہ قطب شاہ

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا تج بن منجے جینا بہوت ہوا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کھاتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں تج سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا

----- ملا وجہی

سجن آویں تو پردے سے نکل بھار بیٹھوں گی بہانا کر کے موتیوں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
اِنو، یہاں آو، کہیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں اچھلتی ہور مٹھلتی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی

------ سید میراں ہاشمی

دکنی اُردو شاعری کی مذکورہ بالا مثالوں میں مرد شاعروں نے عورت کی زبان اور لب ولہجہ میں معشوق کے تئیں معشوقہ (عورت) کے والہانہ عشق اور سپردگی کے جذبات پیش کئے ہیں۔ لیکن ان اشعار کا، تانیثیت کے آغاز و اسباب کی روشنی میں گہرائی سے تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا اشعار سولہویں صدی سترہویں صدی کے اس دکنی معاشرے کی پیداوار ہیں جس میں عورت بہ راضی و ررضا مرد کے آگے سپردگی کے لیے آمادہ رہتی ہے المیہ یہ ہے کہ سماجی اور اخلاقی روایات کے زوال اور سماجی شعور اور ذہنی بیداری نہ ہونے کے سبب اُس دور میں عورت یہ سمجھنے سے قاصر رہتی ہے کہ مرد غالب معاشرہ میں عورت کے سماجی استحصال، جنسی جبر اور منافقانہ رویہ کے فروغ میں عورت بھی مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ لیکن مذکورہ بالا اشعار دکنی اردو کے گیتوں کے ہیں جن میں مخاطب تو مرد ہے لیکن باتیں عورت کے لہجے میں عورت کی ہی کی گئی ہیں۔ لیکن سترہویں صدی کے اخیر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل تک آکر جب فارسی کے زیر اثر ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ نے سلیس اردو میں غزل گوئی شروع کی تو اردو میں ایسی شاعری کا آغاز ہوا جس میں مخاطب مرد تھا۔ اردو گیت میں مرد نگاہوں کا مرکز ہے اور اس لیے عورت بار بار مرد کو مخاطب کرتی ہے لیکن غزل میں عورت، شاعری کا مرکز ومحور ہے اس لیے غزل

گو شاعر بار بار عورت کو مخاطب کرتا ہے۔ عورت کی باتیں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو میں غزل گوئی کو عروج حاصل ہوا تو اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے فارسی کے دانشور شمس الدین محمد بن قیس الراضی کے اس قول کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا کہ غزل ''حدیثِ زنان وصفت عشق بازی با ایشان'' [1] ہے اور اردو میں غزل کا اصطلاحی معنی یہ رائج ہوا کہ ''غزل عورت سے باتیں کرنے کی ایک صورت ہے''۔ بعد میں پروفیسر حسن خان نے غزل کی اس توضیح میں کشادگی پیدا کرنے کے لیے کہا کہ ''غزل عورتوں سے باتیں کرنے کے بجائے عورتوں کی باتیں کرنے کا فن ہے'' [1] بہر حال دونوں صورتوں میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ غزل میں مونث (عورت) کا وجود بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور چونکہ تانیثیت کی اصطلاح کا منبع و ماخذ لفظ مونث (یعنی عورت) ہی ہے۔ اور اردو غزل چونکہ صرف اردو شاعری کی آبرو ہی نہیں بلکہ شاعری کی تمام اصناف میں غزل کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں اس لیے یہ کہنا زیادہ غلط نہیں ہوگا کہ غزل کے حوالے سے اردو شاعری میں ''تانیثیت'' (Feminism) کی ایک مخصوص صورت ابتدائی دور کی غزلوں میں ملتی ہے۔ لیکن ۱۷۰۰ء میں ولی دکنی گجراتی کے سفر دلی کے بعد اردو میں غزلیں لکھی گئیں ان میں عورت کو محض جفا، اور جور و ستم کے حوالے ہی پیش نہیں کیا گیا بلکہ اردو شاعری میں تصوف کے رجحان کے اُبھرنے کے بعد اردو غزل بلکہ پوری اردو شاعری میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کے حوالے سے حسن، عشق اور معشوق کے عنوان سے ایسی شاعری کی گئی جس میں معشوق سے مراد معشوق ارضی (عورت) بھی ہے اور معشوق حقیقی (خدا) بھی لیکن ڈاکٹر یوسف حسن اور ڈاکٹر سید عبداللہ، عشق کو مجازی اور حقیقی کے خانوں میں بانٹنے کے حق میں نہیں ڈاکٹر وزیر آغا بھی ان کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''عشق میں بنیادی تو جذبات ہی سے اُستوار ہوتی ہے اور اس لیے جذبے کے عنصر کی نفی ممکن نہیں۔ تاہم ایک اعتبار سے غزل کے عشق کے دو مدارج کی نشاندہی ممکن ہے ان میں سے ایک تو وہ جس میں معشوق (عورت) ایک بُت کی حیثیت میں عاشق (مرد) کو اس

کے اپنے عشق کا پرتو دکھاتا ہے اور عاشق (مرد) نرگسیت کے عمل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یعنی خود پرستی کے مسلک کو اختیار کر لیتا ہے۔۔۔۔دوسرا درجہ وہ ہے جہاں بُت (عورت خدا) شاعر کے جذبہ عشق کو وسیع اور عالمگیر ہونے اور اس کی شعاعوں کو زندگی کے دوسرے مظاہر تک پہنچانے کے لیے ایک آئینے کی حیثیت میں اُبھرتا ہے۔ اور یوں عشق میں عمومیت اور ماورائیت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔" (۱)

عشق مجازی اور عشق حقیقی کے حوالے سے جو اشعار کہے گئے ہیں ان سے عورت یا مونث کا کردار جھانکتا نظر آتا ہے۔ لیکن ایسے اشعار میں عورت مرد سے دور اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔ یعنی اس طرح کی شاعری میں عورت کی جفا کاری کے بجائے خودداری کے عناصر نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً اس طرح سے ہیں:

ہے گل رعنا بہار حسن کا　　ناز تیرا جو نیاز آمیز ہے

عجب کچھ لطف رہتا ہے شب خلوت میں گل رُو سوں　　خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

ولی دکنی/ گجراتی

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے　　میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

چھوٹا نہ اس کو دیکھنا ہم سے کسو طرح　　پایانِ کار مارے گئے اس ادا سے ہم

میر تقی میر

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی

عشق نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ تجھ بغیر　　اس گفتگو سے فائدہ پیارے، گزر گئی

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف   دل میں شعلہ سا کچھ لپکتا ہے

سودا

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز   گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نبا ہی ہو

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر   مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

خواجہ درد

اُس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے

دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

آتش

مذکورہ بالا اشعار کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کی شاعری میں مونث یا عورت کے لیے احترام کا جذبہ بھی سر اُبھارتا نظر آتا ہے۔ اور ساتھ ہی شاعری میں سماجی اور ثقافتی شعور اور قدروں کی تبدیلیوں کے اثرات بھی نمایاں ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل اُنیسویں صدی کے آغاز سے بالعموم اور ۱۸۵۷ء کے آس پاس سے بالخصوص، سرسید تحریک، آریہ سماجی تحریک اور راجہ رام موہن رائے کی تحریک، تعلیم کے پھیلاؤ اور مشینی دور کی شروعات کے سبب ہندوستانی مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین میں بھی بیداری کی لہریں پیدا ہونے لگیں۔ چنانچہ اُنیسویں صدی کے اوائل سے ہی اردو کے بعض اخبارات و رسائل میں عورتوں کی شعری تخلیقات بھی شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ میرٹھ کے ایک شاعر اور دانشور فصیح الدین رنج نے ۱۸۶۴ء میں اردو شاعرات کا ایک تذکرہ ''بہارستان ناز'' کے نام سے شائع کیا جس میں رنج میرٹھی نے اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کی ۱۸۵ اردو شاعرات کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے۔ اکثر شاعرات کے نمونہ ہائے کلام بھی درج کیے گئے ہیں۔

تذکرہ ''بہارستان ناز'' کے دیباچے میں رنج میرٹھی نے اپنے زمانے کے سماجی، ثقافتی، علمی اور ادبی منظرنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے تعلیم کے حصول پر زور دیا ہے اور خاص طور پر عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کی پرزور حمایت بلکہ وکالت کی ہے۔ رنج میرٹھی نے عورتوں میں تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں لکھا ہے۔

''۔۔۔ایک ولایت انگلیشیہ ہی میں یہ اب تک رواج ہے کہ کوئی عورت ادنیٰ ہو یا اعلیٰ لکھنے پڑھنے میں غیر کی کب محتاج ہے۔ کیسی کیسی علامۂ دہر فہامۂ دوراں ہیں۔ کس کس طرح معروف درس وتدریس بہ دل و جاں ہیں ایک ولایت ہند (ہندوستاں) پر یہ فقط نکبت ہے کہ علم کے نام سے مستورات کو کلیۃً نفرت ہے اور یہی وجہ باعث انواع ذلت و خواری ہے۔۔۔۔

طرّہ مزید یہ کہ جو لوگ ان کے وارث اور والی ہیں وہ ان سے بھی زیادہ تر بے خبر اور لا اُبالی ہیں کبھی ان کی تربیت کا خیال نہیں۔ ان ناقصوں کو ہرگز قدر کمال نہیں۔ حالانکہ سرکار گورنمنٹ کا یہ فیض عام اب ہر جگہ جاری ہے کوئی شہر و قصبہ ایسا نہیں جہاں اسکول اور مدرسے کی تعمیر و ترتیب نہیں۔ اگر یہ اس حال میں بھی اس (علم کی) دولت سے محروم رہ جائیں تو نہایت عجب ہے بلکہ میری دانست میں یہ بھی ایک خدا کا غضب ہے۔'' (۲)

میں نے اپنے مقالے کے آغاز میں تانیثیت (Feminism) کے معنی ومفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ تانیثیت کی تحریک کا مقصد خواتین کو روشن خیال اور اپنے حقوق وفرائض کے تئیں بیدار کرنا بھی ہے۔ اس زاویے سے اگر رنج میرٹھی کے تذکرہ ''بہارستان ناز'' کے دیباچے کے مذکورہ بالا اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اول تو اُنیسویں صدی کے وسط تک آکر خواتین بھی اچھی تعداد میں ہر طرح کی شاعری کر رہی تھیں جن میں سے کئی صاحب دیوان بھی تھیں۔ دوئم یہ کہ چونکہ روشن خیالی اور ذہنی بیداری کے لیے تعلیم ضروری ہے اس لیے رنج میرٹھی نے عورتوں کی تعلیم پر جس طرح زور دیا ہے اور جو اسلوب اختیار

کیا ہے اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ رنج میرٹھی کے خیالات، تانیثیت کے حامی ادیبوں اور دانشوروں کی فکر سے بڑی مماثلت رکھتے ہیں۔ رنج میرٹھی نے بین السطور یہی بات کہی ہے کہ عورت کو مرد کے برابر کھڑا ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے عورت کا تعلیم یافتہ ہونا پہلی شرط ہے۔

غرض یہ کہ اردو شاعری میں تانیثی فکر یا تانیثیت کے عناصر ۱۸۵۷ء کے بعد باضابطہ طور پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق اس لیے اُنیسویں صدی کی شاعرات نے عورت کے جذبات واحساسات اور تجربات و مشاہدات کا اظہار، عورت سے مخصوص روایات، اقدار اور شرائط کے اندر رہتے ہوئے ایسی شعری تخلیقات پیش کیں جنھیں اردو کی تانیثی شاعری کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا چندا تھیں۔ چندا نے اپنا دیوان اکتوبر ۱۷۹۹ء میں مکمل کیا اس کا ایک نسخہ لندن کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔ چندا نے غزل، رُباعی، قصیدہ وغیرہ کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ تانیثی یا نسائی جذبات وخیالات کے اعتبار سے چندا کے دو اشعار قابل غور ہیں۔ مرد یا اپنے معشوق سے مخاطب ہو کر وہ احتجاجی لہجے میں کہتی ہے۔

اخلاق سے تو اپنے واقف جہان ہوگا — پر آپ کو غلط کچھ اب تک گمان ہوگا

یک لخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینہ کو — پر کیا کروں کہ تیرا، رُو درمیان ہوگا

رنج میرٹھی نے اپنے تذکرہ 'بہارستانِ ناز' میں کلکتہ کی ایک شاعرہ مُنی بائی حجاب کے اشعار نقل کیے ہیں ان کے اشعار میں اپنے زمانے کے سیاسی معاشرتی اور تہذیبی انتشار و بحران کی بھی نشان دہی ملتی ہے۔ حجاب کے ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی شاعرات کے یہاں بھی فکر اور دانشوری کے عناصر کی کمی نہیں تھی۔ اس کا اندازہ منی بائی حجاب کے درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

حالِ حجاب قابل شرح و بیان نہیں — آنسو نہ ٹپکے سن کے یہ وہ داستاں نہیں

پوچھو نہ حال زار مراتم سے کیا کہوں　　گم کردہ راہ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
ہم بھی خرید لیتے ترے ظلم کے لیے　　بازار دہر میں کوئی دل کی دکاں نہیں

اگر حجاب کے ان اشعار کو دلی پر نادر شاہ کے حملہ اور شاہ عالم ثانی کے بحرانی دور، غدر ۱۹۵۷ء کے آس پاس ہندوستانیوں پر انگریزوں اور مرہٹوں کے مظالم کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ منی بائی حجاب نے ان اشعار میں تانیثی لب ولہجہ میں دراصل اپنے زمانے کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے اس دور کی بدحالی کا ذکر میر تقی میر، سودا اور درد اور مرزا مظہر جان جاناں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے مظالم اور زور زبردستی کے حوالے سے مظہر جان جاناں کا یہ شعر مشہور ہے۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے　　اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد مغل بادشاہوں کے عبرت ناک حالات اور انجام پر میر تقی میر نے اٹھارہویں صدی میں ہی کہا تھا

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاک پا جن کی　　انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

دراصل عصری حالات وکوائف کے بیان کو بھی تانیثیت یا تانیثی فکر کا ایک رُخ ہی مانا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے منی بائی حجاب کی شاعری اردو میں تانیثی شاعری کے ارتقا کا ایک اہم موڑ ثابت ہوتی ہے۔ اردو میں حجاب کے بعد بھی کئی شاعرات ایسی نظر آتی ہیں۔ جن کے یہاں صرف نسائی اظہار نہیں بلکہ مرد اساس معاشرے کے ساتھ مکالمہ بھی نظر آتا ہے۔ اس کا اندازہ اُنیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدیں کے اوائل تک کی بعض شاعرات کے اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص　　حیا ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کر

نواب حیات النسا بیگم حیا

جن سے ہم آشائی کرتے ہیں　　ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

بادشاہ بیگم خفی

لکھنؤ کی شاعرہ اُمراؤ جان زہرہ کی شاعری میں مردوں سے مکالمہ کی واضح صورتیں ملتی ہیں اودھ اخبار میں زہرہ کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔

مرا دردِ دل یار نے کھو دیا　　ہوا آدمی آدمی کی دوا

یہ تقدیر کی خوبیاں دیکھیے　　ملا بھی تو اک بے وفا آدمی

اُمراؤ جان زہرہ

اُمراؤ جان زہرہ کے اشعار میں مرد اساس معاشرے کے خلاف باغیانہ تیور بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً درج ذیل غزلیہ اشعار کو تانیثی شاعری کی عمدہ مثالیں کہہ سکتے ہیں۔

ہم سے سخنِ عجز سنایا نہیں جاتا　　ہم سے کبھی روٹھے کو منایا نہیں جاتا

صد شکر کہ طفلی سے جوانی کا سن آیا　　اب ہم سے ترا ناز اُٹھایا نہیں جاتا

ہم معرکہ عشق میں شیرانہ کھڑے ہیں　　میدان سے اب پاؤں ہٹایا نہیں جاتا

کیا روز قیامت میں زباں اپنی میں کھولوں　　بگڑی ہوئی باتوں کو بنایا نہیں جاتا

دلچسپ بات یہ ہے کہ دکنی اردو میں جہاں بعض مرد شاعروں نے عورت کی زبان میں اشعار کہے وہیں ۱۸۵۷ء کے بعد ایسی کئی شاعرات نظر آتی ہیں۔ جنھوں نے مردوں کی زبان میں شاعری کی ہے گویا شاعری کے میدان میں شاعرات نے مردوں کے انداز اور لب ولہجہ کو اپنا کر مردوں کی برابری کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے ہم ''تانیثیت'' کی ہی ایک ارتقائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ تانیثیت کا بنیادی فلسفہ ہی یہ ہے کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں عورت، مرد سے

پیچھے نہ رہے۔ مردانہ زبان اور لہجے میں شاعرات کے یہ اشعار قابل غور ہیں:

اے تب تجھے دکھا کے خدا سے کہوں گا میں ایمان اپنا کھویا ہے ہم نے اسی کے ساتھ

----- امراؤ جان زہرہ

وہ تو ہمارا لے گئے بیٹھے بٹھائے دل ہرگز نہ کوئی آپ سے اپنا پھنسائے دل

فریاد کر رہا ہوں میں گھڑیال کی طرح یارب وہ خود جلے نہ ہمارا جلائے دل

سردار روز حشر کو اُٹھ کر کہے گی یہ عاشق کہاں سے سنگ کا اپنا بنائے دل

----- سردار بیگم سردار

کشتنی کون ہے اے دل نگہ یار میں آج تیغ سنتا ہوں کہ ہے دست ستمگار میں آج

----- ستم بنارسی

ایسے دریائے بلا میں غرق ہے کشتی مری توبہ جس کے نام سے اے ناخدا ساحل نے کی

گرمی سوز جگر سے ہو گیا ہوں جل کے خاک یہ شرارت آتشیں رخسار سے قاتل نے کی

----- امیر جان شرارت

ان کی باتوں میں خدا کے لیے آنا نہ شباب یہ حسینانِ جہاں کس سے وفا کرتے ہیں

----- محمدی جان شباب

دل سی شے، آپ کو یوں مفت دے دیتا ہوں ہوں تو ناچیز مگر دیکھیے ہمت میری

----- مولا جان شوکؔ

پری زادوں میں تم مشہور، میں مشہور دیوانہ اگر تم شمع محفل ہو تو یہ بندہ ہے پروانہ

----- بیگا شیریں

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایسی کئی شاعرات نظر آتی ہیں جنھوں نے شاعری کو مردوں کی طرح ہی برتا۔ ان کے اشعار پڑھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ کسی عورت کے اشعار ہیں یا مرد کے۔ ان اشعار میں موضوعات لفظیات اور انداز بیاں سب

کچھ ویسا ہی ہے جیسا کلاسیکی شاعری میں عام ہے۔ مثال کے طور پر مرزا غالب کی ہم عصر شاعرہ نواب شاہ جہان بیگم شیریں، صاحب دیوان شاعرہ تھیں ریاست بھوپال کی والیہ تھیں۔ ان کا دیوان ۱۲۸۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور بیاضیں بھی تھیں۔ جنھیں مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی شعری تخلیقات مختلف تذکروں اور تاریخوں میں درج ملتی ہیں، کلاسیکی غزل کی شعریات کے قاعدے سے کہی گئیں ان کی غزلوں کے چند اشعار اس طرح ہیں:

شیشہ خانہ میں جو آئینہ عذار آئے نظر — چشم مشتاق کو حیرت کی بہار آئے نظر
روز روشن میں اگر زلف تو اپنی کھولے — نور ظلمت سے بدل ہو شب تار آئے نظر
اس زمیں میں غزل ایک اور بھی لکھو شیریںؔ — جس کے ہر لفظ سے انداز نگار آئے نظر

لطف کیا پاؤ گے تنہا دل شیدا لے کر — دیکھیے سیر بھی کچھ یاس و تمنا لے کر
غم سے مرتا ہوں نہ شرمائے اجل بالیں پر — کوئی زندہ نہ کرے نام تمھارا لے کر
جھوٹی قسموں سے دلاسے تو نہ دو شیریںؔ کو — دل بھی پھیرا ہے کبھی تم نے کسی کا لے کر

اسی دور کی ایک اور شاعرہ اُمتہ الفاطمہ بیگم تھیں جن کا تخلص ''صاحب'' تھا اور عرف عام میں صاحب جی کہلاتی تھیں۔ مشہور شاعر حکیم مومن خاں مومن سے علاج کروانے کے لیے ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے دہلی آئی تھیں لیکن مومن خود صاحب جی سے عشق کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ جب صاحب جی دلی سے واپس لوٹ گئیں تو مومن نے ان کے فراق میں ایک مثنوی ''قول غمیں'' کے عنوان سے لکھی۔ صاحب جی نے محض ایک شاعر کی طرح غزلیں لکھیں۔ اور اس طرح صاحب نے بھی تانیثیت کے نظریے کے عین مطابق اپنے آپ کو مردوں کی ہی طرح ایک آزاد اور خود مختار وجود مان کر شاعری کی ہے۔ تانیثیت کے مغربی اور مشرقی شارحین نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ صنفی اور حیاتیاتی خصوصیات (Gender and Biological

(Qualities کے اعتبار سے عورت اور مرد میں فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن عورت اور مرد کو کمتر یا برتر خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اُنیسویں صدی کے وسط تک مرد تو مرد خود عورتیں بھی مردوں کو Superior Sex مانتی تھیں۔ مغرب میں انا جیمسن Anna Jameson آزادی نسواں کی حامی تھیں لیکن وہ بھی یہی مانتی تھیں کہ عورت، صنف عقل اور قوت کے اعتبار سے مرد سے اور مختلف ہوتی ہے۔ انا جیمسن کے لفظوں میں۔

" The intellect of women bears the same relation to that of man as her physical organisation, it is inferior in power and different in kind" 3-

یہاں مشرق خصوصاً ہندوستان میں عورت کو ہمیشہ سے سگھڑ بیوی، ذمہ دار ماں، خدمت گزار بیٹی اور اطاعت شعار بہن کے روپ میں ہی دیکھا اور دکھایا گیا ہے، اردو ادب میں بھی عورتوں کے لیے ایسے ہی رویے ملتے ہیں۔ یہ عیب نہیں مشرقی معاشرے کا خاصہ ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد علی گڑھ تحریک اور دیگر تحریکوں کے سبب ہندوستان میں بیداری اور روشن خیالی کی جو شروعات ہوئی اس کے اثرات اردو شاعری پر بھی پڑے، چنانچہ بیسویں صدی تک آتے آتے اردو شاعری میں جدت پسندی کے جو رجحانات سامنے آئے ان کی وجہ سے شاعری میں عورت کے کردار کو بھی نئے روپ میں پیش کرنے کی روایت قائم ہوئی۔ وزیر آغا نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' میں لکھا ہے۔

''سرسید احمد کی تحریک کے تحت اردو زبان میں وسعت کا مطالبہ عام ہوا تو قدرتی طور پر غزل کی اصلاح کا رجحان بھی سطح پر آ گیا اور اس سلسلے میں حالی نے غزل کو نئے موضوعات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں حرج قطعاً کوئی نہیں تھا کیونکہ غزل کے لیے کوئی شے، موضوع یا رجحان ممنوع نہیں ہے۔۔۔۔ لیکن حالی کی مسلسل غزلیں نظموں کی صورت اختیار کر گئیں۔'' (۴)

اس طرح اردو میں حالی نے غزل مسلسل کا رواج قائم کیا۔ کیونکہ یہ دور علی گڑھ تحریک کا دور تھا۔ اور ادب کے حوالے سے عوام میں خصوصاً مسلمانوں میں بیداری، خود اعتمادی اور روشن خیالی پیدا کرنے کا رجحان عام تھا چنانچہ حالی اور ان کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد، اسمعیل میرٹھی اور وحید الدین سلیم پانی پتی وغیرہ نے غزل مسلسل کو اتنا بڑھایا کہ غزل اور نظم میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی غزل کے مزاج کو بدلنے کی کوشش کی گئی اور غزل میں عورت کے حسن وعشق، وفا یا جفا کے بجائے زندگی اور زمانہ کے تلخ حقائق اور مسائل کی ترجمانی ہونے لگی۔ اس کا اندازہ حالی کی ایک غزلِ مسلسل کے ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا — ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف — بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس — اور یاروں کے یار ہیں غماز
ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ — ہے پرآشوب جب کہ یہ آغاز

اسی دوران محمد حسین آزاد، اسمعیل میرٹھی، حالی، شبلی، اور اکبر الہ آبادی وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں موضوعاتی نظمیں لکھنے کی روایت کو آگے بڑھایا جس کی شروعات نظیر آبادی پہلے کر چکے تھے، مغربی نظم کے انداز میں اس دور کی جدید اردو نظم نگاری کا مقصد بھی قوم کی اصلاح تھا۔ اور قوم کی اصلاح کا یہ مقصد اردو کے ابتدائی ناولوں میں بھی سامنے آیا۔ اس دور یعنی اُنیسویں صدی کے دور آخر میں اردو غزل اور نظم کے علاوہ ناولوں میں بھی خاص طور پر قوم میں بیداری اور روشن خیالی پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ نذیر احمد کے ناولوں مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) نے خاص طور پر خواتین کی پس ماندگی اور زبوں حالی کو موضوع بنایا۔ ''مراۃ العروس'' میں خیر و شر عورتوں کی روشن خیالی کے ساتھ ساتھ ذہنی پس ماندگی کی تصویر

کشی کے لیے اصغری اور اکبری کے کردار تراشے گئے۔ امور خانہ داری میں ماہر ہونے کے فائدے بتائے گئے۔ عورت کے سلیقہ شعار اور تعلیم یافتہ ہونے پر زور دیا گیا۔ شوہر پرستی کو عورت کا خاص وصف قرار دیا گیا۔ اسی طرح رتن ناتھ سرشار نے حسن آرا اور ثریا کے ذریعے سماج کے کئی مسائل پر سے پردہ اُٹھایا۔ سرشار کی ہیروئن تعلیم یافتہ اور خود اعتماد ہیں لیکن بعض نسوانی کردار عیار اور بدکردار بھی ہیں۔ عیاش مردوں کی کمزوریوں کا فائدہ بھی اُٹھاتی ہیں۔ اسی طرح مرزا ہادی رُسوا اپنے ناول ''امراؤ جان'' (۱۸۹۷ء) میں امراؤ جان کے ذریعے لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

اردو کے اس ادبی منظر نامے سے اُردو کی شاعرات بھی اثرات قبول کرتی ہیں۔ اور اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو شاعرات بھی غزل اور نظم کے نئے موضوعات، نئے اسالیب اور رجحانات کو برتتے ہوئے اردو شاعری میں تانیثیت (Feminism) کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں ہی لکھا ہے مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق اس لیے اردو شاعری میں تانیثیت کا عروج وارتقا تو ہوا لیکن کم وبیش ۶۰۔۱۹۵۰ء تک تمام شاعرات نے اردو شاعری کی روایات اور رسومات کی پیروی کرتے ہوئے اپنی عصری حسیت، روشن خیالی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ اپنی غزلوں اور نظموں میں کیا ہے۔ اس دوران رومانوی تحریک، حلقہ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک سے لے کر جدیدیت کے رجحان تک اردو شاعرات نے اپنی شاعری میں بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی اور ثقافتی حالات کے تناظر میں جس طرح اردو کے ادبی رجحانات، موضوعات اور اظہاری رویوں کا ساتھ دیا ہے اور اس کا اندازہ انیسویں صدی کے اور بیسویں صدی کے اوائل کی شاعرات سے لے کر عصر حاضر میں ادا جعفری زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، شگفتہ طلعت سیما، ترنم ریاض، رخسانہ جبیں، نصرت چودھری، رفیعہ شبنم عابدی، سارہ شگفتہ شبنم عشائی اور نسرین عشائی وغیرہ کے یہاں تانیثیت کی عمدہ ارتقائی صورتیں ملتی ہیں۔

دراصل بیسویں صدی کے وسط تک آ کر خاص طور پر فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، اور پروین شاکر وغیرہ کے یہاں پہلی بار خواتین کے اپنے مخصوص مسائل اور اُلجھنوں کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ یہ وہ خواتین ہیں جو مردوں کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ عین تانیثیت Feminism کے فلسفے کے مطابق ان کی شاعری میں جو کرب اور احتجاج ہے وہ برسوں نہیں صدیوں تک عورتوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا نتیجہ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ احتجاج اور تلخ حقائق کے اظہار کے باوجود ان کے لہجے میں لوچ نرمی اور شگفتگی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو کی یہ شاعرات، اردو شاعری میں تانیثی فکر یا تانیثیت کے فروغ میں اہم کردار نبھانے کے باوجود ''عورت'' کی فطری خصوصیات کو بھی قائم رکھے ہوئی ہیں۔ اردو شاعرات نے عصر حاضر میں تانیثیت کو کس کس طرح برتا ہے اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی ۔۔۔ وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

----- پروین شاکر

کچھ نہ ہو لیکن بھرم رکھنا بہت ۔۔۔ خستگی ناہید بن جائے نہ جرم

----- کشور ناہید

پتھر کو جانتے تھے مگر پوجتے رہے ۔۔۔ اہل وفا تھے اور مروت کی بات تھی

----- ادا جعفری

تمھیں میں دیوتاؤں کی کوئی خوبی نہ تھی ورنہ ۔۔۔ کمی کوئی نہیں تھی میرے انداز پرستش میں

----- نوشین گیلانی

کروں گی میں ہی چراغاں ترے جزیرے کو ۔۔۔ مرے صدف کے مقدر میں تو سیاہی لکھ

----- رخسانہ جبیں

لاکھ پتھر ہوں مگر لڑکی ہوں ۔۔۔ پھول ہی پھول ہیں اندر میرے

----- عشرت آفرین

ہر اک ملی تھی اُسی سر و قد کی شیدائی کہ جس کے بازو قوی تھے، بدن چھریرا تھا

رفیعہ شبنم عابدی -----

برکھارت میں بادل لے کر کس کا سندیسا آیا ہے آنکھیں ایسی شرمائیں کیوں آنچل کیوں لہرایا ہے

زرینہ زریں -----

جو مجھ کو سوچو، کبھی آ کے مجھ میں اُتر و تم چھپے ہوئے ہیں مفاہیم کے بھی در مجھ میں

انیسہ تنویر -----

تمھاری خواہش کے توڑ ڈالے ہیں سارے لات و منات ہم نے
اگر ہو فرصت تو کعبہ دل کا تم بھی آ کر طواف کرنا
نہ کوئی تلمیح و استعارہ، نہ ہے سخن کوئی قند پارہ
کہ زندگی نے سکھا دیا ہے ہمیں ہر اک بات صاف کرنا

رشیدہ عیاں ------

مذکورہ بالا شاعرات کے اشعار میں تانیثیت تو ہے لیکن اکثر و بیشتر شاعرات کے یہاں بے باکی اور صاف گوئی کے عناصر زیادہ ہیں جبکہ شاعری خصوصاً غزل ایہام اور اشارہ و کنایہ سے عمدہ شاعری بنتی ہے۔ شاعری میں بے باک اور باغیانہ لب و لہجہ عورت کی فطرت کے منافی بھی تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے شاعری کی جمالیاتی سطح بھی پست ہو جاتی ہے۔ لیکن اردو کی تانیثی شاعری میں ایسی شاعرات کی بھی کمی نہیں جن کے یہاں احتجاج کا نہایت شائستہ شاعرانہ انداز برتا گیا ہے۔ مثلاً نصرت چودھری سعدیہ روشن صدیقی، کہکشاں تبسم، عشرت آفریں، رفیعہ شبنم عابدی وغیرہ اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

آواز جس کی گونج رہی ہے فضاؤں میں میں اس کو یاد کرتی ہوں اکثر دعاؤں میں

لمحہ لمحہ مجھے سُولی پہ چڑھانے والو تم سے کس منہ سے میں جینے کا سہارا مانگوں

جو لوگ کسی شے کی تمنا نہیں کرتے خوابوں کے دریچے سے وہ جھانکا نہیں کرتے

ہر اک سے سمجھوتہ کرو گے تو شاید بچ پاؤ گے میری طرح دنیا میں ورنہ تم بھی دھوکا کھاؤ گے

نصرت چودھری

بے خطا ہم نے کب کہا خود کو سعدیہ ہم کوئی فرشتہ ہیں؟

سعدیہ روشن صدیقی

وفا کے نام کی اتنی تو پاسداری ہو میں اس کو چاہوں اسے میری بیقراری ہو

یہ اضطراب یہ چاہت یہ بے بسی مینا کبھی تو تجھ کو بھی اس پیار کی خماری ہو

مینا نقوی

کی ہے ایسی بھی کیا خطا جاناں تم نے تڑپا کے رکھ دیا جاناں

غم جو تو نے دیئے ہیں راحت کو تیرا سو بار شکریہ جاناں

راحت سلطانہ

ہماری بے کسی ہے اور ہم ہیں ہر اک سو تیرگی ہے اور ہم ہیں

محبت سے سراسر ہے جو خالی اُسی کی دشمنی ہے اور ہم ہیں

نینا جوگن

مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں لیکن مذکورہ بالا اشعار سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو میں تانیثی شاعری اپنی ارتقائی صورت میں ایک مضبوط و مستحکم رجحان کے طور پر سامنے آئی ہے اور شاعرات، فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ جو کچھ بھی کہہ رہی ہیں وہ ان کا اپنا محسوس کیا ہوا ''سچ'' ہے۔ آج کی عورت اپنی شاعری کے ذریعے مرد اساس سماجی نظام کی اس فرسودہ روایت سے بہت اوپر اُٹھ چکی ہے کہ آدم کو جنت سے نکلوانے کی ذمہ دار صرف اور صرف ''حوا (عورت) تھی۔ اسی بنیاد پر عورت کو ''شر'' اور مردوں کے لئے ''باعث شر'' قرار دیا گیا۔ لیکن آج کی عورتوں نے جن میں شاعرات بھی شامل ہیں اس طرح کے سارے تصورات کو رد کر

دیا ہے۔اُردو شاعری میں بیسویں صدی کے وسط تک آکر خواتین کی شاعری میں، مردوں کے مساوی حقوق رکھنے، استحصالی روایات واقدار کی مخالفت کرنے اور اپنے ''وجود'' کی آزاد اور خود کفیل حیثیت کو منوانے پر اصرار بھی کروٹیں لے رہا ہے۔اس سلسلے میں بعض شاعرات کے یہاں باغیانہ، اور جارحانہ انداز بھی سامنے آیا اور کئی شاعرات نے اپنی شاعری میں غیر ضروری ''بے باکی'' کا مظاہرہ بھی کیا لیکن پھر بھی بیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے اردو کی تانیثی شاعری میں، عورت کے مخصوص مسائل اور مرد غالب معاشرہ کے جبر سے قطع نظر اب وہ کائنات، فطرت، دیو مالائی ہستیوں، سیاسی اور سماجی نظام، اخلاق اور ثقافتی اقدار سے متعلق اپنے آزادنہ خیالات کا فنی وجمالیاتی دور بست کے ساتھ اپنی غزلوں اور نظموں میں اظہار کر رہی ہیں۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''اردو شاعری کا مزاج'' ناشر سیمانت پرکاشن، نئی دہلی ۲۰۰۰ ص۔۳۰۲

۲۔ رنج میرٹھی ''بہارستان ناز'' بحوالہ تذکرہ قدیم شاعرات اردو مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری ناشر جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز ۱۹۹۶ء ص۔۱۵

۳۔ بحوالہ اردو میں تانیثی ادب مرتبہ پروفیسر عتیق اللہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲۰۰۷ء ص۔۱۱

۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا اردو شاعری کا مزاج ناشر سیمانت پرکاشن، نئی دہلی ۲۰۰۰ء ص۔۳۰۵

۵۔ تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر از ابوالکلام قاسمی مشمولہ بیسویں صدی خواتین اردو ادب ناشر موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۲ء ص ۶۲

۶۔ Women's Writing: Text and context by Jasbir Jain Published by Oxford. U.K. 1993 P.47

۷۔ بحوالہ اردو میں خواتین کی خودنوشتیں مرتبہ ڈاکٹر شاداب سید ناشر حسن پبلی کیشنز ممبئی سن اشاعت ۲۰۰۸ء ص۔۵۳۔۶۵

طارق بن عُمر

علامہ اقبال۔۔۔ ''یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید''

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کی شخصیت کو فکری زاویے میں یوں اُجاگر کیا،

''اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، وہ حکیم بھی ہے اور کلیم بھی، وہ خودی کا پیغامبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی، وہ تہذیب و تمدن کا نقاد بھی ہے اور محی الملت والدین بھی، وہ توقیر آدم کا مبلغ بھی ہے اور تحقیرِ انسان سے دردمند بھی۔ اس کا کلام بھی فکر و ذکر سے ہم آغوش ہے اور خبر و نظر آئینۂ یک دگری (۱)

اقبال کا زمانہ بنیادی طور پر ایک تغیر پذیر زمانہ تھا۔ جہاں زندگی اپنے ساتھ بہت سے انقلابات کو لیے نمودار ہورہی تھی۔ مغرب اپنے علم کی بدولت فکر و نظر کا فلسفہ اِس انداز سے مشرق پر مسلط کرچکا تھا کہ تقلیدِ مغرب ہی زندگی کا اصل قرار پانے لگی۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مزید فرماتے ہیں

''اقبال کا نظریہ حیات ارتقائی ہے یہ ارتقاء انسان کو مسلسل تسخیر فطرت سے حاصل ہوا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی مسلسل جدوجہد اور تخلیق کا نام ہے۔ فطرت کے جبر پر قابو پا کر خودی کی استواری اس کی تلقین کا ایک اہم عنصر ہے۔ کائنات انفس و آفاق پر مشتمل ہے۔ اور ان دونوں کی تسخیر انسان کا وظیفۂ حیات ہے۔ طبیعی سائنس آفاق کی تسخیر کا نام ہے، اس لیے اقبال اس کو غلط اندیشی اور غلط روی قرار نہیں دے سکتا، اس کو صرف یہ شکایت ہے کہ اس یک طرفہ تسخیر نے انسان کی روحانی زندگی کا توازن بگاڑ دیا ہے۔'' (۲)

علامہ اقبال کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اُن کا دور غلامی کا دور تھا۔ اور اس غلامی کے دور کو مسلم قوم نے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ اس مایوسی کے عالم میں اقبال نے وہ

راستہ چُنا جو مکمل طور سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن اقبال اپنا فرض ادا کرتے رہے، اور قوم میں زندگی کی حرارت، سودائے حریت اور جانثاری کا درس دیتے رہے، ایک ایسی دنیا کا راستہ دکھاتے رہے کہ بے چارگی، مجبوری اور قسمت کا لکھا کہہ کر چپ رہنے والوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اِس ساری صورتحال کو بدلنے کے لیے اقبال کو بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اُڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے — چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا — سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

مسلمانوں کی زندگی مکمل طور سے تباہی کا آئینہ تھی۔ بے بسی، غفلت، مجبوری، خود فراموشی، غلامی جیسے عناصر نے مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ علم کا میدان ہو یا تجارت کا، دولت ہو یا ثروت، تعمیر کا جذبہ ہو یا تخلیقِ فکر، نہ اُمنگ تھی نہ جذبہ۔ یہ سب کچھ اقبال کے سامنے تھا۔ یوں اقبال پکار اُٹھے

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

جناب عابد حسین قریشی نے اقبال کی فکر کو ایک نئے زاویئے سے کچھ یوں پیش کیا

"اقبال نے یہ جان لیا کہ وہ پھول جو اپنے بیجوں سمیت مٹی میں جا ملا ہے، نیست و نابود نہیں ہوا بلکہ زمین ایک ماں کی کوکھ کی مانند اس کی پرورش کرے گی، اور آئندہ موسم تک اس کے بیج کا ایک نیا پودا بن کر مٹی میں سے باہر نکالے گی۔ وہ پھل جو درخت سے گر کر زمین میں مل گیا، فنا نہیں ہوا۔ اس کے بیج زمین کے اندر اپنی تکمیل کے مراحل طے کر کے دوبارہ نئے پودے کی شکل میں اپنی کونپلیں باہر نکالیں گے۔ اِسی طرح وہ انسان جو مر گیا ہے،

بظاہر اپنا سفر مکمل کر کے مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا ہے، مگر کچھ ایسا بھی ہے جو مکمل طور پر فنا نہیں ہوا۔ جو کسی اور جگہ سے کسی اور شکل میں اپنا دنیاوی تسلسل قائم رکھے گا۔ الغرض اسی طرح مادیت پر مبنی حیاتیاتی نظام کے مراحل اور تسلسل قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ، بظاہر وہ تمام مادّی وجود جس میں خودی کی ترقی کا ظہور نہیں ہوا، انفرادی طور پر فنا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن دراصل روحانی طور پر اپنی بقا کسی اور جگہ کسی اور شکل میں قائم رکھے ہوتے ہیں عالم نباتات میں ایک پودے کا بیج ہو یا دو جرثوموں (Spermatozoom and ovum) کے ملاپ سے مکمل ہونے والا نیا Zygote نئی زندگی کی تخلیق مکمل کرنے کے لیے ہزار ہا مشکل اور پیچیدہ مراحل سے گزرنے کے بعد Survival of the fittest. کے اُصول کے مطابق صرف شدہ زندگی کی حرارت کو چھو سکے گا۔ جو اِن تمام مشکل مراحل میں سے کامیابی کے ساتھ گزر کر ہر لحہ اپنی بقاء قائم رکھنے کے قابل ہوا ہو، کہ یہی لذت وجود تھی۔ جس نے ہست و بود کے جھمیلوں میں سے تخلیقی تڑپ سے بے چین نئی زندگی کو باہر نکالا، کیوں کہ یہی خالق کائنات کا اصول یہی اس کا انداز اور یہی اس کی مرضی تھی۔ تخلیق کے اِن مشکل مراحل کے دوران، بمطابق نظریات اقبال، جس وجود نے اپنے شعور کی ترقی اور خودی کو برقرار رکھا، وہی تخلیقِ زندگی کے افق پر نمودار ہوگا اور جس کی خودی ان مراحل کے دوران کسی نہج پر کمزور یا مردہ ہوگئی وہ دورانِ تخلیق کسی نہ کسی درجے پر نیست و نابود ہو کر اپنا وجود گنوا بیٹھے گا۔ (۳)

اقبال کی شاعری میں جہاں ہمیں روحانیت کا عنصر نظر آتا ہے، وہاں اخلاقی مقاصد بھی چھپے ہوئے ہیں۔ اقبال اپنی شاعری کے ذریعے مسلم قوم میں ایک ایسا جذبہ اور ایک ایسی قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں، کہ جس کے ذریعے فطرت کے اُصولوں پر قابو پایا جا سکے۔ یہ سب کچھ اقبال کی نظر میں ممکن ہے، بشرطیکہ اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو پہچانا جائے اور انھیں ہمہ وقت بیدار رکھا جائے۔ اقبال یہ بات جانتے تھے کہ مسلمان قوم اگرچہ دوسری اقوام سے سیاسی اور اقتصادی

طور پر ملاپ تو کر سکتی ہے مگر معاشرتی وتہذیبی بنیادوں پر نہیں۔ یوں ایک ایسی تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو صدیوں سے جاری جمود کو توڑے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ قوم حرکت پذیر ہونے لگی۔ اقبال کی شاعری اور فلسفیانہ اندازِ فکر نے جدید تصورات کے ساتھ، قرآن وسنت کو دلیل ٹھہراتے ہوئے، نوجوانوں میں تصورات کا ایک نیا رنگ پیش کیا۔ جس طرح زندگی مسلسل ترقی کا نام ہے، اور ایک ایسی ترقی جو کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لے، نئی نئی خواہشوں کو پیدا کرے، حفاظت اور بلندی کے ذریعے رکاوٹوں کو عبور کرے اور اس منزل کو پانے کے لیے اپنے اندر چھپی ہوئی اُن قوتوں کو بروئے کار لائے جو قدرت نے اسے عطا کیں ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی زندگی کے سبق کو سمجھنے کی کوشش کرے، کہ یہی زندگی ہے۔ اقبال نے ہمیں وہ اُصول بتائے ہیں کہ جن کی بدولت ٹھہر جانا موت اور موجِ بے قرار زندگی ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں

''اقبال کے یہاں زمانے کے دو تصور ہیں، یعنی باطنی اور ظاہری وہ سمجھتے ہیں کہ زمان کی حقیقت ایک سربستہ راز ہے۔ اس کے سمجھنے میں جو مشکلیں پیدا ہوتی ہیں وہ آسانی سے حل نہیں ہوتیں۔ اقبال کہتے ہیں ہماری فکر کائنات کو اس کی مجموعی اور کلی حیثیت میں گرفت میں نہیں لے سکتی۔ مکان کی حیثیت ایک فکری سانچے کی طرح ہے جس کے ساتھ ہم اشیاء پر غور کرتے ہیں۔ مکان ایک اکائی ہے جو ایک اور اکائی یعنی زمان میں قائم ہے۔ حیاتِ ابدی خود اپنے ارتقاء کے لیے مزاحم قوتیں پیدا کرتی ہے کیونکہ رکاوٹوں پر غالب آنے اور تسخیر کے عمل ہی سے زندگی ترقی کر سکتی ہے۔ ''جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی'' اقبال اجتہاد کو دینِ فطرت کے تسلسل کا لازمی جزو اور اِسے ایک حرکی قوت تسلیم کرتے ہیں۔ اسی لیے تصورِ زمان ومکاں سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی''۔ (۴)

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آرہی ہے دما دم صدائے کُن فیکوں

اقبال کہتے ہیں کہ کائنات بظاہر محدود نظر آتی ہے۔ لیکن اصل میں لامحدود ہے، اسی طرح

ایک انسان کو جو بظاہر محدود نظر آتا ہے، اُسے لامحدود ہونا چاہیئے۔ جب ایک مسلمان اپنی لامحدودیت کو پہچاننے گا تب اُسے اِس بات کا احساس ہوگا کہ وہ کون سی وجوہات تھیں جن کے تحت اُس کی تخلیق ہوئی۔ اِسی لیے اُسے کائنات کی مانند لحمہ بہ لحمہ حرکت میں رہتے ہوئے بڑھنا چاہیئے

بتاؤں تجھکو مسلماں کی زندگی کیا ہے ۔۔۔ یہ ہے نہایت اندیشہ وکمالِ جنوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری ۔۔۔ نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ دافسوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی ۔۔۔ یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

خدا نے انسان کے اندر بے شمار مخفی قوتیں رکھی ہیں، ایک قوت کہ جس کا خود ایک انسان کو اندازہ نہیں ہے۔ اسی لیے اقبال کے نزدیک زندگی کی اصل یہ ہے کہ انسان خاص کر مسلمان اپنے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو نہ صرف اُن کے اصل ماخذ کے ساتھ پہچان لے بلکہ اُن کو بروئے کار بھی لائے، کہ زندگی کا ارتقاء یا زندگی کی حرکت پذیری جاری رہے۔ یوں اُسے طاقت حاصل ہوتی رہے گی کہ انسان پیدا ہی کائنات مسخر کرنے کے لیے ہوا ہے۔

پروفیسر ظہیر الدین جارچوی لکھتے ہیں

''چنانچہ پروردگار عالم نے خود اپنی ہستی کے انکشاف کی خاطر، انسان کی تخلیق کی اور پھر اس کے آگے تمام مخلوق کو سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تاکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کرے اور انسان، نائب خدا کی حیثیت سے تکمیلِ کائنات کے عظیم مشن کو پورا کرے۔ تکمیل وتسخیر کائنات کا یہ مشن اس قدر عظیم ہے کہ انسان کو نہ صرف زمین پر اپنی حاکمیت کا جھنڈا گاڑنا ہے اور انسانی معاشرہ سے، جھوٹ، ظلم اور باطل کی قوتوں کو ختم کر کے نیکی، حق اور صداقت کا علم بلند کرنا ہے۔ بلکہ اسے اور جہان کی بھی خبر لانا ہے۔

زمین و آسمان و کرسی و عرش ۔۔۔ خودی کی زد میں ہے ساری خدائی''

لہٰذا اقبال کی نظر میں ساری خدائی کے اسرار ورموز کی نقاب کشائی اور کائنات کی تسخیر،

انسانی عمل و اختیار کے دائرہ میں ہے عام انسانی شعور تمام مراحل طے کرنے سے قاصر ہے، مگر وہ ہستی جس کی خودی تکمیل کی آخری حدوں کو چھولے اس پر سب مرحلے آسان ہو جاتے ہیں۔ خودی کی تکمیل کی یہ مثال صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذات مقدس میں ملتی ہے۔ مردِ مومن یا مردِ کامل کا اعلیٰ ترین تصور حضورؐ کی ذات مقدس ہے

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے　　　کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

------

(۵)

علامہ اقبال نے مفکرینِ مغرب کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا، اور اِس حقیقت کو سمجھتے رہے کہ کس طرح نہ صرف عملی زندگی کو کامیاب بنایا جاتا ہے، بلکہ اِن کا اثر انسانی زندگیوں پر کیا تبدیلی رُونما کرتا ہے۔ جدید مغربی مفکرین میں لیسنگن، ڈیکارٹ، برکلے اور کانٹ وغیرہ نمایاں ہیں۔ سب سے زیادہ اثر پذیری کانٹ کے نظریات نے کی۔ اگر ہم اقبال اور کانٹ کے مشترکہ نظریاتی فکر کی بات کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دونوں مخفی قوتوں کو مانتے اور جانتے تھے، جو انسان اپنے اندر رکھتا ہے، اور یہ مخفی قوتیں ہی انسان کی اصل ہوتی ہیں۔ علامہ نے اسی لیے انسان کو مسلسل حرکت میں رہنے کی تلقین کی ہے، تاکہ اُس کے اندر کی مخفی قوتیں ہمیشہ بیدار رہیں۔

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کردے آشکار　　　تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

اقبال نٹشے سے بھی کافی متاثر تھے۔ جو عنصر سب سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے وہ انسان کے اندر انا کا مادہ ہے، اگرچہ اس معاملے میں اِس کا زاویہ فکر جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ نٹشے کے خیال میں زندگی کا حاصل یہی ہے کہ زندگی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کیا جائے۔ چاہے اِس کے لیے انسان کو کسی بھی حد تک جانا پڑے۔ خود کو طاقت کا سرچشمہ ثابت کرنے کے لیے اپنے دل سے ہر قسم کے احساسات کو نکال دینا چاہیے۔ ہر رکاوٹ کو دور کرنے میں چاہے ضمیر کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو۔ اصل حاصلِ زندگی جسم کی طاقت ہے۔ جسم ہی ہر چیز کا منبع

ہے۔ روح کی حیثیت بھی ثانوی ہے۔ مادہ طاقت ہے، اور زندگی کی اصل رسائی مادے کی طاقت پر منحصر ہے۔

اقبال نے انسان کے اندر دو چیزوں کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ ایک اپنی قوتوں کو بروئے کار لانا، دوسرا ایک ایسی ہمدردی جو انسانیت کا پیغام لائے۔ یوں ایک مثالی انسان سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم اختر لکھتے ہیں

سوال: مثالی انسان کی جستجو کیوں؟ سوال آسان، جواب مشکل کہ یہ سوال بھی اسی سوال سے متعلق ہے کہ کیا واقعی عالمِ مثال اور مثالی انسان کے ذریعہ سے اس دنیا کو مثالی دنیا میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔؟

اقوام اور تہذیب وتمدن کی تاریخ سے یہ تلخ حقیقت عیاں ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ دراصل عقیدہ، مسلک، نظریہ، تصور سے قطع نظر ہر نوع کے انسانی معاشرہ کی اساس اعلیٰ تر اخلاق اور اس کی پیدا کردہ کرداری صفات پر استوار ہونی چاہیے اور یہی نہیں ہوتا لہٰذا معاشرہ تضاد در تضاد کی صورتِ حال کا اسیر رہتا ہے، چنانچہ جاہلوں میں دانا، کوتاہ بینوں میں بالغ نظر اور نامعقول افراد میں مردِ معقول ہی مردِ نااہل و مردِ ناداں ثابت ہوتا ہے۔ ایسے میں دوسروں کی کردار کی کجی تو کیا درست کی جائے گی اپنے کردار و عمل کی حفاظت مشکل بلکہ بعض حالات میں تو ناممکن ہوتی ہے۔ تو کیا خار بداماں معاشرہ کو گل وگلزار میں تبدیل کرنے کے بجائے اسے اسی کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ جی نہیں ایسا نہیں، اگر ایسا ہوتا تو شاید معاشرہ جنگل کی سطح پر ہی رہتا۔ رسول، پیغمبر، اولیاء، صوفیاء، معلمین اور دانش ور معاشرہ کی اخلاقی اساس اور اس کی کجی دور کرنے کے لیے ہر عہد میں آتے رہے، انہوں نے معاشرہ کی منفی اقدار کو مثبت میں تبدیل کیا اور افراد کو صراطِ مستقیم دکھائی اور یہی انسانی تاریخ کے مثالی انسان قرار پائے ہیں۔ مثالی انسان نہ ملے تو کم از کم اس کا خواب تو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کا تصور تو کیا جاسکتا ہے۔ اور جہانِ تخیل اس سے آباد تو کیا جاسکتا ہے،

اس امر کے باوجود کہ نفسیاتی لحاظ سے یہ عمل رومانی طرزِ احساس پر استوار ہے۔۔۔یوٹوپیا میں مثالی انسان دل خوش کن ہے اس لیے یہ خواب دیکھا جاتا رہا ہے۔(۶)

اقبال نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر وہ انسان جو اِس دنیا میں آیا ہے، اُسے آزاد ہونا چاہیئے، اور اِسے ایک آزادانہ ماحول میّسر ہو جس میں روحانی عنصر کا عمل دخل ہو۔نٹشے کے نزدیک عام افراد لائقِ توجہ ہی نہیں ہیں، اِس لیے کچھ ایسے خاص افراد کا ہونا ضروری ہے، جو فوق البشر ہوں۔اقبال اور نٹشے دونوں نے افلاطون کو پسند نہیں کیا، اور اِسے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔نٹشے نے جو ایک کائنات قائم کی ہے، اُس کائنات میں رُوح کا فقدان ہے۔نٹشے اگرچہ انسانی معراج کو سمجھ پایا، لیکن اِس صورت میں کہ اُس کا دل ''مومن'' اور دماغ ''کافر'' ہوگیا۔یوں اس طرح وہ انسان کو اُس بلندیوں تک لے گیا، جہاں خدا کی ذات سے انکاری ہوگیا۔اب اس مرحلے پر انسان کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ تمام خوددارانہ قوتوں کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لے، اور مذہب کو اپنے پاس پھٹکنے ہی نہ دے۔

اقبال نٹشے کے متعلق کہتے ہیں

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم　　نگاہ چاہیئے اسرارِ لَا اِلٰہ کے لیے
خدنگِ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند　　کمند اس کا تخیل ہے مہروماہ کے لیے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی!　　ترس رہی ہے مگر لذّتِ گنہ کے لیے
(۷)

علامہ اقبال کو مثنوی مولانا رومیؒ سے اِس حد تک محبت تھی کہ وہ اِسے ایک غیر فانی عشق کا درجہ دیتے تھے۔اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ اس مثنوی میں جو بنیادی عنصر سب سے نمایاں ہے وہ عشق کا عنصر ہے۔جبکہ اقبال کی نظر میں بھی انسانی زندگی میں عشق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔مولانا رومؒ کے نزدیک انسانی فِکر کو ذکر کے تابع ہونا چاہیے۔ورنہ ایسا شخص زندگی کی اصل حقیقت کے کبھی قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔علامہ اقبال کے نزدیک بھی عقل کو عشق کے تابع ہونا

چاہیے۔ ورنہ عقل مادیت کی شکل اختیار کر لے گی۔ عشق ایک ایسا عنصر ہے جس کی بدولت لامحدودیت، محدودیت میں اور ارض وسما ایک مرکز میں سما جاتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عشق ہی انسان کو حقائق جاننے کی دعوت دیتا ہے۔ اقبال نے تصوف میں عشق کی روح کو پھونک کر ایک مخصوص نقطۂ نظر دیا کہ جس کی بدولت انسانی سوچ شاہین کی طرح بلندیوں پر، پرواز کرنے لگی۔ اقبال نے حافظ پر تنقید کی کیونکہ اِن کے خیال میں حافظؔ کی شاعری نے مسلمانوں کو زوال کی راہ دکھائی ہے۔ لیکن ایک بات غور طلب ہے وہ یہ کہ اقبال اور حافظ کا زمانہ الگ الگ ہے۔ اِسی طرح مسائل بھی الگ الگ ہیں، یوں ماحول اور معاشرہ بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ زمانے کا فرق انسانی فکر کی تبدیلی کا باعث ہوتا ہے۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے شاید ہم اقبال کی فکر کو جدا رکھتے ہوئے حافظؔ کی مخالفت نہ کریں

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ ہے اس کی نہاد کافرانہ
جوہر میں ہو لاالہٰ تو کیا خوف تعلیم ہو گو فرنگیانہ

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اِس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی
روشن اس سے خرد کی آنکھیں بے سرمۂ بوعلی و رازی
یہ فقر غیور جس نے پایا بے تیغ وسناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری اللہ سے مانگ یہ فقیری
(۸)

دین فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی طلب کی آگ میں جلتا رہے۔ اور عشق کی ابتداء وانتہا یہ ہے کہ ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے ۔۔۔۔ فقر کے معنی ہیں دنیا سے دل کو الگ رکھنا یا ہمہ و بے ہمہ رہنا، دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا۔ نعمت وفراوانی کے اسباب جو انسان کو اندھا بنا دیتے ہیں۔ اس کے دل میں سوز نہیں رہتا۔ وہ علائق دنیوی میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ پھر اس کو اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔

اس لیے اقبال نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ مراتب دنیوی پر کیوں نہ پہنچ جائیں۔ لیکن دل درویش رہنا چاہیے۔ آدمی وہی ہے جو دولتِ دنیا حاصل کر کے مست نہ ہو جائے جو ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیٔ شوق رکھے نہ کہ مال و دولت قارون و فکر افلاطوں ایک نوجواں میں ادب و آدمیت ہونا چاہیے۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی   ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ   خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
(۹)

حوالہ جات

۱ فکرِ اقبال ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، ۱۹۶۴ء ، ص ۱

۲ فکرِ اقبال ، ساتواں باب ، مغربی تہذیب وتمدن پر علامہ اقبال کی تنقید ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ،۱۹۶۴ء ، ص ۱۹۴

۳ پیغام آشنا ، اقبال کا فلسفۂ موت اور بقائے روح ، عابد حسین قریشی ، فروری ۲۰۰۴ء ، ص ۱۰۷

۴ دریافت ۔ر۔ تصورِ زمان ومکاں اور اقبال ، ڈاکٹر رشید امجد ، ص ۴۲۱ ، ۴۲۲ ، ۴۲۳ ۔

۵ المماس ۔۔ اقبال کا تصورِ خودی ، پروفیسر ظہیر الحسن جارچوی ، نومبر ۲۰۰۰ء ص ، ۴۸

۶ المماس ، اقبال نمبر ، اقبال کا مثالی انسان: نفسیاتی تناظر ، ڈاکٹر سلیم اختر ، اکتوبر ۲۰۰۲ء ، ص ، ۸۶ ۔ ۸۷ ۔

۷ کلیاتِ اقبال اُردو ، ضربِ کلیم ، علامہ اقبال ص ، ۷۲

۸ کلیاتِ اقبال اُردو ، ضربِ کلیم ، علامہ اقبال ص ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۶

۹ الاقرباء اسلام آباد ، اقبال اور نوجوان ، سیدہ نغمہ زیدی ، جولائی ۔ ستمبر ۲۰۰۵ء ، ص ، ۵۷ ، ۵۸

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طُوق اَر (استنبول۔ ترکی)

ترکی کے صوفی شعراء کے کلام میں پیغامِ محبت واخوت، اظہارِ اتحاد و یکجہتی

(یونس ایمرےؒ سے عزیز محمود ہدائیؒ تک)

تاریخ گواہ ہے کہ تصوف نے اسلام کی روشنی کو دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلا کر اُس کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور کر بھی رہا ہے۔ نہ صرف برصغیر پاک و ہند اور افریقہ کے دُور افتادہ علاقے بلکہ یورپ میں روس اور سپین تک صوفیائے کرام جہاں بھی گئے وہاں اسلام کے مسکراتے ہوئے چہرے کو ساتھ لے گئے اور جہاں وہ پہنچے وہاں انھوں نے اشاعتِ اسلام کے لیے دن رات محنت کی اور اگر غیر مذہب کے لوگوں کو مسلمان بنانے میں وہ کامیاب ہو سکے تو پھر بھی اُن لوگوں کے دلوں کو اسلام کی محبت سے ہمکنار کرنے میں مصروف رہے اور انھوں نے مسلم یا غیر مسلم سب کو اتحاد و اخوت کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کی تعلیم بھی دی۔ اسی لیے اگر یوں کہا جائے کہ تصوف نے مذاہب اور اعتقادات کے حامیوں کے دلوں میں نرمی پیدا کر کے انھیں اسلام کی محکم اور خوبصورت عمارت سے منسلک کرنے میں سیمنٹ کا کام کیا تو یہ کوئی مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی۔

ترکی کے صوفی بھی دنیا کے مختلف ملکوں کے صوفیائے کرام کی طرح اپنے خطے میں یعنی اشیائے کوچک، اناطولیہ سے لے کر یورپ کے دل آسٹریا تک، اسلام کا پیغام بہت کامیابی سے لے گئے۔ اُن کا پیام تھا ''اسلام'' اور اُن کی راہ تھی ''محبت و اُخوت'' صوفیائے کرام کی اس کامیابی کا راز، اُن کا بلاتمیز دین و مذہب بنی نوعِ آدم کو ایک ہی ترازو میں تولنا تھا۔ اس ترازو کا نام تھا ''انسانیت'' اور اس ترازو کے پلڑے میں موجود تھے ''اتحاد و یکجہتی'' کے بٹے! بندگانِ خدا ایک ہی باپ اور ماں کی اولاد تھے اور ان میں چپقلش، کشاکش اور نفرت کا نام تک نہیں ہونا چاہیے تھا۔

جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ خلیفۃ المومنین حضرت عمرؓ (متوفی ۶۴۴ء) کے عہد میں جب لشکرِ عرب ایران پر اسلامی پرچم لہرا کر ماوراالنہر کے کنارے تک یعنی ترکوں کے اصل وطن کی سرحدوں تک پہنچا تو ان کی مڈبھیر پہلی مرتبہ ترکوں سے ہوئی۔ پھر عباسیوں کے عہد تک عرب فوجوں کی ترکستان کی جانب پیش قدمی کرنے کی کوششوں کی وجہ سے ترکوں اور عربوں کے درمیان کشمکش اور جنگ کی حالت جاری رہی لیکن جب چین کے حکمران کے حکم پر بڑی تعداد میں چینی فوج مغرب کی جانب بڑھنے لگی تو اسے روکنے کے لیے عرب اور تُرک اتحاد کرنے پر مجبور ہوئے اور اس اتحاد کے نتیجے میں ذوالحج ۱۳۴ مطابق جولائی ۷۵۱ء میں دریائے تالاس کے قریب میدان میں چینی فوج کو شکست دی گئی اور اس کے بعد ترکوں اور عربوں کے مابین امن وامان کا دَور شروع ہوا اور دوستانہ تعلقات اور تجارتی روابط مستحکم ہوئے (۱) اسی طرح ترکوں کو اسلام کو نزدیک سے پہچان کر سمجھنے کی فرصت ملی پھر مسلم صوفی درویش جو ترکوں کے علاقوں کے طول وعرض میں گشت کر رہے تھے اُنھوں نے بھی ترکوں میں اسلام کا تعاف کرایا۔
جب ترکوں نے اسلام کو پہچانا تو اُسے اپنے نزدیک پایا کیونکہ اُس زمانے کے ترکوں کی اکثریت کا مذہب "Shamansim" تھا جس میں واحد رب ''گوک تینگری'' یعنی ''آسمانی خدا'' تھا جو ہر ذی روح کے پیچھے اصل قوت تھا، وہی سورج کو نکالتا تھا پودوں کو اگاتا تھا، انسان کو پیدا کر کے مارتا تھا اور سزا بھی دیتا تھا اور معاف بھی کرتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں خود حق تھا اور انسان کی دعائیں سنتا تھا اور عمر بڑھا دیتا تھا اور انسان کے مویشیوں اور املاک میں اضافہ کرتا تھا۔ وہ ہر جگہ موجود تھا اور اس کی بالادستی سے کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔ انسان فانی تھا اور آسمانی خدا لافانی تھا۔ (۲) یعنی ترکوں کے ذہنوں میں جو خدا کا تصور موجود تھا اور جو اُن کے اخلاقی اقدار تھے وہ اسلام کے مشابہ تھے اور پھر جو ان کے قدیم مذہب میں خامیاں تھیں وہ اسلام میں پوری ہو رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترک اپنی ہزاروں برسوں کی تاریخ میں پہلی بار بغیر کس زبردستی یا مجبوری کے ازخود، جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہوئے اور بالخصوص قرہ خانی سلطنت کے حکمران

سلقوق بوغرا خان کا دینِ مبین اسلام کو قبول کر لینے کے بعد ان کے ملک کے تمام باشندوں کے قبولِ اسلام کے نتیجہ میں اسلام ترکوں میں ایسی تیزی سے پھیل گیا کہ ترک اور اسلام ایک دوسرے کے جزو لاینفک اور اسلام ترک قوم کی شناخت بن کر رہا۔ (۲)

جیسا کہ ہم نے کہا ترکوں کے مشرف بہ اسلام ہونے میں اُن کے عربوں کے ساتھ دوستی اور تجارتی تعلقات کی طرح بلکہ اُس سے بھی زیادہ اہم کردار صوفی بزرگوں اور درویشوں کا تھا جنھوں نے ترکی علاقوں کے کونے کونے تک جا کر ترکوں میں اسلام کا تعارف کرایا اور چونکہ صوفیائے کرام اسلام کے ہنستے ہوئے اور مشفق چہرہ کو ہمراہ لے کر غیر اسلامی علاقوں میں جا رہے تھے لہٰذا اُن کا پرچار کیا ہوا اسلام دوسرے مذاہب کے تابعوں کو زیادہ پُرکشش لگ رہا تھا اور انھیں اسلام کی جانب مرغوب کر رہا تھا۔ خاص طور پر ترکستان میں ترکوں کے معنوی بزرگ احمد یسویؒ (متوفی ۱۱۶۶ء) کی، جو ترکوں کے سلسلہ ہائے طریقت کے منبع اور بانی مانے جاتے ہیں، شب و روز کی کوششوں نے قزاقستان سے لے کر ازبکستان تک کے ملکوں میں یعنی اُس عہد کے ترکستان میں اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ (۴)

ترکی تصوف کے بانی سمجھے جانے کی وجہ سے اور ترک متصوفوں میں عشقِ خدا اور انسان دوستی کے خیالات کے ترکی زبان میں بیان کرنے والے اولین بڑے شاعر ہونے کے سبب یہاں اِن عظیم ہستی کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتے چلیں۔ احمد یسویؒ ترکستان کے یسی نامی قصبہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد ابراہیم شیخ سے حاصل کی۔ اُن کی عمر سات سال کے لگ بھگ تھی کہ اُن کے والد کا انتقال ہوا اور وہ اُسی علاقے کے مشہور صوفی ارسلان باباؒ کے شاگرد بنے۔ ارسلان باباؒ کی وفات کے بعد احمد یسویؒ اپنے مرشد کے دیئے ہوئے مشورہ کے مطابق ترکستان کے معروف علمی اور مذہبی مرکز بخارا تشریف لے گئے۔ بخارا میں معروف صوفی یوسف ہمدانیؒ (متوفی ۱۱۴۰ء) کے بھی شاگرد اور مرید بنے اور انھوں نے اپنے استاد اور مرشد کے ساتھ ''ترکستان کے مختلف شہروں کا دورہ بھی کیا۔ اُن کے انتقال کے بعد

اُن کی درگاہ کے سجادہ نشین بھی بنے۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنی جائے پیدائش یسی واپس گئے اور تادم مرگ اپنی درگاہ میں ترکستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مریدوں کو زہد و تقویٰ، ایمان و اِخلاص کے اقدار سے آراستہ کر کے انھیں دور دراز علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجتے رہے (۵) احمد یسوی کی خاصیت یہ تھی کہ وہ عربی اور فارسی پر مکمل دسترس رکھنے کے باوجود پھر بھی اپنی تبلیغ آسان ترکی میں اور شاعرانہ انداز میں ساز کے ساتھ کرتے تھے اور اُن کے اس انداز کے خانہ بدوش عام ترکوں پر سحر انگیز اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اسی انداز کے جادو میں آ کر ہزاروں ترک اور تاجیک مسلمان بنے اور تبلیغ اسلام کے لیے مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں آسٹریا تک پھیل گئے۔

ترکوں میں اسلام زیادہ تر احمد یسویؒ کی مانند صوفیائے کرام کے توسط سے پھیل رہا تھا اور اس صوفیانہ اسلام میں ہر چند دنیاوی اور انسانی تعلقات میں اپنے پرانے قومی رسوم و عادات کو بھی مدنظر رکھا جاتا تھا مگر درحقیقت قرآنی شریعت اور حدیث نبویؐ بنیاد تھے۔ اس طرح قرہ خانی خاندان نے اسلام قبول کر لیا تو انھوں نے شراب پینے تک کی عادات اور رسوماتِ بادشاہی کو ختم کر دیا اور سنی، حنفی مسلک کے قائل ہو گئے اور ہر کام میں قرآن اور حدیث کے پابند رہے۔ وہ اسلام کے مُبلغ علماء، مشائخ اور بالخصوص صوفیائے کرام اور اہل طریقت کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اُن کی مانند اُن کے بعد کے ترک سلاطین بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلے۔ غزنوی اور سلجوقی سلطنت میں بھی اسلام کی تبلیغ کرنیوالے صوفیوں کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ سلجوقی خاندان کے حکمران کسی بھی موضوع پر فیصلہ کرتے ہوئے علمائے دین اور صوفیائے کرام سے مشورہ لیتے تھے اور اُن کی تجاویز کو مدنظر رکھتے تھے (۶) کیونکہ اُن کی نظر میں تصوف کا مقصد عشقِ حقیقی کی آتشِ پنہاں سے گزر کر فنا فی اللہ کے مرتبہ تک پہنچنا اور رضائے الٰہی کے لیے مخلوقاتِ خدا کی خدمت کرنا تھا۔ اُن کے ذہنوں میں موجود تصوف کا تصور بالکل یہ تھا جسے ایک ترک شاعر معشوقی ابراہیم

نے اپنی نظم ''تصوف'' ☆ میں یوں بیان کیا تھا۔(۷)

ہدایت میں صوفی کا بے جان ہونا ہے تصوف	نہایت میں تختِ دل پر سلطان ہونا ہے تصوف
طریقت میں تصوف صورت مٹانے سے ہے عبارت	حقیقت میں سرائے سر کا مہمان ہونا ہے تصوف
اس آب و گل کے کپڑے سے پاک ہونا ہے تصوف	ہمہ تن و جان نورِ حق سے پُر نور ہونا ہے تصوف
تصوف انوارِ مطلق کی شعاؤں کی خبر پہچانا ہے	آتشِ عشق سے جلنے کا نام ہے تصوف
تصوف میں شرط ہے ہستی کی تحریر کو ختم کرنا	اہلِ شریعت و اہلِ ایمان ہونا ہے تصوف
تصوف میں اللہ کے اطوار کو قریب سے جاننا ہے لازمی	تمام اہلِ درد کے لیے درمان ہونا ہے تصوف
تصوف طلسمِ تن کو بسم اللہ کی چابی سے کھولنا	اس عمارت کو پھر سراپا ویران کرنا ہے تصوف
تصوف خانۂ دل سے ماسواء اللہ کو مٹا دینا ہے	مومن کے دل کا عرشِ رحمان ہونے کا نام ہے تصوف
تصوف ہر سانس میں مشرق و مغرب تک پہنچنا ہے	ان تمام اہلِ دنیا کا نگہبان ہونا ہے تصوف
تصوف بہتر (۷۲) ☆ اقوام کی زبانیں سمجھنا ہے	عقل کے جہان پر سلیمان بننا ہے تصوف
کون و مکاں پر اسمِ اعظم سے حاوی ہونا ہے	سب احکامِ قرآنی کو دل سے جاننا ہے تصوف
درحقیقت تصوف بندہ ہونا ہے اے ابراہم	شریعت احمدی کا دل میں برہان ہونا ہے تصوف

تصوف کو اسلام کی ایک حسین تشریح سمجھتے ہوئے اُسے اپنے سینوں سے لگا کر جب ترک مغرب کی طرف بڑھ کر ایشیائے کوچک، اناطولیہ میں اور پھر یورپ کی طرف پہنچے تو اسلام کے اس ہنستے ہوئے چہرے کو بھی ہمراہ لے گئے اور وہ یہاں آ کر دوسری مسلمان قوموں کے صوفیاء کے

☆ اس نظم کے ترجمہ کی ہیئت اگرچہ شعری انداز رکھتی ہے لیکن بحر و قافیہ کا اہتمام نہ ہونے کے باعث اِسے نثری ترجمہ ہی سمجھنا ہوگا۔(ادارہ)

☆ اقوام سے مُراد یہاں فرقے ہیں۔(ادارہ)

نوٹ: مقالہ ہذا میں آگے بھی اشعار کی یہی ہیت استعمال کی گئی ہے اور 'فرقے' کی بجائے 'اقوام' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قارئین کرام ادارے کی مندرجہ بالا صراحت کو ذہن میں رکھیں

خیالات و تصورات سے بھی متعارف ہوئے اور انھوں نے کبھی بہاء الدین ولدؒ (متوفی ۱۲۲۸ء) کبھی برہان الدین محققؒ (متوفی ۱۲۴۰ء) کبھی محی الدین عربیؒ (متوفی ۱۲۴۰ء) اور کبھی مولانا جلال الدین رومیؒ (متوفی ۱۲۷۳ء) کے زیر اثر اسلامی تصوف کی نئی نئی جہتیں پیدا کر لیں۔(۸)
یہ صوفی درویش کبھی ترک افواج کے آگے آگے کبھی اُن کے ساتھ ساتھ اور کبھی اُن کے بعد مغرب کی طرف بڑھتے رہے اور جہاں بھی گئے تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ وہ تبلیغ اسلام تو کرتے تھے لیکن ان کے اسلام کو پھیلانے میں نہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو تلوار کے ذریعے فتح کر کے قبولِ اسلام پر مجبور کرنے کا حربہ تھا نہ ہی عیسائی مشنریوں کی طرح دیگر اقوام اور مذاہب کو اپنے سے ذلیل مخلوقات سمجھنے کا وطیرہ تھا۔ اُن کے لیے نہ صرف تمام بنی نوع آدم بلکہ تمام مخلوقاتِ جہاں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ تھیں اور وہ اُن سب سے اسی لیے پیار کرتے تھے کہ وہ خود اللہ ذی شان سے محبت کرتے تھے۔ اسی لیے اُنھوں نے نہ صرف عام لوگوں کے بلکہ بادشاہ امرا و سردار سب کے دِلوں کو موہ لیا اور جس طرح قرہ خانی اور سلجوقی عہد میں دستور تھا اسی طرح ایشائے کوچک کے سلجوقی حکمران نے اور پھر عثمانی سلطنت کے بادشاہوں نے بھی صوفی بزرگوں کا بے حد احترام کیا اور مزید برآں ان متصوفوں نے بلقان اور ہانگری تک کے علاقوں میں عیسائی لوگوں کے دِلوں میں بھی جگہ بنالی۔

عثمانی عہد میں عثمانی سلطنت کے قیام سے لے کر جمہوریت کے قیام تک تصوف کا بڑا اثر و رسوخ رہا اور قادریہ، یسویہ، نقشبندیہ، خلوتیہ، روشینہ، جمالیہ، شمسیہ، رفاعیہ، مولویہ، بیرامیہ، گلشیہ (۹) اور بکتاشیہ جیسے طریقت ہائے صوفیاء عثمانی مملکت کے طول وعرض میں موجود تھے اور عثمانی سلاطین خود خلافت کے مقام پر فائز ہونے کے باوجود صوفیائے کرام کی بہت ہی عزت کرتے تھے اور خود بھی اہلِ طریقت ہوتے تھے۔ خود عثمانی سلطنت کے قائم ہونے میں طریقتِ اخیہ (اخیہ) کا بڑا ہاتھ تھا اور عثمانی سلطنت کے بانی عثمان غازی کی بیگم طریقت اخیہ کے شیخ ادہ وبالیؒ (متوفی ۱۳۲۶ء) کی صاحبزادی تھیں یعنی عثمانی سلطنت کی نسل ایک صوفی خاندان کی

صاحبزادی سے چل نکلی۔ عثمان بیگ (متوفی ۱۳۲۶ء) اور خان بیگ (متوفی ۱۳۶۲ء) مجلسوں میں علمائے دین اور صوفیائے کرام کی اہم جگہ تھی۔ مراد اوّل (متوفی ۱۳۸۹ء) جنگ پر جاتے ہوئے مشائخ اور صوفیوں کا جمِ غفیر ہمراہ لے کر جاتے تھے۔ یلدرم بایزید (متوفی ۱۴۰۳ء) کو یہ یقین تھا کہ وہ اپنے داماد معروف زمانہ صوفی امیر سلطانؒ (متوفی ۱۴۳۰ء) کی دعاؤں کی کرامت سے فتح یاب ہوتے تھے اور عثمانی سلطنت کے عہدِ زریں میں جہاد پر جانے سے قبل عثمانی بادشاہ اولیاء اللہ کے مزاروں پر جاتے اور صوفی بزرگ اور مشائخ کی دعائیں حاصل کرتے تھے۔ معروف عثمانی ادیب اور شاعر عاشق پاشازادہ (متوفی ۱۴۸۱ء) اس امر کو یوں بیان کرتے ہیں۔

اور دعائیں لیں تمام اولیاء اللہ کی اس نے
کیونکہ اورخان دعا طلب کرتا تھا سب اولیاء سے
دعا لینا (بزرگوں سے) آلِ عثمان پرورشہ ہے
وہ فارغ ہیں مخلوقات کی اس دنیا سے (۱۰)

جس طرح عثمانی بادشاہ اولیاء اللہ اور صوفی بزرگوں سے دعائیں حاصل کرنے کو اپنی کامیابی اور فتح یابی کا ذریعہ سمجھتے تھے بالکل اسی طرح وہ کسی ولی اللہ کا بندہ ہونے کو اپنے لیے عزت کا باعث جانتے تھے اور اسے مختلف موقعوں پر ظاہر کرتے تھے۔ اس سلسلے میں یاوز سلطان سلیم (متوفی ۱۵۲۰ء) اپنے ایک شعر میں رقم طراز ہیں:

معلوم ہوا ایک خشک لڑائی ہے بادشاہ عالم بننا　　　دراصل سب کچھ سے بہتر ہے ایک ولی کا بندہ بننا

یاوز سلطان سلیم کی مانند قانونی سلطان سلیمان (متوفی ۱۵۶۶ء) بھی فرماتے ہیں:

اگرچہ ظاہر میں برّ و بحر کا شاہ ہوں میں
دراصل اک عظیم درگاہ کا غبارِ راہ ہوں میں (۱۱)

سلطان محمد فاتح (متوفی ۱۴۸۱ء) نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ (استنبول) کو اپنے استاد صوفی بزرگ آق شمس الدین (متوفی ۱۴۵۹ء) کے مشورے اور معنوی امداد کے ذریعے فتح کیا تھا اور شہر میں اپنے استاد کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ (۱۲) اور سلطان احمد اوّل (متوفی ۱۶۱۷ء) عزیز محمود ہدائی کے وضو کرنے کے لیے پانی خود گراتے تھے اور اُن کی والدہ سلطان عزیز محمود ہدائی کے لیے ہاتھ میں تولیہ پکڑے اُن کے وضو کے ختم ہونے کا انتظار کرتی تھیں۔ (۱۳)

یہ کیا راز تھا جس نے ترکوں کے مشرف بہ اسلام ہونے سے لے کر عثمانی خاندان کے خاتمہ تک تصوف کو بادشاہوں سے لے کر غریب فقراء تک سب لوگوں کا مرجع اور مدوّن اور صوفیائے کرام کو سب کے لیے محترم اور معزز بنایا تھا؟

اس سوال کے متعدد جواب مل سکتے ہیں لیکن ان جوابوں میں سب سے اہم یقیناً یہ ہوگا کہ عشقِ خدا کی وجہ سے محبتِ مخلوقاتِ خدا اور محبت مخلوقاتِ خدا کی وجہ سے اتحاد و یکجہتی اور احترامِ آدمی!

جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا (۱۴)

آدمیت احترامِ آدمی　　　　باخبر شو از مقامِ آدمی

آدمیت یا بہ الفاظ دیگر انسانیت بلا تفریق رنگ و نسل اور دین و مذہب تمام نوع بشر کا ایک دوسرے کا احترام کرنے سے ظہور پذیر ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم علیہ السلام کو اشرف المخلوقات بنا کر ایک ایسے بلند مقام پر فائز کیا ہے جس کا پاس رکھنا ہر ذی شعور اور باعقل ہستی کے لئے لازم ہے۔

اب جب کہ آدمیت، احترامِ آدمی کی وجہ سے ظہور پذیر ہو جاتی ہے اور تصوف بھی عشقِ خدا اور محبت خلقِ خدا کی بنیاد پر قائم ہے تو زمانی سیاق و سباق کے تسلسل کو نظر انداز کرتے ہوئے جب ہم موضوع کو پرکھنے لگتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ تصوف کے Systematic Web کے ہر تار میں اس ''محبتِ آدمی'' کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ تصوف کے پہلے دن سے لے کر آج

تک اسلامی سلسلہ ہائے طریقت پر سرسری ہی سہی، اگر نظر ڈالتے ہیں تو اسی حقیقت کو اپنے سامنے پاتے ہیں۔ یہ چاہے ہندوستان میں طریقتِ چشتیہ میں ہو چاہے ترکستان میں طریقت بسویہ میں یا چاہے ترکی میں طریقتِ بیرامیہ میں ! چاہے نازک دل صوفی شعراء کے کلام میں ہو، چاہے تصوف کی نظریاتی کتابوں میں اور چاہے پڑھے لکھے، صاحبانِ علم و دانش مشائخ کے دلوں میں ہو اور چاہے گلی گلی پھرنے والے ان پڑھ درویشوں کی زبان میں، حقیقی اور اسلامی تصوف کے سنہرے جال کے ہر تار میں محبت کے عمدہ نقوش چمکتے نظر آتے ہیں۔ زمین و آسمان میں ''محبت! محبت'' بس ''محبت''

مثال کے طور پر معروف ترک عالم اور صوفی بزرگ عزیز محمود ہدائیؒ کو لیجیے وہ اپنی تصنیف میں اپنے تلامذہ اور مریدان کو راہِ تصوف و حقیقت کی تعلیم دیتے ہوئے ''اُخوانِ طریقت اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سالک کے تعلقات'' کے عنوان سے معنون باب میں فرماتے ہیں۔

۱۔ اہلِ طریقت کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو اللہ کی خاطر اپنے حقیقی بہن بھائی کی حیثیت سے جانے اور محض اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرے اور اگر کسی سے بغض و نفرت کرنی ہو تو اپنی ذات کی خاطر نہیں صرف اللہ کی خاطر بغض کرے۔

۲۔ سالک کو چاہیے کہ وہ جو بھی سنے اُسے جا کر کسی اور کو نہ بتائے

۳۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کا خیال ایسے رکھے جیسے وہ اپنی نفس اور ذات کا خیال رکھتا ہے۔ کیونکہ حدیث نبویؐ ہے کہ ''اگر تم لوگوں میں سے کوئی ایک اپنے برادرِ دین کے لیے بالکل وہ نہ چاہے جو وہ خود اپنی ذات اور نفس کی خاطر مانگتا ہو تو وہ کامل مومن نہیں بن سکتا۔''

۴ سالک کو چاہیے کہ وہ کسی کے بارے میں بھی سوئے ظن نہ کرے اور اُس پر تحقیر کی نگاہ نہ ڈالے۔ کیونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ اے ایمان والو تہمتیں کرنے سے بچتے رہو، بغض، تہمت گناہ ہے اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا بھلا نہ کہو۔ کیا تمھیں اچھا لگتا کہ اپنے مردے بھائی کا گوشت کھاؤ؟'' (سورۃ الحجرات، سپارہ ۲۶، آیت ۱۲)

۵۔ سالک کو چاہیے کہ وہ فراخ دل اور اہلِ بذل و عطا ہو اور کبھی بھی اپنے بھائی کو کچھ نہ کچھ عطا کرنے میں کمی نہ کرے۔

۶۔ سالک کو چاہیے کہ راستے پر چلتے وقت اگر اُس سے کچھ زمین پر گر جائے تو وہ جھک کر اُسے نہ اُٹھائے اور زمین پر گری ہوئی چیز کو کسی ضرورت مند کے لینے کے لیے وہیں رہنے دے۔

۷ سالک کو چاہیے کہ اگر کوئی ضرورت مند اُس سے اُدھار مانگے تو وہ اُس ضرورت مند کو اُدھار اُسی شرط پر دے کہ وہ ادھار واپس نہ کیا جائے۔ اگر قرضدار ضد کر کے اپنے لیے ہوئے ادھار کو واپس کرے تو سالک اُس رقم کو کسی غریب کے حوالے کر دے۔

۸۔ سالک کو چاہیے کہ انکسارِ نفس اور خاکساری سے کام لے کیونکہ درویش کو یہ زیب دیتا ہے۔

۹۔ سالک کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ انصاف اور مساوات کا برتاؤ اپنا لے اور ضرورت کے مطابق سب کا احترام کرے۔

۱۰ درویش کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو غیبت اور بدگوئی سے تھام لے۔ یہاں تک کہ اس سے اپنے ہمسایہ کے بارے میں بھی کچھ پوچھا جائے تو وہ سنی ان سنی کر کے اپنے ہمسایہ کو بُرا بھلا نہ کہے۔

۱۱۔ مرید کو چاہیے کہ وہ کام جو وہ خود کر سکتا ہے اُسے کسی اور کے حوالے نہ کرے اور لوگوں پر بوجھ بننے سے گریز کرے۔

۱۲۔ سالک کو چاہیے کہ اپنے اخوان طریقت اور دوسرے لوگوں کو اجازت نہ دے کہ وہ اُسے اولیت دیں اور اُس کی تعظیم اور اُس کا احترام کریں کیونکہ یہ سالک کی راہ میں سب سے زیادہ خطرناک جال ہے۔

۱۳۔ مرید کو چاہیے کہ جب تک وہ اپنے نفس کی اصلاح و تربیت نہ کرے تب تک دوسروں کے کاموں میں مداخلت کرنے کی جسارت نہ کرے۔ کیونکہ اپنے نفس امارہ کی اصلاح کیئے بغیر دوسروں کے کاموں میں مداخلت کرنا وراپنی ''بھلائی'' کا ثبوت دینے کی غرض سے دوسروں کی راہنمائی کرنے کی کوشش کرنا ایسے ہے جیسے نافلہ کے لیے فرض عبادت ترک کی جائے۔

۱۴۔ چونکہ سالک اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں دیتا ہے لہٰذا اُسے چاہیے کہ وہ کوئی مادّی چیز اپنے پاس رکھے بغیر یا اپنی ملکیت میں رکھے بغیر صبح تک سوئے۔ وہ یہ کوشش کرے کہ جو بھی اس کی ملکیت میں ہو اُسے لوگوں میں تقسیم کرے۔

۱۵۔ سالک کو چاہیے کہ جس امانت کی حفاظت اُس سے ممکن نہ ہو وہ اُس امانت کو ہرگز نہ لے کیونکہ امانت کی حفاظت نہ کرنا سب سے بُری خاصیت ہے۔ ہاں اگر یہ امانت معنوی امانت ہو تو اس کی ذمہ داریاں اور زیادہ سنگین اور اہم ہیں۔ (۱۵)

عزیز محمود ہدائی کی طرح بیغیت باشی ولی احمد شمس الدین مرمرویؒ (متوفی ۱۵۰۴ء) بھی اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ:

''اخوانِ طریقت کے لیے فرض عین کی طرح لازمی ہے کہ وہ قطعاً ایک دوسرے کے نقائص اور غلطیوں کو فاش نہ کریں۔ (اگر اپنے برادر طریقت کی) غلطی کو دیکھیں تو ایک مرتبہ چشم پوشی کریں دوسری مرتبہ اگر دیکھیں تو اکیلے میں جا کر اُسے بتائیں۔''

اور سب اخوانِ طریقت ایک دوسرے سے ایسے محبت کریں جیسے وہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور حد المقدور ایک دوسرے کی خدمت بجالائیں۔ اگر ایک دوسرے کے خلاف کوئی غلطی صادر ہو تو جو بے قصور ہے وہ باقصور کے پاس جا کر معافی مانگے اور کہے ''اگر مَیں موجود نہ ہوتا تو آپ سے یہ غلطی ظہور پذیر نہ ہوتی۔ میری موجودگی ہے جو آپ کی اس غلطی کا سبب بنی۔'' اور وہ جو باقصور ہے وہ بے قصور سے جواباً یہ کہے کہ ''اسی طرح عاجزی اور خاکساری سے کام لینے والے جو ہیں حقیقی درویش بن سکتے ہیں۔'' (اور وہ اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہے) ''تجھے کیا ہوا اے ظالم نفس'' اور پھر اپنے دن ندامت توبہ اور حیا کر کے بسر کرے اور اسی ذریعے سے رحمت الٰہی کا مستحق بنے۔'' (۱۶)

جس طرح عزیز محمود ہدائی'' اور احمد شمس الدین مرمروی'' کی اوپر منقول تعلیمات سے بھی معلوم ہوتا ہے صوفی درویش یا بہ الفاظ دیگر ''سالک راہ حقیقت'' کو اسلامی تعلیمات اور شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ہستی اور دنیاوی خواہشات کو ترک کر کے دوسروں کی خدمت کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے۔

چونکہ اس کاوش کا موضوع ترکی صوفی اور ترکی تصوفی شاعری میں محبت، انسان دوستی، یکجہتی اور بقائے باہمی ہے لہٰذا یہاں صرف ترک صوفیائے کرام کے کلام، مناقب اور تعلیمات کے حوالے دیئے جائیں گے ورنہ صوفی جہاں بھی رہے کم وبیش ایک جیسے ہی خیالات اور اعتقادات کا پابند رہے خواہ وہ ہندوستان کے ہوں خواہ ترکی کے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ صوفیوں کی کتابوں میں موجود برادری اور دوستی کی یہ باتیں محض نظریاتی نہیں ہیں۔ اُن کے اقوال اور افعال ہم آہنگ ہیں اور اُن کی عمر کی ہر منزل میں قول اور فعل کی اس ہم آہنگی کو دیکھنا ممکن ہے۔ مثلاً مشہور صوفی بزرگ اور طریقت بیرامیہ کے بانی حاجی بیرام ولی (متوفی ۱۴۳۰ء) کو لیجئے اُن کی عادت یہ تھی کہ وہ امیروں سے صدقہ جمع کر کے غریب اور محتاجوں میں تقسیم کرتے تھے۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں چندہ جمع کرنے کا یہ

کارِ خیر بہ نفسِ نفیس وہ بھی کرتے تھے اور اپنے درویشوں سے بھی کرواتے تھے۔ اس میں اُن کا مقصد یہ تھا کہ ایک جانب درویشوں کے دلوں میں کبر و تکبّر اور نفسانی برتری اور خودنمائی کے احساسات مٹ جائیں اور یوں اُن کی تعلیم و تربیت میں اور اُن کے کمال میں اضافہ ہو جائے اور دوسری جانب غرباء اور ضرورت مندوں کی مشکلات کو دور کیا جائے۔ (۱۷)

اسی طرح عزیز محمود ہدائیؒ نے پہلے اونچے مقام پر فائز ایک دولت مند قاضی ہونے کے باوجود راہِ طریقت سے انتساب کے بعد رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کے لیے اپنے تمام مال و مِلک کو ضرورت مندوں میں تقسیم کیا تھا۔ اُن کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ قیامِ حمل کے اختتام کے قریب قریب ان کی اہلیہ غریبی سے تنگ آکر شکایت بھرے انداز میں کہنے لگیں:

''بورصہ شہر میں تُو نے قاضی کے عہدے اور مدرّسی سے دستبردار ہو کر اپنا سب مال و مِلک جو بھی تھا اُسے اِدھر اُدھر تقسیم کیا اور اب ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں بچا۔ اب ہمارا بچہ جو چند دنوں تک پیدا ہونے والا ہے اُس کو لپیٹنے کے لیے ہمارے پاس جرسی کا ایک ٹکڑا تک نہیں ہے۔''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور ایک ملازم بادشاہ کی جانب سے ارسال کیے گئے تحفہ تحائف اور عطیات لے کر حاضر ہوا۔ اس پر اُنھوں نے فرمایا:

''لے بیگم! جس مادّی اور دنیاوی چیز کی تجھے ضرورت تھی وہ تجھے مل گئی'' (۱۸)

اس روایت میں اصل اہم پہلو اُن کی کرامت سے بڑھ کر اُن کا راہِ حق میں اپنا سب کچھ خرچ کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے گھر میں اُن کے اپنے خاندان کے لیے کچھ بھی بچا نہیں تھا۔ یہ تھی صوفیائے کرام کی برتری جس کی وجہ سے وہ ہر دل عزیز بن گئے۔ وہ اپنے نفسِ امارہ کو مٹا کر چاہے امیر، چاہے غریب، چاہے مسلم، چاہے غیر مسلم دوسروں کے دلوں کو موہ لیتے تھے اور اس توسط سے اتحاد اور یکجہتی کی محکم بنیادیں فراہم کرتے تھے۔

ان مثالوں سے ہٹ کر جب ہم ترک صوفی بزرگوں کی شاعری کی جانب آتے ہیں تو

دیکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کی عملی زندگی کی مانند اُن کے کلام میں بھی حقیقی عشق، انسان دوستی و برداری اور اتحاد و یکجہتی کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

یہ راہِ تصوف جو انسان کو اتحاد کی طرف لے جاتی ہے اُس کی پہلی منزل دین و مذہب نسل و رنگ اور جنسیت کی تفریق کیے بغیر تمام بنی نوع آدم کو ایک ہی نظر سے دیکھنا ہے۔ اس کی مثال معروف صوفی بزرگ حاجی بکتاش ولی (متوفی ۱۲۷۱ء) کے اِن اشعار میں بے حد عمدہ طریقے سے ملتی ہے۔ اُن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں (۱۹)

مرد و زن کا سوال ہی نہیں محبت کی زبان میں　　حق نے جو بنایا ہے وہ بہت خوب بنایا ہے

ہماری نگاہ میں مرد و زن کی تفریق ہی نہیں　　جو کمی بیشی ہے، وہ تیری کج نظری میں

اپنے دوست کے ساتھ زخم کھا کر خون ہم بہاتے ہیں　　ہر اک سانس میں خالقِ حقیقی کو یاد کرتے رہتے ہیں

اولیاء کے میدان میں رازِ وحدت سمجھ پھر آ　　چالیس شاخ کے شمع دان میں اک شمع بن جلتے ہیں

رنگ ہمارا گلاب کا ہے گلاب جیسے کھلتے ہیں　　دلوں میں عشق کے ساتھ محبت پھیلاتے ہیں

حق اور حقیقت کی راہ میں ایک ہی چہرہ رکھتے ہیں　　ہم جیسے ہیں ویسے ہی بدلے بغیر رہتے ہیں

انسان اور جانور تمام مخلوقات کو ایک ہی نظر سے دیکھنے کے موضوع کی طرف "یونس ایمرے" کی شاعری سے متعلق بات کرتے ہوئے پھر آئیں گے اس لیے ہم آتے ہیں وحدتِ انسانی کی دوسری منزل کی جانب اور اسے آق شمس الدین کے دو اشعار سے شروع کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں (۲۰)

نہ کسی کی نکتہ چینی کر کے اُسے خراب کر　　نہ ہی اپنی مدح گوئی غیر کے سامنے کر

کسی کی نعمت و دولت پر مت کرتُو حسد   ممکن ہوتو درِ حسد کے سامنے بن اک سدّ

یہ اشعار در حقیقت یکجہتی کی راہ کی پہلی منزل ہے۔ ''نہ کسی کی نکتہ چینی کرو نہ دوسروں کے سامنے اپنی مدح گوئی اور نہ کسی کی نعمت و دولت پر حسد کرو اگر ممکن ہو تو حسد کا دروازہ بند کرو'' درویشوں کو یہ جو مشورہ دیا جاتا ہے اگر اس پر عمل ہو سکے تو خاندانوں سے لے کر ملکوں تک کے بہت سے مسائل اور دشمنیاں پیدا ہونے سے قبل ختم ہو سکتی ہیں۔

پھر ہم ابراہیم مجوریؒ (۱۴۸۲ء) کی اس دعائیہ نظم کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ یہ نظم بھی یکجہتی کی راہ کی دوسری منزل کا پتا دیتی ہے (۲۱)

حج کی راہ پر جاتے ہوئے پیاس سے مرنے والوں کی خاطر
کربلا کے میدان میں شہید ہونے والوں کی خاطر

زمین پر گرنے والے خونِ شہید کی خاطر   اُس شہید کے پاک و صاف جسم و جاں کی خاطر

اُن تمام مظلوموں کی آہ و فغاں کی خاطر   حضرت کی جانب دل میں راہ پانے کی خاطر

وہ غریب جو باوجود غربت میں پریشاں ہونے کے   کسی سے اک پیسہ تک نہ مانگتے ہیں اُن سب کی خاطر

اُن کے بھوک کے باوجود صبر کرنے کی خاطر   اُن کی زبانوں پر جاری شکر و دعا کی خاطر

ظلم کی وجہ سے گرنے والے ویرانے کی خاطر   جور و ستم کے ساتھ بننے والی عمارت کی خاطر

یتیم کے جھکنے والے سر کی خاطر   بھوک سے رونے والے اُس بچے کی خاطر

بچپن ہی میں ماں کے بغیر رہنے والوں کی خاطر   پیدائش سے قبل والد کی موت دیکھنے والوں کی خاطر

ہمارے چہرے کی سیاہی پاک کر ہمارے دل کی بیماری ٹھیک کر

ہمارے دل کا چہرہ اپنی جانب موڑ ہماری جان کی آنکھ اپنی طرف کر

شرک کے غصے سے ہمیں آزاد کر اپنی وحدت سے ہمیں دلشاد کر

یہ نظم بھی محبت اور دوستی کی جانب دوسری منزل اس لیے ہے کہ اس میں غرباء یتیم، مظلوم اور گرفتار، جتنے بھی ظلم وستم دیدہ بے چارے ہیں اُن سب کو وسیلہ بنا کر صوفی اپنی فلاح کی دعا کرتا ہے۔ یعنی صوفی درویش کو یہ شعور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنی ہو اور اپنے گناہوں کو معاف کرانا ہو تو ان سب مظلوموں کی خدمت کرنا اور انھیں خوش رکھنا ہے کیونکہ رضائے الٰہی اُن کی خوشی میں ہے۔ اگر نگاہِ عمیق سے دیکھا جائے تو سماجی انصاف اور مساوات کی بنیاد یہی ہے جو بقائے باہمی کے لیے لازم ہے۔

اس منزل کے بعد جو کمال کی منزل ہے وہ معروف ترک صوفی یونس ایمرے" کی ہے۔ کیونکہ وہ ترک صوفیوں کے اندر محبت اخوت انسان دوستی، احترام آدمی، اتحاد و یکجہتی کے خیالات میں لاجواب ہیں۔ اس لیے یہاں اُن کے ہمارے موضوع سے متعلق خیالات کو ذرا زیادہ تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

سب سے پہلے یونس ایمرے" کے بارے میں ہم نے یہ بتایا ہے کہ وہ محبت اور انسان دوستی کی کمال کی منزل کے آشیانہ نشیں ہیں۔ وہ مغلوں کی یلغار کے زمانے، افراتفری غیری یقینی خوف وہراس کے طوفان کی لپیٹ میں آ کر بکھرے ہوئے، بٹے ہوئے اور سہمے ہوئے اناطولیہ کے ترکوں کو اُن کی اپنی زبان میں یعنی آسان ترکی میں ایسے زندگی بخش، حوصلہ افزا اور بے خوف پیغامات پہنچاتے رہے کہ اُن کے پیغامات نے اُس عہد کے مظلوموں کے لیے ایک روشن چراغ بن کر اُن کے دلوں میں اُمید اور رضا کی کرنیں پیدا کی تھیں۔ اُن کے پیغامات میں محبت ہے،

حالانکہ اُن دنوں نفرت کی لہریں موجزن تھیں، اُن کے پیغامات میں دوستی ہے حالانکہ ان دنوں چاراطراف میں دشمنی ہی دشمنی تھی، اُن کے پیغامات میں اُمید ہے حالانکہ اُن دنوں مغلوں کی تلواروں تلے اُمید کی بیخ کنی کی جارہی تھی اور اُن کے پیغامات میں بلاتمیز نسل و مذہب اتحاد و یکجہتی تھی حالانکہ اُس زمانے میں افراتفری اور انسانیت کشی کے ہر طرح کے سامان مہیا تھے۔ ہاں اُس زمانے میں صرف یونسؒ نہیں تھے جو اس عہد کی صعوبتوں کے سامنے سدِّ راہ بننے کی کوشش کرتے، اُس وقت کے تمام صوفی بزرگ اور درویش گاؤں گاؤں، صحرا پہاڑ گھوم پھر کر افراتفری کی تیز ہوا کو روکنے کے لیے اپنی جانیں قربان کرتے تھے اور درگاہیں عام لوگوں کے لیے امداد اور بھروسے کے مراکز بن رہی تھیں۔ یونسؒ بھی تصوف کی راہ میں قدم رکھنے سے قبل جب قحط کی وجہ سے اُن کے گاؤں میں کھانے کو کچھ نہیں بچا تھا تو اپنے گاؤں کے بزرگوں کی ایما پر مولانا جلال الدین رومیؒ کی درگاہ میں اپنے گاؤں کے لوگوں کے لیے گندم مانگنے کو گئے تھے۔ یعنی اُس زمانے میں درگاہیں لوگوں کی عام ضروریات کو بھی پورا کرتی تھیں۔

اُن سب کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ محبت کا ماخذ خدا تعالیٰ ہے اور عشقِ الٰہی تمام صوفی درویشوں کا اصل مقصد ہے۔ سو اُن کا خیال تھا کہ چونکہ خدائے ذوالجلال جس سے پیار کرتا ہے اُس سے پیار کیا جانا چاہیے لہٰذا انسان جو محبوب الٰہی ہے اُس سے بھی پیار کرنا ضروری ہے۔ یونس ایمرےؒ بھی دوسرے صوفیوں کی مانند دوست کے دوست ہونے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں (۲۲)

معشوق جس سے پیار کرے اُس سے پیار کرنا چاہیے	اپنے دوست کے دوست کو غیر سمجھنے کی ضرورت کیا ہے

اگر تُو سچا عاشق ہے، بن اپنے دوست کے دوست کا دوست	اگر یوں نہ بن سکے گا تو نہ کہہ کہ میں ہوں ایک سچا دوست

دوست کے دوست کا دوست بننا تو ہر عاشق پر فرض ہے اور ان عاشقوں کا امام بننا ہے تو پھر اس دوستی میں بہتر (۷۲) فرقوں میں فرق نہیں جاننا چاہیے۔ یعنی مسلمان، عیسائی، یہودی یا

آتش پرست ہو، کسی پر بھی تفریق کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے (۲۳)

اگر عاشقِ حقیقی ہے تو تو بہتر فرقوں پر قربان ہو جا تا کہ عاشقوں کی صف میں امامِ صادق بن جا

جب درویش دوست کے دوست بنتے ہیں تو پھر وہ بہتر فرقوں کو بھی ایک نظر سے دیکھنا شروع کرتے ہیں اور تب سب تمام مخلوقات کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یونسؒ کہتے ہیں (۲۴)

خاص و عام فرماں برادر و عاصی دوست کے بندے ہیں سارے
کس کس کو الگ کر سکتا ہے تو باہر آ اپنے گھر سے

پھر اسی مضمون کے ایک اور شعر میں فرماتے ہیں (۲۵)

تمام مخلوقات کو جو نہ دیکھے گا ایک ہی نظر سے
لوگوں کا استاد بھی ہو دراصل وہ عاصی ہے

خالی نہ سمجھ کسی ایک کو بھی کوئی بھی بندہ خالی نہیں ہے
کمزوری پر نظر ڈالنا بھی اولیاء اللہ کے لیے مناسب نہیں

(۲۶) -----

یونسؒ مقام و عہدہ، مال و ملک، دولت، جنسیت، فرقہ، مذہب، دین، رنگ و نسل کو نظر انداز کرتے ہوئے عشقِ الٰہی کے سبب تمام مخلوقات کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر تم نے کسی ایک کی دل شکنی کی تو چاہے تم سفید داڑھی رکھ کر اپنے آپ کو حقیقی مسلم سمجھو، چاہے حج پر جاتے رہو، ان سب کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ دل خدا کی تجلی گاہ اور خدا کی تجلی گاہ کو برباد کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو بد بخت ہی سمجھیں (۲۷)

خدا کا تخت ہے یہ دل یہ جان کہ خدا کی نگاہِ کرم ہے دل پر
دونوں جہان، کا بد بخت وہ ہے جس نے کسی کا دل توڑا ایک بار

سفید داڑھی رکھے ایک عمر رسیدہ بندہ معلوم نہیں اُس کا حال کیسا
حج پر نہ جائے خواہ مخواہ بار بار اگر اُس نے دل توڑا ہے کسی ایک کا

یونسؒ کی نظر میں دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور اُس کو خراب نہیں کرنا چاہیے اور اسی لیے سب کو اپنے جیسا سمجھنا اور اپنے لیے جس اچھی چیز کی خواہش ہے اُسی کی خواہش دوسروں کے لیے بھی کرنا چاہیے کیونکہ جملہ مقدس کتابوں کا مطلب یہی ہے (۲۸)

تُو اپنی خاطر جو بھی چاہے گا دوسرے کے لیے بھی چاہ بس اُسی کو
چہار کتابوں کا مطلب صرف یہی ہے اگر سمجھتا ہے کہ کوئی مطلب ہے

جس طرح دوسرے صوفیائے کرام فرماتے تھے بالکل اُسی طرح یونس ایمرےؒ بھی کہتے ہیں کہ اگر دوستی و محبت چاہیے تو دوسروں کی غلطیوں سے چشم پوشی ضروری ہے چاہے وہ تم پر حملہ کریں (۲۹)

پیٹنے والے پر ہاتھ نہ اُٹھا، گالی دینے والے پر زبان نہ چلا
درویش کو چاہیے غصہ نہ کرنا، تُو کبھی درویش بن نہیں سکتا

یونسؒ یہ سب کہتے ہیں کیونکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ انسان کے اس دنیا میں آنے کا سبب مسائل اور لڑائیاں پیدا کرنا نہیں، دوستی اور محبت کو پھیلانا ہے اور پھر فرماتے ہیں (۳۰)

میرا کام نہیں ہے مدعی بننا، میرا کام ہے بس پیار پھیلانا
دوست کا گھر دِلوں میں ہے دل بنانے کو آگیا ہوں مَیں

یونسؒ کے اشعار میں جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ سب اُن کی دوسری نظموں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔تم کسی کا دل مت توڑو، حق تعالیٰ کو پہچانو اور اولیاء اللہ کا دامن پکڑو اور ایک دفعہ بھی ہو بھلائی کرو۔کیونکہ ایک مرتبہ ہی سہی بھلائی بھلائی ہے اور وہ ہزاروں بھلائی سے کم نہیں ہے جو یونسؒ کے خیالات کی تلخیص ہے اُن سب پر مشتمل اُن کی ایک دوسری ترکی نظم کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔(۳۱)

اگر اک بار دل توڑا تُو نے اپنی نماز کو نماز نہ سمجھ کبھی
بہتر فرقے تیرا ہاتھ منہ دھو کر وضو نہیں کرا سکتے کبھی

کہاں ہیں اولیاء، کہاں ہے اب اُن کے ذہن باقی وہ تو چل بسے
سب پرواز کر کے خدا کی درگاہ پہنچے، وہ ہما ہیں بطخ مت سمجھ کبھی

راہ وہ ہے کہ سیدھا حق پہنچائے، آنکھ وہ ہے کہ حق کو دیکھے
ولی وہ ہے عاجزی سے کام لے، کبرو تکبّر سے نہ دیکھے کبھی

سیدھی راہ اگر تُو نے قدم رکھا کسی ولی کا دامن پکڑے رہا
اک بھی ہو اگر کارِ خیر کیا، یہ ہزار کارِ خیر سے کم نہیں کبھی

یونسؒ ان فقروں کو باندھ لیتا ہے، جیسے گھی میں شہد ملا دیتا ہے
لوگوں کو اپنا مال بیچتا ہے اُس کا سامان جوہر ہے نمک نہیں کبھی

جس طرح ہم پہلے کہہ آئے ہیں تصوف اسلام کا ہنستا ہوا چہرہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے زیادہ رحمت کے پہلو پر زور دیتا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کراں ہے اور اللہ تعالیٰ جو ربّ العالمین اور ارحم الرّاحمین ہے وہ اپنے بندوں سے پیار کرنے والا ہے اور ہمارے نبی پاک محمد مصطفیٰؐ ''رحمتہ العالمین'' ہیں۔ یعنی اسلام میں رحمت، مرحمت اور عفو و مغفرت ہے نہ کہ ہر چھوٹی موٹی غلطی پر غصے میں آکر بندوں کو دوزخ میں بھیجنے کا نظام۔ یونسؒ اور دیگر صوفیائے کرام نے اللہ تعالیٰ کے نور، رحمت کو دیکھا اور قرآن و حدیث کی راہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اُن کی روشنی سے صدیوں تک گمراہ ہونے والوں کی رہبری کی ہے۔ یونسؒ کے اوپر مذکور ان اشعار کو دیکھ کر تو دل یہ کہتا ہے کہ کیا خوب ہوتا جو ہر کوئی ان پر عمل کر سکتا تاکہ دنیا بھر سے دشمنیوں اور حسد و بغض کی بیخ کنی کی جا سکتی۔

الغرض صدیوں پہلے سے لے کر آج تک صوفی بزرگوں نے ہمیں محبت، دوستی، برادری اور آدمی بن سکنے کے لیے ''احترامِ آدمی'' کا راستہ دکھایا ہے۔ اگر قرآن اور حدیث کے پابند رہتے ہوئے اُن کی تعلیمات پر عمل کیا جا سکے تو اس وحشت ناک دنیا جس میں بھائی بھائی ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں اور ایک دوسرے کے جان و مال تاراج کر کے ایک دوسرے کے ملک برباد کرتے ہیں اس میں صلح و آشتی، امن و امان، خوشی و رفاہ کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آدمیت، احترامِ آدمی ہے اور احترامِ آدمی بقائے باہمی کی واحد راہ ہے۔

حوالے

۱ ابراہیم قفس اوغلو حقی ڈرسن یلدز۔ ایردوغان میرچل۔ محمد سرائے ترک اسلامی ریاستوں کی ایک مختصر تاریخ (ماسوائے سلطنت عثمانیہ)، مترجم منور علی خان قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ ثقافت سینٹر آف ایکسیلینس، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۲ء ص ۳۸۔۳۹

۲ ایضاً ص ۴۴

۳ Mehmet Demirci, Tarihten Gunumuze Tasawuf Kultu-Makaleler, Degerier Degeler Egitim Markezi Yayinlari,Istanbul, 2009. p 221

۴ Ibid. P. 225

۵ Ibid. PP. 222-223

۶ Ibid. P. 221

۷ Selcuk Eraydin Tasswuf ve Tarikatler, Marifet Yayinlari, Istanbul 1990 pp.47-49

۸ Mehmat Demirci, ibid, p. 227

۹ Osman Turer, Ana Hatlariyla Tasawuf Tarihi Atac Yayinlari, Istanbul 2011. pp 154-184

۱۰ Mehmat Demirci, ibid, p 314

۱۱ Ibid. P. 320

۱۲ Metin Celik, Her Yonu ile Aksemseddin Hazretleri, Ensar Yayinlari, Istanbul 2011 pp129-144

۱۳ H. Kamil Yilmaz. Aziz Mahmod Hudayi, Hayati. Eserlen. Tarikati, Erkam Yayinlan, Istanbul 2006 p. 87

۱۴ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام نبی اینڈ سنز پبلیشرز لاہور ۱۹۸۱ء، ص ۹۳ے

۱۵ H. Kamil Yilmaz, ibid., pp 22-224

۱۶ Metin Demircl Ibid . p 322

۱۷ Ibid. P. 321

۱۸ H. Kamil Yilmaz, Ibad., p 85

۱۹ Yasar Seyman, Alevi Ogretisinde ve Toplumsal Yasamda Kadin, Http//www. hbvdergisi. gazi edu tr /ui/dergiler/32 -65-78 pdf.p.1

۲۰ H. Kamil Yilmaz, ibid., p 178

۲۱ Ibid. p. 171-172

۲۲ Mehmat Demirci, Younus Emre'de Llahi Ask ve Insan Sevgisi. Selcuk Yayinlari, Istanbul 1991, p.111

۲۳ Ibid, p. 111

۲۴ Ibid, p. 112

۲۵ Ibid, p. 119

۲۶ Ibid, p. 119

۲۷ Ibid, p. 122

۲۸ Ibid, p. 118

۲۹ Ibid, p. 115

۳۰ Ibid, p. 118

۳۱ Abdulbaki Golpinarli, Yunus Emre, Divan ve Risaletu'n-Nushiyye, Der Yayintan, Intanbul 2003, p. 205-206

احمد اعجاز الدین رحمت علی (ماریشس)☆

فرانسیسی ادب کی مشرقی اساس

This paper investigates the influence of Pilpai famous Kashmiri fable writer of the Panchtantra on the French Poet and Fabulist Jean de La Fontaine (1621-1695) and brings to the fore some of the similitudes. It also very briefly traces out the popularity of the Panchtantra in the Muslim world and its translated versions in Persian and Arabic for it to be subsequently translated in French.

ہر زبان کے ادب کی طرح فرانسیسی ادب بھی اپنی تہذیب اور دانشوری کا آئینہ ہے۔اُردو زبان وادب کا بھی یہی حال ہے۔کسی زبان اور اُس کے ادب پر اُسی وقت اثر پڑتا ہے جب دہ قومیں آپس میں ملتی ہیں۔یہ اختلاط کئی اعتبار سے ہوسکتا ہے۔اردو اور فرانسیسی کے تعلق سے ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ فرانسیسی آبادکار کی حیثیت سے ہندوستان میں ۱۷ویں صدی سے اپنا قدم جمانے لگے تھے۔یہاں پر یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس خلط ملط سے دونوں زبانوں نے ایک دوسرے سے بہت سارے الفاظ قبول کیے اور عصرِ حاضر میں ان دونوں کے خمیر میں ایک دوسرے کے الفاظ اس طرح سے رچ بس گئے ہیں کہ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا ہے کہ کون سا لفظ کس زبان سے تعلق رکھتا ہے۔یہ بات بھی قدرے دلچسپ ہے کہ اردو اور فرانسیسی دونوں ورناکیولر زبانیں ہیں اور بنیادی طور پر انڈو یورپین گروہ کی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

☆ صدر شعبۂ اُردو مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ۔ماریشس۔

دراصل جس طرح اردو زبان نے دوسری زبانوں سے اثرات قبول کیے ہیں اسی طرح اس کے ادب نے بھی دوسری زبانوں کے ادب سے بھی اثرات قبول کیے ہیں۔ اثرات قبول کرنے کا یہ عمل دوطرفہ ہے۔ اگر تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ مشرقی ادب سے فرانسیسیوں نے ۱۷ویں صدی سے قبل دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ دراصل پنچ تنترا کی کہانیاں فارسی اور عربی کے بعد لاطینی زبان کی معرفت یورپی زبانوں میں منتقل کردی گئی تھیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس بات کی وضاحت کرتے چلیں کہ اردو سے پہلے فرانسیسی نے ہندوستانی ادب کے اثرات کو قبول کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کی زندہ مثال سنسکرت زبان کی کتاب پنچ تنترا کا فرانسیسی ترجمہ ہے۔ یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ لافونتین جیسے ادیب اور شاعر کا اگر آج فرانسیسی ادب میں کوئی مقام ہے تو وہ مذکورہ بالا اثرات ہی کی بدولت ہے جو انہوں نے پلپئی (Pilpai) کی حکایتوں کا ترجمہ پڑھنے کے بعد قبول کیے تھے۔ بہ ایں ہمہ گارسیں دتاسی (۱۷۹۴۔۱۸۷۸ء) کی اردو دوستی اور احسانات سے ہم سب واقف ہیں اور بعض اوقات ہم اُن کے استاد انتوان اسحٰق بیرن سلوستر دی ساسی (Antonie Issac Barron Sylvestre De Sassy) (۱۷۵۷۔۱۸۳۸ء) کی خدمات کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

سلوستر دی ساسی پیرس کے السنہ شرقیہ میں ماہرِ لسانیات اور مستشرق کی حیثیت سے برسرِ روزگار تھے۔ یہودی ہونے کے باوجود وہ عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ اس ضمن میں عربی لسانیات اور ساسانی حکمرانوں کے شاہی دور کی تاریخ پر کام کرنے کے علاوہ ان کا ابن المقفی کے 'کلیلہ ودمنہ' کا ترجمہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ چونکہ وہ فارسی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے اس لیے بہت ممکن ہے کہ انہوں نے ''پنچ تنترا'' کا فارسی ترجمہ بھی پڑھا ہوگا۔ اسی وجہ سے جب انہوں نے اپنے ہونہار شاگرد گارسیں دتاسی کو (ہندوستانی) اردو کے استاد کی حیثیت سے تقرر کرنے کے لیے فرانسیسی حکومت سے سفارش کی تو ان کے پیشِ نظر سنسکرت کی ان کہانیوں کا اردو ترجمہ بھی رہا ہوگا۔ یہ بات بھی قدرے دلچسپ ہے کہ گارسیں دتاسی کو بھی عربی اور فارسی آتی تھی جس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے پنچ تنترا کی کہانیوں کو اِن زبانوں میں پڑھا ہوگا۔

تاہم اس بات سے سلوستر دی ساسی کی دُوراندیشی کا اندازہ وہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح سے یہ بات سمجھتے تھے کہ سنسکرت میں جو تمام ہندوستانی زبانوں کی ماں سمجھی جاتی ہے اگر اتنا ثروت مند ادب پایا جاتا ہے تو (ہندوستانی) اردو جس نے عربی اور فارسی کا دودھ پیا ہے اس کا ادب بھی قابل توجہ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اُس کی تدریس اور فروغ کے لیے گارسیں کو مقرر کرنے کے علاوہ ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ مشرقی ادب یا ہندوستانی ادب سے صفِ اول کی مغربی زبانوں نے اثرات قبول کیے۔ تاہم فرانسیسی ادب میں سب سے پہلے ژاں دے لافونتین (۱۶۲۵۔۱۶۹۵ء) کی منظوم حکایات میں ہمیں ہندوستانی ادب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ بعد ازاں ہمیں یہ اثرات سلوستر ساسی اور گارسیں دتاسی کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ پنچ تنترا کی مناسبت سے چند باتیں کرتے چلیں۔

قدیم ہندوستان میں کشمیر علم کا گہوارہ تھا۔ دوسری اصناف پر بات نہ کر کے اگر ہم اپنے ذہن کو قصے کہانیوں پر مرکوز کریں تو یہ بات ہم پر منکشف ہوگی کہ کشمیر پنچ تنترا کی کئی کہانیوں کا محل وقوع رہا ہے اور اُن کے مصنفین بھی کشمیری تھے۔ وی ایس نروان (V.s.Nirvan) نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''اگر چہ وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ پنچ تنترا کی تمام کہانیوں کی اصل جڑ کشمیر ہے پھر بھی یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر ان کہانیوں کا گہوارہ رہا ہے اور کشمیری کہانی کار اور گوپوں نے ان کو مقبول عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔'' [۱]

چونکہ یہ کہانیاں اپنے زمانے میں بہت مقبول تھیں اسی لیے جب ان کا ترجمہ فرانس پہنچا تو ژاں دے لافونتین جیسے فقید المثال ادیب نہ صرف ان کی طرف متوجہ بلکہ متاثر بھی ہوئے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ آج بھی مغرب میں لافونتین کی شہرت (بحیثیت منظوم حکایت نگار) میں کوئی کمی نہیں آئی اور شاید ہی فرانسیسی زبان میں اس صنف کا کوئی ہم سر ہو۔

''پنچ تنترا کی کہانیوں نے جیسے لافونٹین کو روحانی تاثیر بخش دی تھی۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں 'اُس دانا' ہندوستانی کا شکریہ ادا کیا ہے جس نے پنچ تنترا لکھی ہے۔'' ۲

اس بات کی وضاحت کرتے چلیں کہ پنچ تنترا کی کہانیوں سے بہت پہلے ہندوستان کی دوسری لوک کہانیاں یورپ پہنچ گئی تھیں لیکن پنچ تنترا کی کہانیاں اس ضمن میں زیادہ خوش نصیب تھیں کہ ان سے قبل کہی جانے والی کہانیاں جن کو سنسکرت زبان میں ''کتھاسرت ساگر'' اور ''برھکت کتھا'' کہا جاتا ہے۔ دراصل داستان گویوں کی معرفت مغرب میں پہنچی تھیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان لوک کہانیوں میں تبدیلی آتی گئی اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ لوگ ان کو سینہ بہ سینہ محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس بات کی تردید کی جاسکتی ہے کہ پنچ تنترا کی کہانیاں اُس وقت فرانس پہنچی تھیں جب کسی ہندوستانی نے ان کا ترجمہ سنسکرت سے فرانسیسی زبان میں کیا تھا جس کے نتیجے میں لافونٹین نے ان کہانیوں کو اپنی مادری زبان میں پڑھا تھا۔ ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ پنچ تنترا کی یہ کہانیاں فارسی میں 'کلیلہ ودمنہ' کی شکل میں منتقل کی گئی تھیں۔ پنچ تنترا کی یہ کہانیاں سنسکرت سے فارسی پھر عربی میں منتقل کی گئی تھیں۔ دراصل ۵۷۰ء میں شہنشاہ ایران خسرو پرویز نے اپنے ذاتی طبیب بارزویے کو ہندوستان بھیجا تھا تاکہ وہ وہاں سے پنچ تنترا کا ایک نسخہ لے آئے۔ چنانچہ پنچ تنترا کا پہلا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیا گیا۔ فارسی ترجمے کا مقدمہ علی بن ازشاہ الفارسی نے لکھا تھا۔ بعدازاں عربی میں اس کتاب کا ترجمہ ابن المقفی نے ۷۵۰ء میں کیا۔ سنسکرت سے فارسی ترجمہ نصراللہ بن عبدالمجید منشی نے کیا اور ان کہانیوں کے مجموعوں کو 'انوار سہیلی' کا نام دیا۔ فارسی اور عربی کہانیوں کے یہ مجموعے 'کلیلہ ودمنہ' کے نام سے زیادہ مقبول ہوئے۔ ۳

دراصل پنچ تنترا کی پہلی کہانی کے دو مرکزی کردار ہیں ''کلیلہ ودمنہ''۔ یہ دونوں جانور لومڑی ہیں اور اسی نام سے یہ کتاب فارسی اور عربی میں زیادہ مشہور ہوئی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کہانیوں کو مغرب میں پہنچانے کا کام عربوں کا ہے۔ ابن المقفی کا عربی ترجمہ ہی مغرب

میں مقبول ہوا۔ مشرق میں یہ کہانیاں بہت کامیاب ہوئیں خصوصاً اسلامی ممالک میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یہ بات غور طلب ہے کہ آج بھی فارسی اور عربی میں 'کلیلہ ودمنہ' کے کئی مخطوطات دستیاب ہیں جب کہ پنچ تنترا کے اصل مخطوطہ کا علم کسی کو نہیں۔

پنچ تنترا کی کہانیوں کا مصنف پلپئی نامی شخص تھا جس کا اصلی نام وشنو شرما ہے۔ یہ ایک برہمن تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق پلپئی بادشاہِ ہندوستان دبش کلن (Dabish Kilan) کا صلاح کار تھا۔ چونکہ بادشاہ کے تینوں بیٹے ناخلف اور نکمے تھے اسی لیے پلپئی نے ان کہانیوں کے ذریعہ ان بگڑے شہزادوں کو درسِ عبرت دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کہانیوں میں حکمت، ایثار، بے غرضی اور چالاکی کی بے شمار ضرب الامثال اور محاورے پائے جاتے ہیں۔

پنچ تنترا کہانیوں کی سب سے پرانی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے عنوان سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس میں پانچ ابواب ہیں۔ ہر باب میں کئی کہانیاں ہیں۔ پہلا باب جس کا عنوان سنسکرت میں مترجھیدا ہے یعنی دوستوں کا گم ہو جانا۔ اُس میں ۲۲ منظوم حکایات ہیں۔ دوسرے باب ''متراسمپراپتی'' یعنی ''دوست بنانا'' میں سات (۷) منظوم حکایات ہیں۔ تیسرے باب ''ککولوکیم''، یعنی ''دوستوں میں اَن بَن'' میں ۱۷ منظوم حکایات ہیں۔ چوتھا باب ''لادھاپرناسم''، یعنی ''مفاد کا نقصان'' ہے جس میں ایک مگرمچھ اور بندر کے تعلقات کو بیان کیا گیا ہے اور آخری باب ''اَپرک سیتا کا اِکم'' ہے جس کا مطلب جلد بازی میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے انجام پر کسی برہمن اور ایک نیولے کے تعلقات پر بات کی گئی ہے۔

ان تمام حکایات میں جانوروں کو کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ سنسکرت زبان میں ان حکایات کا فارسی مترجم ایران کے اصفہان شہر میں سکونت پذیر کوئی ہندوستان کا باشندہ تھا جس کے ترجمے سے استفادہ کر کے ۱۶۴۴ء میں گولمیں (Gaulmin) نامی فرانسیسی نے ان کو اپنی زبان میں منتقل کر دیا۔

بعض تحقیقات کے مطابق ژاں دے لافونٹین نے پلپئی کے سنسکرت مجموعے پڑھنے کے

بجائے المقفع کے عربی ترجمے کا فرانسیسی ترجمہ پڑھا تھا جو عربی سے لاطینی پھر فرانسیسی میں منتقل ہوا تھا۔ اس کتاب کا نام تھا "Le livre des lumieres ou la conduite des rois" یعنی روشنیوں کی کتاب یا بادشاہوں کا طرز عمل۔ ۳۲

لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ لافونتین اپنی کتاب کے دیباچے کے علاوہ تین جگہوں پر پلپئی کے ممنونِ احسان ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ لافونتین نے اپنی زندگی میں پلپئی کے علاوہ یونانی حکایت نگار ایزوپ Esope کی کہانیاں بھی پڑھی تھیں۔

دوسرے فرانسیسی ادباء مثلاً رابلے Rabelais اور مونتائیں Montaigne نے نہ صرف ان کہانیوں کا ذکر کیا ہے بلکہ ان کی تعریف بھی کی ہے۔ ان ہی کے مطابق ایزوپ کی یونانی کہانیوں کا فرانسیسی ترجمہ ہو چکا تھا اور اپنے اسکول کے زمانے میں لافونتین نے ان کو پڑھا تھا۔ ایزوپ چھٹی صدی قبل مسیح کا مصنف تھا جب کہ پلپئی تیسری صدی قبل مسیح کا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پلپئی کی حکایات دو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں اور دنیا کی قدیم ترین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۷ویں صدی کے فرانس میں منظوم حکایت نگار کی حیثیت سے لافونتین کا کوئی معاصر نہیں تھا۔ مغرب میں حکایتوں کا دور ختم ہونے کو آیا تھا۔ لیکن لافونتین نے اپنے قلم کے زور سے اور پنچ تنترا کی حکایات سے متاثر ہو کر اس صنف کو فرانس میں نئی زندگی بخش دی۔ ۴۳ سال کی عمر میں لافونتین حکایت نگاری کی طرف آئے تھے۔ وہ شاعر اور ڈرامہ نگار بھی تھے۔ اس زمانے کے فرانسیسی ادیب المیہ اور طربیہ کے علاوہ رزمیہ اصناف پر بھی اپنی توجہ مرکوز کر رہے تھے۔ لیکن لافونتین نے الگ راستہ اختیار کیا۔ ان کی منظوم حکایات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پلپئی کی حکایات سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ ان حکایات میں بعض اوقات جانور بھی وہی ہیں۔ دوسرے موقعوں پر ان حکایات کو لافونتین نے اپنے معاشرے کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں بعض فرانسیسی نقادوں نے ان کی حکایات کے نقائص بھی

گنوائے ہیں۔ مثال کے طور پر جس منظوم حکایت میں وہ جھینگر اور چیونٹی کی کہانی بیان کرتے ہیں اس میں وہ کہتے ہیں کہ "گرمی کے موسم میں جھینگر گاتا ہے" جو کہ غلط ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ جھینگر کی آواز بہت بھدی ہوتی ہے۔ اس منظوم حکایت میں لافونتین لکھتے ہیں کہ جھینگر، مکھی اور دوسرے کیڑے مکوڑے کھاتا ہے جو غلط ہے کیونکہ اس بات کا علم سب کو ہے کہ جھینگر مکھی اور دوسرے کیڑے مکوڑے نہیں کھاتا۔ دوسری منظوم حکایات میں ایسی چھوٹی موٹی دوسری غلطیاں نظر آتی ہیں جس کے نتیجے میں Burke نے لکھا ہے کہ:

"میرا خیال ہے کہ لافونتین کی تمام کہانیوں میں سے کوئی بھی اصلی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مغربی دنیا میں خصوصاً اطالوی زبان کے ادیبوں کے یہاں بھی ہمیں یہ بات نظر آئے گی کہ ان لوگوں نے اپنی کہانیوں کا اصل متن یا تو مشرق سے مستعار لیا ہے یا اپنے وطن کی چند مقبول کہانیوں کو مشرقی رنگ میں رنگ دیا ہے" [۵] مثلاً مندرجہ ذیل حکایتوں میں بڑی حد تک مماثلتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ دو عقاب، کچھوا اور لومڑی (پنچ تنتر ۱)
کوا، ہرن، کچھوا اور چوہا (لافونتین)

۲۔ برہمن، مگرمچھ، درخت، گائے اور لومڑی (پنچ تنتر ۱)
بلی، نیولا اور خرگوش (لافونتین)

لافونتین نے اپنی منظوم حکایتوں کے بارے میں خود کہا ہے:

"میں ان حقائق کو اپنی منظوم حکایتوں میں بیان کرتا ہوں جن کے ذریعے لوگ عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ میری تحریروں میں سبھی بولتے ہیں یہاں تک کہ مچھلیاں بھی بولتی ہیں اور وہ سب سے مخاطب ہوتی ہیں۔ انسان کی عبرت کے لیے میں جانوروں کو استعمال کرتا ہوں۔" [۶]

ظاہری بات ہے کہ لافونتین یونانی حکایت نگار ایزوپ (Esope) سے بھی متاثر نظر

آتے ہیں۔۷؎ لیکن اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ انہوں نے اپنی حکایات کو ایک نئے رنگ میں ڈھالنے کے لیے پنچ تنترا کی حکایات سے استفادہ کیا ہے۔ پلپئی نے اپنی پنچ تنترا میں بادشاہ کے بیٹوں کو نصیحت کی ہے اور ان ہی کے لفظوں میں یہ ''نیتی'' یعنی سیاست میں حکمت عملی کا درس ہے۔ مشرق میں یہ روایت ہمیشہ سے رہی ہے کہ بادشاہوں اور شہزادوں کو براہِ راست کوئی ایسی بات عام آدمی نہیں کہہ سکتا تھا جو ان کو گراں گزرے۔ مغلیہ عہد میں بھی ادیب، درباری اور وزراء وغیرہ تمثیلی انداز میں ہی اپنی بات بادشاہ سے کہتے تھے۔

لہٰذا اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ مغربی ادب نے بھی مشرقی ادب سے اثرات قبول کیے ہیں اور اس کی جڑیں پنچ تنترا سے جا ملتی ہیں۔ لافونٹین نے جہاں براہِ راست پلپئی کی حکایات سے اثرات قبول کیے ہیں وہاں دوسرے فرانسیسی حکایات نگاروں نے مثلاً میری دے فرانس "Marie de France" سٹراپولا Strapola، اور گریم Grime وغیرہ غیر ارادی طور پر پنچ تنترا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ذیل میں لافونٹین کی ایک منظوم حکایت درج ہے جس کے پڑھنے سے قاری لطف اندوز ہو سکتا ہے اور فرانسیسی ادب میں مشرقی روایات نیز پلپئی کے زیرک دماغ کا اندازہ بھی لگا سکتا ہے۔

جھینگر اور چیونٹی

رات دن موسم گرما میں
محو رہتا تھا جھینگر گانے میں
جب شمال کی جانب سے ہوا چلنے لگی
تو اناج دستیاب نہ ہونے کا کھٹکا ہوا اُسے
کہیں سے وہ کسی مکھی یا کیڑے
کا انتظام نہ کر پایا
تو پڑوسی کے یہاں وہ
اپنے فاقے کا اظہار کرنے گیا
اگلے موسم کی آمد تک
کچھ دانے قرض پر دینے کی التجا کی

اگلے اگست تک میں آپ کا قرض
سود کے ساتھ چکا دوں گا اس حیوان کی قسم!
چیونٹی کی بھی دو ایک کمزوریاں ہیں
اور وہ ادھار کسی کو کچھ نہیں دیتی
گرمی کے موسم میں کیا کرتے تھے آپ؟
اس نے جھینگر سے دریافت کیا
رات دن جب بھی موقع ہاتھ آتا
بس گاتا تھا میں
گاتے تھے آپ خوب! ناچیئے اب! ۸؎

لافونٹین (مترجم صاحب مقالہ)

حواشی

(انگریزی)	Selected works of B. Bissoondoyal Volume V. Edited by U. Bissoondoyal (pp.126) Moka Maunitius 1991)	۱
(انگریزی)	Ibid pp 127	۲
(اردو)	براعظم ہندوپاک میں ملتِ اسلامیہ (ص ۳۱) اشتیاق حسین قریشی کراچی، پاکستان ۱۹۷۷ء	۳
(فرانسیسی)	Le livre des lumieres ou la conduite des rois Gaulmin Simon Piget |Paris. France	۴
(فرانسیسی)	Larousse: Dictionnaire mondiala des literatures Paris, France 1984	۵
(فرانسیسی)	Guy delecury/J.A. Dubois le Panchtantra Imprimerie Nationable Paris. France 1995	۶
(انگریزی)	http:/Fr. Wikipedia. Org. Wiki/Esope	۷
(فرانسیسی)	Fables de la Fontaine pp3 Editions L'ocean Indien Mauritius 1998	۸

محمد طارق علی

پی جی وُوڈ ہاؤس۔ زندگی اور فن

پی جی ووڈ ہاؤس انگریزی ادب کا ایک مشہور و معروف ادیب ہے اُس نے اپنی خوب صورت مزاح نگاری کے حوالے سے ایک خاص پہچان بنائی اور خوب نام کمایا اور پیسہ بھی۔ وہ بہت ذہین لکھاری تھا، عمدہ نثر لکھنے والا جس نے ہر عمر اور ہر ذہن کے لوگوں کو اور زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنا گرویدہ بنایا، خواہ ان کا تعلق سیاست سے تھا یا ادب سے وہ سکول یا کالج کے طالب علم تھے یا استاد، اداکار تھے یا موسیقار، وہ انگلش معاشرے کے بیشتر طبقوں میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ اس کی مقبولیت بیسویں صدی میں بھی تھی اور آج بھی اس کی کتابیں لوگوں کے دلوں اور لائبریریوں میں جگہ بناتی ہیں۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اس کی تحریریں اپنے لڑکپن کے دور سے پڑھتے پڑھتے جوان ہوئے اور پھر بوڑھے ہوئے لیکن اس زمانی فرق کے باوجود پی جی ووڈ ہاؤس کی کوئی نہ کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں رہی۔

پی جی ووڈ ہاؤس اس بڑے مزاح نگار کا مخفف نام ہے مگر اس کی پہچان اور شہرت کا ایک خاص ذریعہ بھی۔ اس کا پورا نام یوں بنتا ہے "پیل ہام گرین وائل ووڈ ہاؤس" ایک اچھے گھرانے سے اس کا تعلق تھا، وہ ایک جج کا بیٹا تھا، ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۱ فروری ۱۹۷۵ء کو فوت ہوا اور یوں اس نے قریباً چورانوے سال کی عمر پائی۔ کاغذ سے اس کا رشتہ گہرا اور اٹوٹ تھا۔ وہ بسیار نویس تھا بلاناغہ لکھتا تھا مگر قلم کی نسبت وہ ایک بڑے سے ٹائپ رائٹر کا استعمال زیادہ کرتا تھا۔ اس کی تقریباً ایک صد کتابیں شائع ہوئیں لیکن یہ محض کتابیں نہیں تھیں اس کی مقبولیت کے جھنڈے تھے۔ اس نے مزاح کے علاوہ دیگر اصناف ادب پر بھی طبع آزمائی کی، مثلاً گیت، کہانیاں، ناول، ڈرامے، خطوط کے مجموعے، صحافتی موضوعات پر مبنی نگارشات، غنائیہ مجموعے اور ان کے علاوہ اس نے تھیٹر اور فلم کے لیے بھی لکھا۔

ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ پی جی ووڈ ہاؤس ایک مردم خیز زمانے میں پیدا ہوا اور وہ اس طرح کہ اس کے ہم عصروں میں بہت سے اہم اور مشہور لوگوں کے نام شامل ہیں مثلاً آفاقی شہرت پانے والا مصور پابلو پکاسو بھی اسی سال یعنی ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا۔ آئن سٹائن، ٹراٹسکی اور ای۔ ایم فاسٹر اُس سے بلحاظ عمر صرف دو سال چھوٹے تھے جب کہ ورجینیا وولف اور جیمز جائسی ووڈ ہاؤس کی پیدائش کے صرف ایک سال بعد یعنی ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ اس طرح یہ مزاح نگاران نابغہ لوگوں کی نسل کا حصہ تھا جنھوں نے وقت کی حدود کو پھلانگ کر زندگی کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ قدر کارنامے سرانجام دیئے اور اپنے زرخیز ذہن سے دنیا کو متاثر کیا ان کے کئی شعبوں کا نام لیا جا سکتا ہے مثلاً مصوری، لسانیات، سائنس، سیاست وغیرہ۔

پی جی ووڈ ہاؤس کا ایک شریف اور روایت پرست انگریز خاندان سے تعلق تھا۔ وہ ہر قسم کے انقلابی خیالات سے کوسوں دور تھا۔ اس نے ادب کو بطور پیشہ اختیار کیا مزاح نگاری اُسے پسند تھی۔ اس نے اپنی تحریروں میں ایسا اسٹائل اپنایا جو کہ ہر دور میں اس کی ایک خاص پہچان بنا۔ اُسے انگلش زبان سے عشق تھا اس نے جو کچھ لکھا اسی عشق کے تحت لکھا اور خوب لکھا۔ اُسے پذیرائی بھی خوب ملی یہاں تک کہ اس کی تحریروں کو برطانیہ کے علاوہ امریکہ اور ہر انگریزی داں ملک میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس نے اپنی مزاحیہ تحریوں میں بڑے اچھے کیریکٹرز متعارف کرائے۔ جنھیں اس کے قاری بہت انجوائے کرتے تھے۔ مثلاً پلوم، یوکرج، آنٹی اگاتھا، سمتھ، لارڈ ایمز ورتھ، راڈرک سپوڈ اور ان کے علاوہ جیوس، اور برٹی ووسٹر کے تو کیا ہی کہنے۔ اس کی چٹخارے دار تحریروں کے بہت سے ''عادی'' پڑھنے والے تھے۔ کہتے ہیں کہ کچھ قاری تو ایسے تھے کہ وہ ووڈ ہاؤس کے کئی مزیدار کیریکٹرز مثلاً جیوس اور ووسٹر کو پڑھتے پڑھتے انھیں خود پر ''طاری'' کر لیتے تھے اور اس کیفیت کا وہ اس طرح مزہ لیتے تھے کہ انھیں یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ جیسے ان کیریکٹرز کی بجائے وہ خود مصنف کی تحریوں میں چل پھر رہے ہیں اور بات چیت کر رہے ہیں۔ ووڈ ہاؤس کے دور کے کچھ لکھاری ایسے بھی تھے کہ انھوں نے اس کی مزاح نگاری

سے متاثر ہو کر اس کے بہت سے مزاحیہ نثری ٹکڑوں پر مبنی مزاحیہ اشعار ترتیب دیے ہوئے تھے۔
ووڈ ہاؤس کے مداحوں میں بہت سے اچھے اور معروف اہل قلم بھی شامل ہیں مثلاً ٹی۔ ایس۔
ایلیٹ، جان لی کر، وٹ گین سٹین، ڈوروتھی پارکر، گیری آدمز وغیرہ۔

اپنی مزاح نگاری کے ابتدائی زمانے میں ووڈ ہاؤس نے ایک بڑے کمال کی بات کی اس نے اپنی شگفتہ تحریریں بیک وقت نیویارک (امریکہ) کے علاوہ لندن میں بھی اشاعت کے لیے دیں اور خوب پیسے کمائے۔ سال ۱۹۴۱ء تک وہ اپنی اس ''بین الملکی'' مزاح نگاری میں خوب ماہر ہو چکا تھا۔ اس کی امریکی ماحول پر مبنی نگارشات لندن میں انگریز پڑھ کر لطف لیتے تھے جب کہ برطانوی معاشرے پر مبنی خاکے امریکی لوگ مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ یہ اس کے زرخیز ذہن اور زود نویس قلم کے باہم تال میل کی بات تھی۔ اس کی مزاحیہ تحریروں پر مبنی ایک فلم بھی بنی، اس کا نام تھا ''چار شادیاں اور ایک جنازہ'' جب کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں ووڈ ہاؤس کے ایک ابتدائی ناول پکاڈلی جم'' کو فلم بند کیا گیا۔ اس کی تحریر میں موجود مزاحیہ چتر کاری پردۂ سکرین پر کیسی نظر آئی اور فلم دیکھنے والوں نے کتنا حظ اٹھایا اس کے بارے میں اندازہ فلم بینوں نے خود لگایا ہوگا۔ مگر اس پر کوئی منفی نوعیت کی تنقید سننے میں نہیں آئی۔

جیسا کہ اوپر کہیں ذکر آیا ہے کہ ووڈ ہاؤس نے تھیٹر کے لیے بھی بہت کچھ لکھا بلکہ تجزیہ نگاروں کا یہ کہنا ہے کہ ووڈ ہاؤس کو بہت سے ادبی شہ پارے لکھنے کی تحریک تھیٹر کے لیے لکھی گئی اپنی تحریروں سے ملی یہ حقیقت ہے کہ تھیٹر کی جانب اس کا دلی رجحان بہت تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے صفحۂ قرطاس پر لکھنے کا فن بہت حد تک تھیٹر سے متاثر ہو کر اپنایا اور اسے نکھارا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تھیٹر سے حاصل کردہ تجربے کو اس نے اپنی کتابوں میں بھی برتا اور اس بات کا اندازہ ناقدانِ فن نے پہلے نہیں لگایا تھا۔ لندن کے قریب ویسٹ اینڈ میں براڈوے تھیٹر اس کی دل چسپی کا مرکز تھا۔ تھیٹر کے لیے اس کی ڈرامائی تحریریں کافی تعداد میں ہیں، ان میں میوزیکل یا غنائیہ ڈرامے بھی شامل ہیں مثلاً ''اوہ بوائے''، ''اوہ، لیڈی لیڈی'' اور ''شو بوٹ'' وغیرہ

پی جی ووڈ ہاؤس کی مزاحیہ نگارشات اور تھیٹریکل ڈراموں کی مقبولیت اور کامیابی کی باتیں اپنی جگہ، رنگ رنگ تحریروں کے اس خالق کی اپنی ذاتی شخصیت کے عجیب سے پہلو کا بھی یہاں ذکر ہو جائے اور وہ یہ کہ وہ کسی سے اپنی ملاقات کے دوران ہرگز کوئی پُر مزاح گفتگو نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت خشک مزاج تھا اور لہجہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کی طبیعت شگفتگی سے یکسر خالی ہے لگتا تھا کہ وہ ملنے والے سے باتیں نہیں کر رہا بلکہ اُسے ''پُرسا'' دے رہا ہے۔ ایک شگفتہ نگار کے قلم اور طبیعت میں تضاد کی بات آئی ہے تو یہاں پاکستان میں بھی چند ایک مزاح نگاروں کے بارے میں یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ مثلاً کرنل شفیق الرحمن نہ تو کوئی زیادہ اچھے مقرر تھے اور نہ ہی وہ کسی کے ساتھ اپنی دوبدو گفتگو میں شگفتگی کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے جب کہ ان کی کتابوں کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ ان کا دیوانہ تھا پڑھنے والا صفحہ در صفحہ اور سطر در سطر حظ اٹھاتا تھا اور وہ اپنے غموں کو بھول کر مسکراتا تھا کھلکھلاتا تھا۔ اسی طرح ابن انشا کے شگفتہ مضامین اور کالموں کا ایک عالم لوہا مانتا تھا مگر وہ چند ایک مخصوص دوستوں کے علاوہ ہر ایک سے فری نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تقریر بھی بس واجبی ہی ہوتی تھی، لہجے میں گنگناہٹ سی تھی، بعض دفعہ کہے ہوئے الفاظ مبہم سے ہو جاتے تھے۔ اس کے برعکس شوکت تھانوی کی لسانی پھلجھڑیاں لوگوں سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھیں، ان کے لکھے ہوئے ناول، مضامین اور کالم بہت شگفتہ ہوتے تھے۔ خیر یہ تو چند جملہ ہائے معترضہ تھے ہمارا اصل موضوع تو پی جی ووڈ ہاؤس ہے وہ زبان کا شہسوار، قلم کا بادشاہ تھا۔

پی جی ووڈ ہاؤس عوام کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ اُسے بات سے بات نکالنے اور مزاح پیدا کرنے کا فن بخوبی آتا تھا۔ وہ خوب سے خوب تر لکھتا رہا اور لوگوں میں مزاح کے خوشبودار پھول بانٹتا رہا۔ لوگ اس کی کتابوں کا انتظار کرتے تھے۔ ایک ادیب کی عوامی مقبولیت کا یہ رنگ بہت خوش کن ہوتا ہے۔ پی جی ووڈ ہاؤس کی بہترین تحریروں کا زمانہ عروج ۱۹۴۶ء-۱۹۱۶ء یعنی قریباً تیس سال کے عرصے میں ملتا ہے۔ اس دوران اس کی بہت سی کتابوں کو شہرت ملی، مثلاً

"چوزوں کا عشق باہمی"، "صبح کی سرخوشی"، "ملن کی بیلا"، "ایک بے وقوف کا دل"، "گرما کی آسمانی بجلی"، "آرچی کی نادانیاں" وغیرہ۔ اس دور میں اس کے قلم نے خوب جولانیاں دکھائیں اور بہت اچھے مزاحیہ کرداروں کو جنم دیا۔ مثلاً جیوس اور ووسٹر"۔

اپنے شاندار تحریری دور میں حاصل ہونیوالی شہرتوں اور ڈھیروں دولت کے باوجود ووڈہاؤس بہت لئے دیئے رہتا تھا، ہر وقت سنجیدگی کی چادر اوڑھے ہوئے۔ اس کی نجی زندگی پر ابہام کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں اس کے ایک سوانح نگار رابرٹ میک کروم کا، جو خود بھی صحافی اور ادیب ہے کہنا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ پی جی ووڈہاؤس نے مزاح کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا جیسے اس کی آڑ میں وہ خود کو چھپانا چاہتا ہو اس طرح کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے اُسے جان نہ لے یا اُسے سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہ کرنے لگے۔ اس کی زندگی اس بلی کی طرح تھی جو کبھی تھیلے سے باہر نہیں آئی۔ وہ ذاتی طور پر گم شدہ رہنا پسند کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کے سنجیدہ گوشے بس ڈھکے چھپے ہی رہیں۔ یہ اس کی شخصیت کا ایک عجیب سا پہلو تھا ورنہ آج کل کے دور میں تو ہر نامور ادیب، شاعر اور فن کار شہرت پانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ سوانح نگار میک کروم کا یہ بھی کہنا ہے۔ "مجھے ووڈہاؤس کی سوانح لکھتے ہوئے مزہ تو بہت آیا لیکن میں بہت مشکل میں بھی پڑا رہا"۔ وجہ وہی تھی یعنی اس کے تحریری مزاح کے پیچھے سنجیدگی کے دبیز پردے۔ اسی وجہ سے اس کی زندگی اور شخصیت کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ کسی بھی سیریس سوال کا کوڈ جواب نہیں ملتا تھا۔ ہاں اس کی تحریریں پڑھ پڑھ کر بس ہنستے رہو اور خوش ہوتے رہو اس کی ایک وجہ شائد یہ بھی ہو کہ سنجیدگی بعض دفعہ تکلیف دہ سوالات کو جنم دیتی ہے اور یہ سوالات دُرست جوابات مانگتے ہیں اور درست جوابات دردانگیز نتائج پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک خاص قسم کا لاابالی پن اور ہلکی پھلکی سوچ زندگی کو آسان سا بنا دیتی ہے خصوصاً اس وقت جب زندگی میں کچھ ناگفتہ بہ حالات پیدا ہو جائیں یا کچھ ناپسندیدہ کرداروں سے واسطہ پڑے تو پھر اس مشکل مسئلے کا حل وہی ہے یعنی مزاح نگاری، ہلکی پھلکی سوچ اور ڈھکا چھپا انداز زندگی۔

اوپر کہیں ذکر آچکا ہے کہ پی جی ووڈ ہاؤس بیحد بسیار نویس تھا۔ ایک پیشہ ور ادیب کو ایسا ہونا پڑتا ہے۔ اُسے اپنے فن سے لگن تھی کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی موضوع پر کم از کم پانچ سو الفاظ نہ لکھتا ہو، خواہ وہ ونیلا آئس کریم کی بات کر رہا ہو یا کسی کُشتی کے انعامی مقابلے کا ذکر کر رہا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر ووڈ ہاؤس ایک اور کام کرتا تھا اور وہ یہ کہ اپنی نثری تحریروں کو خوب اچھی طرح چھان پھٹک اور نظر ثانی کرتا۔ اس کا ایک ناول ''شکریہ جیوس'' ۱۹۳۴ء میں پہلی بار چھپا تو اس کے عام قاری نے محسوس کیا کہ ناول کے پہلے سو صفحات کے مطالعہ نے اسے کسی بھی کوشش کے بغیر بہت لطف دیا لیکن قاری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مصنف نے یہ صفحات محض دس دن کے بڑی عجلت کے ساتھ تحریر کیے لیکن پھر اس نے نظر ثانی کرتے ہوئے ان صفحات کو کم از کم تین چار بار لکھا۔ ناول کے باقی صفحات بھی اسی مرحلے سے گزرے لیکن یہ ایک ہی ناول کی بات نہ تھی ووڈ ہاؤس کا کہنا تھا کہ میں ایک اچھا نثری ٹکڑا لکھنے کے لیے کم از کم ایک لاکھ الفاظ لکھتا ہوں اور پھر ان میں سے صرف دس ہزار الفاظ چنتا ہوں۔ اُس کی اس بات سے نظر ثانی کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسے بسیار نویس ادیب کی زندگی بڑی بور سی ہوتی ہوگی کیوں کہ وہ تو ہر وقت اپنے ٹائپ رائٹر سے جُڑا رہنا پسند کرتا تھا، ہر وقت تنہا تنہا دن رات گزارنے والا لکھاری۔۔ جی نہیں، ایسی بات نہیں۔ ووڈ ہاؤس نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ وہ کھلی فضاؤں میں گھومنے پھرنے اور سیر و تفریح کا بہت دل دادہ تھا، اس نے یورپ اور امریکہ کی جی بھر کر سیر کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دوران سفر بھی ایک خاص ہم سفر اس کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ تھا اس کا ایک بڑا سا ''مونارک'' نامی ٹائپ رائٹر، اس کے علاوہ اس کا ایک پیارا سا طوطا اور ایک چھوٹا سا چینی نسل کا کتا بھی۔ مگر ان سب سے بڑھ کر اس کی عزیز از جان بیٹی اور وائف بھی ساتھ ہوتی تھیں۔

ووڈ ہاؤس بڑے رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا۔ یورپ اور امریکہ میں وہ جہاں بھی گیا تو بہت عمدہ

پرائیویٹ گھر کرائے پر لے کر رہائش رکھتا تھا یا پھر اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرتا تھا۔ اور یہ اُس شخص کی بات ہو رہی ہے جو عموماً بہت سادہ اور گمنام سی زندگی بسر کرنا پسند کرتا تھا۔ لیکن وہ جب چاہتا تھا زندگی کو بہت اچھی طرز سے گزارنا بھی جانتا تھا۔ وہ جوا کھیلنے کا رسیا تھا اُس نے ریس کا ایک گھوڑا پال رکھا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی دھائی میں وہ جب بھی امریکہ گیا اُس نے ہالی ووڈ ضرور وزٹ کیا۔ اس وقت کے بڑے بڑے فلمی اداکار اس کے دوست تھے مثلاً کلارک گیبل، ڈبلیوسی فیلڈ اور فریڈ آسٹیئر وغیرہ۔ وہ شو بز کے اس معروف شہر میں بیورلی ہلز ایسے فیشن ایبل علاقے میں ٹھہرتا تھا۔

زندگی کے یہ رنگ ڈھنگ پی جی ووڈ ہاؤس کے لیے ممکن تھے اس لیے کہ وہ شروع ہی سے بہت امیر کبیر تھا۔ اس وقت کے حساب سے اس کا شمار لکھ پتی لوگوں میں ہوتا تھا اور اس نے اپنے قلم کے ذریعے یہ خوش حالی حاصل کی تھی لیکن قسمت کی بات ہے اس کی یہ دولت ہی ایک دن اس کے زوال و مصیبت کا باعث بنی۔ اس کی کامیاب اور خوش حال زندگی گہنا گئی اس کی تفصیل ذرا طویل ہے اور تکلیف دہ بھی۔

یہ تیس کی دھائی کا زمانہ تھا۔ پی جی ووڈ ہاؤس قلم چلا رہا تھا اور اپنی معمول کی زندگی گزار رہا تھا مگر بات کچھ یوں ہوئی کہ لمبے ٹیکس کے بلوں سے بچنے کے لیے اس نے فرانس کے ایک چھوٹے سے ساحلی مقام لاتوکیت میں رہائش اختیار کر لی۔ اس وقت یہ مقام بہت امیر لوگوں کا شہر کہلاتا تھا کیونکہ یہاں جوئے خانے تھے، گالف کے میدان تھے اور اچھی خاصی رونق اور چہل پہل والی جگہ تھی۔ یہ شہر آبنائے انگلستان کے کنارے ایک اہم جگہ واقع تھا یہاں سے لندن اور ویسٹ اینڈ بڑی آسانی سے جایا جا سکتا تھا جب کہ بلجیئم کی سرحد بھی یہاں سے صرف سو میل دور تھی پھر یوں ہوا کہ ۱۹۳۹ء میں اچانک تاریخ نے پلٹا کھایا دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ مئی ۱۹۴۰ء میں جرمنی کے ہٹلر نے اپنے مشہور طوفانی حملے کا آغاز کر دیا۔ اس وقت بھی ووڈ ہاؤس بڑی بے فکری سے لاتوکیت میں ٹھہرا رہا۔ ان دنوں وہ اپنے مشہور داستانی کردار "جیوس" کو سامنے

رکھ کر ایک نیا ناول لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کا عنوان تھا ''صبح کی سرخوشی'' جو بعد میں کسی وقت اس کا شاہکار ناول کہلایا۔ تاہم وقت اور اس کے تقاضے بدل چکے تھے۔

ایک طویل دَورِ ابتلا کا آغاز ہو گیا تھا۔ ووڈ ہاؤس اور اس کی بیوی ایتھل جرمن حملے میں گھر گئے۔ فرانس کا شہر لاتوکیت جرمنوں کے قبضے میں آ گیا اور یوں یہ بے ضرر سا جوڑا جنگی قیدی بن گیا۔ چند ہفتوں کے اندر جرمنوں نے ان دونوں کو ''دشمن'' قرار دے کر اپر سلیشیا (آج کل پولینڈ میں ہے) میں ایک جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا۔ ووڈ ہاؤس پر حالات کی اس یک بیک اور خطرناک تبدیلی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے قید کے دوران اپنا ایک اور ناول ''بنک میں دولت'' مکمل کر لیا۔ یہ بھی ایک مزاحیہ ناول تھا اور اس میں اس کا ایک طنزیہ جملہ ''اگر یہ اپر سلیشیا' ہے تو پھر 'لوئر سلیشیا کیسا ہوگا'' بہت مشہور ہوا تھا۔ بہرحال جرمنوں کی دی ہوئی قید کا وہ زمانہ ووڈ ہاؤس کے لیے ذلت، رسوائی اور الزام در الزام کا ایک طویل دور لے کر آیا۔

اپر سلیشیا کے جنگی کیمپ میں پہنچنے کے چند ہفتوں بعد ہی ووڈ ہاؤس اٹھاون برس کا ہو گیا۔ تقریباً ایک سال بعد یعنی جون ۱۹۴۱ء میں جنیوا کنونشن کے تحت اُسے رہا کر دیا گیا قید کے دوران اُس کے حالات اور تاثرات کیا تھے، اس پر بات کرنے کے لیے اسے نازی ریڈیو پر بلایا گیا ریڈیو پر بولتے وقت ووڈ ہاؤس کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی، خوف معصومیت اور کچھ حماقت کی ملی جلی کیفیت میں اس نے وہ کچھ کہہ دیا جو اُسے نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ اس نے کہا ''نازی جرمنی میں اس کی زندگی کے دن کچھ ایسے بُرے نہیں ہیں'' نازی ریڈیو کا یہ پروگرام امریکہ اور برطانیہ کے لوگوں کے لئے نشر کیا جا رہا تھا۔ آج اس کی یہ بات پڑھی جائے تو کچھ یوں ہی سی لگتی ہے لیکن وہ جون ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا، خوفناک جنگ اپنے عروج پر تھی۔ ہٹلر کی فوجیں یورپ کو تہہ و بالا کرنے کے بعد بڑی کامیابی سے روس کے اندر گھستی چلی جا رہی تھیں اور ادھر یورپ کے جنوب میں بحیرہ روم کی طرف بڑھنے کے عزائم رکھتی تھیں۔ ایسے حالات میں برطانیہ میں ووڈ ہاؤس کی بات کا بہت بُرا منایا گیا، اُسے جرمنوں کا ''دوست''، ''غدار'' اور گوئبلز کا ''چمچہ'' کہا گیا اس کی کتابیں

تمام لائبریریوں سے نکال کر باہر پھینک دی گئیں اور بی۔بی۔سی سے نشر ہونیوالی اس کی تمام تحریروں پر پابندی لگادی گئی۔ یہاں تک کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اُس کی ''غداری'' کو زیر بحث لایا گیا تاہم جب جنگ عظیم اپنے اختتام کو پہنچی تو اس وقت تک ووڈ ہاؤس کے خلاف پایا جانے والا ہسٹریائی ردِّعمل دب گیا۔ وہ خود بھی جرمن ریڈیو پر کہی گئی اپنی بات سے ملول تھا اور سوچتا تھا کہ کاش وہ اپنا منھ بند ہی رکھتا۔ بہر حال ووڈ ہاؤس کی روائتی معصومیت کو تسلیم کر لیا گیا اور یوں وہ وطن واپسی پر گرفتاری سے بچ گیا۔

ایک بات ووڈ ہاؤس کے کریڈٹ پر ضرور جاتی ہے اور وہ یہ کہ جنگ کے بدترین اور ظالمانہ حالات میں بھی نہ تو وہ بددل ہوا اور نہ ہی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا بلکہ ایک بہادر شخص کی طرح اس نے جرمنوں کا سخت رویہ اور ظلم بڑی جی داری سے سہا۔ تاہم یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جرمن ریڈیو پر کہی ہوئی بات نے اس کی زندگی کو تباہ کر دیا۔ طرح طرح کے الزامات سن کر وہ پریشانی شرمندگی اور مایوسی کی حالت میں برطانیہ چھوڑ کر امریکہ چلا گیا اور خود ساختہ جلاوطنی کی زندگی اختیار کی اور پھر اس ''ہجرت'' کے تیس سال بعد اس نے ۱۹۷۵ء میں وہیں وفا پائی اور یوں وہ ادیب جس نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایک خاص پہچان بنائی تھی اور جسے ہر جگہ چاہا جاتا تھا، گم نامی کی موت مرا۔ اس کی تحریروں کو جو برطانوی اور امریکی ادب میں ایک خاص مقام بنا چکی تھیں یکسر بھلا دیا گیا۔ بلکہ انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ ووڈ ہاؤس کے نام اور اس کی تحریروں پر زمانے کی گرد پڑتی گئی۔

لیکن بالآخر ووڈ ہاؤس کی موت کے تیس سال بعد ایک برطانوی صحافی اور ادیب، رابرٹ میک کروم نے اس نابغہ ادیب کو ڈھونڈ نکالا اور س کی تحریروں سے گم نامی کی گرد جھاڑ کر پھر سے دریافت کیا۔ پانچ سالہ طویل محنت شاقہ کے بعد اس کی ایک مفصل سوانح حیات تیار کی اور انگریزی ادب کے قارئین کو یہ باور کرایا کہ ووڈ ہاس کی تحریریں زمان و مکاں کی قید سے ماورئی ہیں بلکہ حیرانی کی حد تک آج کے دور کے جدید تقاضوں کے مطابق ہیں۔ میک کروم نے اپنی

کتاب ''ووڈ ہاؤس کی زندگی'' میں واضح طور پر لکھا کہ یہ ادیب اپنی نگارشات کی صورت میں ایک بیش قیمت تحفہ ہمارے لیے چھوڑ گیا ہے اور پہلے کی نسبت ہمیں آج اس تحفے کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ یہ ہمیں خوش باشی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا درس دیتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ کتاب "Wodehouse--- Life" ۔ رابرٹ میک کروم، وائی کنگ پبلشرز لندن ستمبر ۲۰۰۴ء

۲ ماہنامہ ''اسکوائر'' نیشنل میگزین کمپنی، لندن ستمبر ۲۰۰۴ء

۳۔ انٹرنیٹ۔

زرِ تعاون کے لیے چیکوں کی ترسیل

جو کرم فرما سہ ماہی ''الاقرباء'' کو سالانہ زرِ تعاون اور اشتہارات کے سلسلہ میں بذریعہ چیک ادائیگی فرماتے ہیں وہ ازراہ کرم چیکوں پر مندرجہ ذیل عنوان تحریر فرمایا کریں

Quarterly Al-Aqreba, Islamabad

شاکر کنڈان

ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی شعری روایت۔ایک مطالعہ

جب ہم انگریزی کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اینگلو سیکسن ادب سے پیشتر ہمیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔اور یہ عہد ایسے ہے جیسے کل کی بات ہو۔ہاں! انگریزی ادب والے خود کو مغرب کا ایک حصہ گردانتے ہوئے قدماء کے اس عہد تک چلے جاتے ہیں جس کی ابتدا معلوم حوالے سے ہومر سے ہوئی۔لیکن ہومر کو ہم کسی صورت بھی انگریزی ادب کا نمائندہ نہیں کہہ سکتے۔

اینگلو سیکسن کے ہاں ہمیں غیر مذہبی اور مذہبی ہر دو طرح کا ادب ملتا ہے جبکہ یہی اثرات نشاۃِ ثانیہ سے ہوتے ہوئے نو کلاسیکیت اور رومانیت تک آ گئے۔رومانیت کا عہد اس سے کسی حد تک باہر نکلنے کی کاوشوں میں محو دکھائی دیتا ہے۔یہاں تک کہ دورِ تجسّس ایک نئی سوچ کی راہ ہموار کرتا ہے اور معروضیت کی بنیاد بنتا ہے۔یہاں جو اہم نام ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہے ٹی ایس ایلیٹ۔یعنی تھامسن سٹیرنز ایلیٹ۔

اس نام کو دہرانے کا مقصد ایلیٹ نام کے کئی ادیب اور شاعر یورپ کے ادبی ماحول میں اپنی اپنی انفرادیت منوا چکے ہیں۔جن میں سے چند ایک نام جو میری نظروں سے گزرے درج ذیل ہیں

سر جان ایلیٹ (۱۵۹۲ء۔۱۶۳۲ء)۔ جان ایلیٹ (۱۶۰۴ء۔۱۶۹۰ء)۔سر تھامس ایلیٹ۔ہربرٹ جیمز ایلیٹ۔میکسینا ایلیٹ (۱۸۷۱ء۔۱۹۴۰ء) چارلس ولیم ایلیٹ (۱۸۳۴ء۔۱۹۲۶ء) جارج ایلیٹ (۱۸۱۹ء۔۱۸۸۰ء) ٹی۔ایس ایلیٹ ایک اینگلو امیریکن شخصیت جو بحیثیت شاعر،نقاد،ڈرامہ نگار،اور مدیر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔۔کیا یہ سب کچھ ہونا ہی اُس کی شہرت کا باعث ہے؟ اگر

ایسی بات ہوتی تو یہ خصوصیات تو ہر عہد کے بہت سے لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہاں! جو بات ایلیٹ میں منفرد دکھائی دیتی ہے اور جس نے اسے طویل ادبی عمر عطا کی وہ ہے اس کا روایت سے منسلک رہتے ہوئے نئی راہیں تلاش کرنا، نئی جہتوں کو ڈھونڈنا اور اُن کا اظہار کرنا۔

ایک اور سوال جو یہاں پیدا ہو رہا ہے اور جسے ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ جب بات معیار و مقام کی ہوتی ہے تو سوالات جنم لیتے ہیں۔ جن کے جوابات میں مختلف خیالات سامنے آتے ہیں اور پھر ردوبدل بھی وقوع پذیر ہوتا ہے جسے ایلیٹ کی تحریر کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کوئی بھی فنی کام بغیر ترمیم کے کبھی مکمل نہیں ہوا۔ یہی ترامیم اور تبدیلیاں ٹی ایس ایلیٹ کی شہرت کا باعث بنیں اور انہیں کی بدولت ہم نہ صرف اس کے کام سے بلکہ شخصیت سے بھی واقف ہوئے۔

برنارڈ برگونزی (Bernard Bergonzi) کے مطابق ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ۲۶ ستمبر ۱۸۸۸ء کو سینٹ لوئیس مو میں پیدا ہوا (۲) لیکن ذکاء الدین شایاں نے سن ولادت ۱۸۸۱ء (۳) تحریر کیا ہے۔ جب کہ فہیم اعظمی نے تاریخ ولادت ۲۶ دسمبر (۴) لکھی ہے۔ کئی دیگر حوالوں کی طرح ''برٹش لٹریچر'' کے مولفین نے "T.S. Eliot was bron in 1888 and died in 1965" (۵) لکھ کر کام آسان کر دیا گیا ہے۔

''ٹی ایس ایلیٹ کے جدِ امجد اینڈریو ایلیٹ انگلستان کے شہر سامرسٹ سے ۱۶۷۰ء میں نقل مکانی کر کے امریکہ کے شہر بوسٹن میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے موچی تھے۔ ایلیٹ کے دادا گرین بیف ایلیٹ پادری تھے جو ۱۸۳۴ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد سینٹ لوئیس میں آباد ہوئے۔ وہ واشنگٹن یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔ واشنگٹن یونیورسٹی کو انہیں کے نام سے منسوب کیا گیا لیکن انہوں نے اس پر اعتراض کیا۔ گرین بیف ایلیٹ ۱۸۷۲ء میں اسی یونیورسٹی کے چانسلر مقرر ہوئے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے والد ہنری وارے ایلیٹ نے خاندانی روایات کے خلاف تجارت شروع کی۔'' (۶)

ٹی ایس ایلیٹ نے اسمتھ اکادمی سینٹ لوئیس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر ریاست میساچوسٹز کے شہر ''مٹن'' میں تقریباً چار سال زیر تعلیم رہا جہاں میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور پھر خاندانی روایت کے مطابق ۱۹۰۶ء میں ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں چار سال کی بجائے تین سال میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

ایلیٹ ۱۹۱۰ء میں فرانس چلا گیا جہاں سوربون (Sorbonne) یونیورسٹی پیرس میں چار سال تک فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ واپس آ کر دوبارہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مزید تعلیم کے لیے داخلہ لیا لیکن جنگ شروع ہونے کی وجہ سے ۱۹۱۴ء میں امریکہ کو چھوڑ کر انگلستان چلا گیا اور پھر مستقلاً اسی ملک میں رہائش اختیار کر لی۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک ایک تمثالی جریدہ ،دی ایگو اِسٹ، (The Egoist) کے عملۂ ادارت میں شامل رہا۔ اس جریدہ کی ادارت میں شامل ہونے سے پہلے یعنی ۱۹۱۵ء میں شادی ''ویوین ہے وڈ'' (Vivien Haigh Wood) سے ہو چکی تھی جس کے ساتھ پندرہ سال کا عرصہ سکون سے گزرا لیکن ۱۹۳۰ء میں وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی اور سترہ (۱۷) سال تک دیوانگی کی حالت میں رہنے کے بعد وفات پائی۔ اُس کی وفات کے بعد ایلیٹ نے دوسری شادی کی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ ویوین کے ساتھ شادی نے ایلیٹ کے لیے جو جذباتی مشکلات پیدا کیں اُن کے اثرات اس کی شاعری پر بھی پڑے۔ لندن میں اقامت کے بعد ایک استاد کے طور پر اور پھر ایک بینک میں کلرک کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (۷) کے مطابق اسی دوران وہ اپنے ہم وطن ایذرا پاؤنڈ سے ملا۔ جس نے اُس کی نظمیں پڑھنے کے بعد اس کی حوصلہ افزائی کی۔

ایلیٹ نے ۱۹۲۰ء میں ''دی کرائی ٹیرین'' (The Criterion) کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا۔ ۱۹۲۵ء میں اُس نے ایک اشاعتی ادارے ''فیبر اینڈ گویئر'' (Fabor & Gwyor) میں مدیر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی۔ بعد ازاں وہ اسی ادارے کا ڈائریکٹر بن گیا اور اس کا نام فیبر اینڈ فیبر (Fabar & Fabar) رکھ دیا۔ اسے ۱۹۲۷ء میں انگلستان کی شہریت مل گئی۔

ٹی۔ایس۔ایلیٹ کو ۱۹۴۸ء میں دنیا کے ایک بڑے اعزاز نوبل پرائز سے نوازا گیا۔اسی سال برطانیہ کا اعزاز ''آرڈر آف میرٹ'' بھی اس کے حصے میں آیا۔۱۹۶۴ء میں اسے امریکہ کا ''تمغۂ آزادی'' دیا گیا۔ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے ۷۷ سال کی عمر میں ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو لندن میں وفات پائی۔ (۷)

ٹی۔ایس۔ایلیٹ ایک شاعر، ایک نقاد اور ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور اس کی یہ تینوں جہتیں تینوں حوالوں سے ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔چونکہ اُس کی ادبی زندگی کی ابتداء شاعری سے ہوئی تھی۔اسی میں اس نے اپنے نظریات پیش کیے۔ڈرامہ بھی منظوم تحریر کیا۔اسی شعبے میں اعلیٰ ترین اعزازات سے نواز گیا۔لہٰذا اس کی پہچان بحیثیت شاعر دوسرے حوالوں پر اوّلیت کی حامل ہے۔اس کی شاعری کو مقبولیت بھی ملی اس کی تقلید بھی کی گئی اور قابل توجہ بھی گردانی گئی۔لیکن جب اس کی زندگی اور فن کا مطالعہ کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ شاعری کا فن اسے اپنی والدہ کی طرف سے ورثہ میں ملا۔چارلوٹ شیمپ سٹیرنز (Charlot Shamp Stearns) اپنے عہد کی ایک اچھی شاعرہ تھیں۔انہوں نے پندرھویں صدی کے اطالوی مصلح ''ساوُنارولا'' کے قتل پر ایک شعری تمثیل لکھی۔نیز چارلوٹ نے اپنے سُسر یعنی گرین بیف ایلیٹ کی سوانح حیات بھی لکھی۔یوں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شعر اور نثر دونوں کے اثرات والدہ کی جانب سے اس کی رگوں میں گردش کر رہے تھے۔مزید یہ کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں دورانِ طالب علمی اُس کے اساتذہ ''جارج سنتیانا'' اور ''ارونگ ریبٹ'' نے اس کی رہنمائی کی۔سنتیانا کا فلسفہ اور ایبٹ کا رومانیت مخالف رویہ ایلیٹ کی تحریروں کا حصہ بن گیا لیکن ماں کی جانب سے اُسے روایت کا جو شعور ملا تھا وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہا۔اُس میں مشکل تراکیب، انوکھی تلمیحات اور لطیف و پُر اسرار ترنم کے نمونے شامل کر کے ایک الگ راستے کے تعین کی جانب اُس نے قدم بڑھائے۔یوں وہ قدیم اور جدید، پرانے اور نئے خیالات یعنی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پُل کی حیثیت سے خود کو پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔یہ

درمیانی رویہ جو اُس کی معروضیت کا باعث بنا دراصل جارج سنتیانا کے فلسفے، اِروِنگ ریبٹ کے طرزِ فکر کی غیر مقبولیت بلکہ اس کے برعکس ایف۔ ایچ۔ بریڈلے اور ٹی۔ ایچ ہلمے سے ملاقاتوں کے باعث ایک درمیانی راہ تھی۔ جمیل جالبی، ایلیٹ کے اس رویے کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"ایک طرف تو وہ نئی شاعری کا نمائندہ ہے اور دوسری طرف وہ روایت کا بھی سختی سے پابند ہے اور بار بار اپنے کلاسیکی ہونے کا اظہار کرتا ہے۔(۸)

ایلیٹ نے خود بھی اپنے اس رویے یعنی روایت کے بارے میں اپنے ایک مضمون Tradition & The Individual Talent" (روایت اور انفرادی صلاحیت) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"Tradition is a matter of much wider significance. It can not be inherited, and if you want it you must obtain it by great labour. It involves, in the first place, the historical sense, which we may call nearly indespensable to any one who would continue to be a poet beyond his twenty-fifth year, and the historical sense involves a perception, not only of the pastness of the past, but of its presence; the historical sense compels a man to write not nearly with his own generation in his bones, but with a feeling that the whole of the literature of Europe from Honer and within it the whole of the literature of his own country has a simultaneous extistence and composers a simultaneous order." (۹)

ایلیٹ کا یہ کہنا کہ روایت میراث میں نہیں ملتی۔ راقم اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ورثہ میں کچھ نہ کچھ اثرات ضرور ملتے ہیں ہاں! اس کا یہ کہنا بجا کہ ریاضی کی اس میں ضرورت پڑتی ہے اسی طرح ادراک کی ضرورت خواہ تاریخی شعور ہو یا کوئی بھی موضوعی شعور ہو اُس میں پڑتی ہے۔ اسی

تحریر میں ایلیٹ اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلا سکا کہ لکھتے وقت اپنی نسل کے احساس کے علاوہ یہ احساس بھی ہو کہ یورپ کا سارادب ہومر سے لےکر اب تک اوراس ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے۔ اور یہ وہ ورثہ ہے جو کسی شخص کو اپنے اَب وجد سے ملتا ہے۔

بہر حال ٹی ایس ایلیٹ کی سوچ کی یہ پختگی اس کے فرانس کے قیام کے بعد کی ہے کیونکہ امریکہ میں قیام کے دوران ایک تو وہ کم عمری کے باعث اور دوسرا ماحول میسر نہ آنے کی وجہ سے خود کو ادب کی طرف مائل نہ کر سکا۔ نیز وہ جس الجھن کا شکار رہا اُس کا حل اسے فرانس میں ہنری برگساں (Henry Bargson) کے لیکچرز میں با قاعدہ حاضری سے ملا۔ لیکن اُس کی شاعری میں پختگی ایلن فورنیئر (Allen Fournier) سے با قاعدہ شاعری کے فنی علوم کے حصول سے ہوئی۔ عینی فکر کو برگساں اور فن کو فورنیئر نے پختگی دی۔ اسی دوران اُس نے فرانسیسی زبان پر عبور حاصل کیا۔ سوعلامتی تحریک سے منسلک شعراء کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ میں چارلس بودیلئر اور سٹیفن ملارمے جیسے شعرا شامل تھے۔ جنہوں سے متاثر بھی کیا۔

اس سے ایک بات جو واضح ہوتی ہے کہ ایلیٹ نے جب ادب میں قدم رکھا تو جو شعراء اور نقاد اُس کے رابطے میں تھے اُن میں سے اکثر رومانی تحریک اور اس کے مخالف فکری نظریات کے حامل تھے بلکہ رومانوی تحریک کے بانی روسو کی تعلیمات کے خلاف علم بغاوت لہرایا جا رہا تھا۔ رومانوی تصورِفن نے شاعر کی ذات اوراس کے تخلیقی عمل کو اہمیت دی تھی اور فن کے بجائے شاعر کی شخصیت اور اُس کی ذہنی ساخت کو ادب کے مطالعہ اور تجزیہ کے لیے اہم سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ سامنے آنے والے نئے حالات اپنے لٹریچر کے ساتھ اس کے بالکل برعکس تھے اور انہیں حالات اور رویوں کا پرچارک ایلیٹ بھی ہوا۔ ایلیٹ اپنے ابتدائی ایام کے بارے میں لکھتا ہے:

" When I was a young man at the Univeristy in America, just begining to write verse. keats was already a considerable figure in the world of poetry and his early period was well defined. I cannot remember that his

poetry at the stage made any deep impression upon me. A very young man who is himself stirred to write is not primarily critical or even widely appreciative He is looking for masters who will elicit his consciousness of what he wants to say himself or the kind of poetry that is in him to write."

امریکہ کے قیام کے دوران کی یہ بات اُس کے ابتدائی زمانہ کی ہے۔ جب وہ فرانس پہنچا تو اُس کے فکر میں تبدیلی آئی۔ اگر چہ امریکہ میں اُس نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ناقدین فن اس کی شاعری کی ابتداء کا زمانہ ۱۹۰۹ء بتاتے ہیں۔ اُس کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس کی شعری تصانیف کے سفر کو ہم ۱۹۱۷ء سے اُس کی آخری شعری تصنیف کی اشاعت ۱۹۴۳ء تک لیتے ہیں۔ اگر چہ ۱۹۴۳ء میں اس کا سفر ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد منظوم ڈرامے بھی اُس نے لکھے لیکن اس کا ذکر شاعر ہوتے ہوئے بھی ڈرامہ کی ذیل میں بہتر رہے گا۔

ایلیٹ کے جو شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے اُن میں " Prufrock and other Observation" پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں ایلیٹ کی کئی نظمیں شامل ہیں۔ لیکن اس کی پہلی نظم The love sang of J Alfred prufrock نے ایلیٹ کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا۔ یہ نظم ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان لکھی گئی۔ فہیم اعظمی کا اس نظم کے بارے میں کہنا ہے:

"چونکہ یہ نظم انگریزی ادب کے لیے بالکل جدید لہجہ اور معنویت کی حامل تھی اس لیے جریدہ "Poetry" کی ایڈیٹر مس منرو (Minro) نے اسے ایک سال تک روکے رکھا کیونکہ اسے یقین نہیں تھا کہ یہ شاعری ہے بھی یا نہیں۔" (۱۱)

ایلیٹ کہتا ہے کہ " شعر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کا سمجھنا ضروری نہیں" (۱۲) یہ الفاظ اگر چہ ایلیٹ کے ہیں لیکن یہ خیال اس کا نہیں۔ یہ اضافہ ہے روبرٹ گریوز کے الفاظ کا جس میں اُس نے کہا تھا کہ "میں نظمیں شاعروں کے لیے لکھتا ہوں۔ شاعروں کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں۔" اور پھر اس ابہام پسندی کو تقویت والری کے الفاظ نے دی جس کی تائید ایلیٹ نے کی بغیر اس التزام کے کہ شعر میں خیال کے ساتھ کچھ اور تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے

ہیں۔ جس میں اس کی بندش اور آہنگ بھی ہوتا ہے۔ نیز نفسِ خیال کا قاری کے ذہن میں آنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر جانس نے مابعد الطبیعیاتی شعراء کے بارے جو کچھ لکھا وہ ایلیٹ پر بھی پورا اترتا ہے کہ

"مابعد الطبیعیاتی شعراء صاحب علم وفضل تھے اور اُن کی ساری کوششوں کا مقصود اپنے علم وفضل کی نمائش تھی۔" (۱۳)

اِسی زمانے میں ایلیٹ نے مضامین لکھنے بھی شروع کر دیے تھے۔ ایک مضمون میں اُس نے اپنی شاعری میں مشکل پسندی اور ابہام کی توجیہہ میں لکھا کہ:

"ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ تمدن جیسا کہ وہ اس وقت ہے اس میں شاعروں کا مشکل پسند ہونا یقینی ہے۔ ہمارے تمدن میں بڑا تنوع اور بڑی پیچیدگی شامل ہے اور جب یہ تنوع اور پیچیدگی لطیف ادراک پر اثر انداز ہوتی ہے تو اس کے نتائج یقیناً متنوع اور پیچیدہ ہوں گے۔" (۱۴)

ایلیٹ اپنی نثری تحریروں میں اپنے ایسے ہی کہے ہوئے الفاظ کی معاونت کے لیے امیجز کی حمایت کرتا ہے اور تجربے کو عقلی زبان میں مکمل طور پر بیان کرنے سے معذوری اور امیجز میں اس کی مکمل اظہاریت کی بات کرتا ہے۔

ممکن ہے قارئین کو اور خاص کر ادب سے تعلق رکھنے والے ناقدین اور شعراء کو اس کے مضامین کی مدد سے اس کی شاعری سمجھنے میں کوئی مدد ملی ہو۔ لیکن پہلا مجموعہ جب شائع ہوا تو لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایلیٹ نے اپنی نظموں میں عہدِ وکٹوریہ کی جدید زندگی کی تلخیوں اور اس کے دردناک پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"پروفراک اور دیگر مشاہدات" کی دوسری نظم "Portrait of a lady" تھی جو ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی اور تیسری نظم جو ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی اس کا نام "Mr. Apollinax" تھا۔

ٹی ایس ایلیٹ کا دوسرا شعری مجموعہ جو منظرِ عام پر آیا اس کا نام "Poems" تھا۔ اس کی

اشاعت ۱۹۱۹ء سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ پہلی کتاب کی نظمیں، ۱۹۱۸ء میں لکھی جانے والی نظم "Sweeney-among the nightingales" اور اسی دوران لکھی جانے والی نظم " Gerontion" (برگِ خزاں) شامل ہیں۔

''سوینی۔ بلبلوں کے درمیان'' اور ''برگِ خزاں'' کے بارے میں ڈاکٹر حامد بیگ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''سوینی۔ بلبلوں کے درمیان، کی بنیاد ستارہ شناسی کا علم ہے اور تیکنیکی سطح پر تجرید کا ورتاراد یکھنے کو ملتا ہے۔'' ''اس نظم سے متعلق مذہبی حوالوں کا جو ایلیٹ کی وسعتِ مطالعہ کی پہچان رہی ہے کوئی ایک مخصوص رنگ نہیں اور نہ ہی ایلیٹ نے اس کے لیے کوئی خاص تگ و دو کی ہے۔'' (۱۵)

''برگِ خزاں'' (Gerontion) کو ناقدین عام طور پر مذہبی شاعری میں شمار نہیں کرتے کیونکہ اس نظم میں حوالے واضح نہیں ہیں۔ خاص طور پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مصلوب ہو جانے کے بعد کی نشانیوں اور ظہور کے حوالے سے۔ حامد بیگ نے اسے اس کسوٹی پر پرکھا ہے۔

''اس نظم میں توفیقِ خداوندی کے حصول کی خواہش کی گئی ہے۔ ایلیٹ کے مخصوص وقت کا تصور اس نظم میں موجود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نظم میں شاعر، وحشت کے اثر سے باہر نکلتا دکھائی دیتا ہے۔'' (۱۶)

ٹام پینی بھی ایلیٹ کے ناقدین میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں اُس کا کہنا ہے:

" His vast reading of religion and anthropology as well as Elizabethian poets and the latest French imagists left him writing completely new kind of English verse." (۱۷)

وہ ناقدین جو ایلیٹ کو مذہبی حوالے سے نہیں دیکھتے اُن کی سوچ پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی لیکن حقیقتاً اس نظم میں اس نے زندگی کو اس روپ میں دیکھا ہے جو موت سے ہم کنار ہوتی ہے۔ اُس نے اگرچہ عقیدے کی تلاش سے انکار بھی کیا ہے لیکن غالباً یہ محض ایک احتیاط تھی۔ وگرنہ وہ عقیدے کی پیروی اور کلاسیکیت کے رنگ میں چراغ اور ہوا کے رشتے سے انکار نہیں کرتا

اور یہ مذہب کا حصہ ہے عیسائیت میں بھی اور دیگر مذاہب میں بھی۔

" My life is light, waiting for the death wind like a feather on the back of my hand. Dust in sunlight and memory in corner what for the wind that chills towards the land" (۱۸)

جس نظم نے ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کی شہرت کو دور دور تک پھیلایا وہ تھی " The Waste land" (خراب آباد) اس نظم نے متنازع ہونے کی وجہ سے دونوں حوالوں یعنی عزت اور رسوائی میں شہرت پائی۔ بلکہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے اس شعر پر پوری اتری۔

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اس نظم کے بارے میں جہاں مثبت رویہ سامنے آیا وہاں منفی باتیں بھی تحریر کی گئیں۔ جس کا ذکر "Lexicon Universal Encyclopedia" میں بھی کیا گیا۔

یہ نظم ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی جس میں جدید یورپ کی روح کو رزمیہ انداز میں لفظوں کی شکل دینے کی ایک طاقت ور کوشش کی گئی۔ یہ نظم مغرب کے باسی کا نوحہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آنے والے وقت کا خیر مقدم بھی ہے۔ اس نظم کے پس منظر پر بات کرتے ہوئے عرش صدیقی نے لکھا:

''ایلیٹ نے خود کو محض عیسائی دنیا تک محدود نہیں رکھا۔ اس کا کمال یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں ملکی اور عالمی ہر دور کی روحِ عصر کا عکس ہے۔ جنگ کی لپیٹ میں پورا یورپ تو آیا ہی تھا ایشیا کے کئی دور افتادہ علاقے بھی اس سے بُری طرح متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ایک طرف انگلستان، روس، جرمنی، فرانس، چین، جاپان، ہالینڈ، امریکہ وغیرہ کا الگ الگ مسئلہ بھی تھا اور پوری دنیا کا مشترکہ مسئلہ بھی۔ اس لیے اس کے ہاں Waste Land صرف انگلستان کا کوئی شہر نہیں بلکہ دنیا بھر کے انتشار کی علامت ہے۔'' (۱۹)

یہ نظم ایک المیہ تھا، ایک ٹوٹ پھوٹ کی روداد تھی۔

"The Waste land" کی علامتیں، استعارے، اشاراتی نکتے اور نیا اسلوب و آہنگ رومانیت کے زیر سایہ پلنے اور بڑھنے والے ناقدین اور شعراء کے پلے جب نہ پڑا تو بحث نے مخالفت کا روپ اختیار کر لیا۔ جس کا اظہار ڈاکٹر ذکاءالدین شایان نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ایلیٹ کی شاعری میں مبہم، تاریخی اور مذہبی علامتوں کی فراوانی ہے۔ جن کے اصل مفہوم اوران کے در پردہ طنز کو پوری طرح سمجھنا دشوار عمل ہے۔'' (۲۰)

ایک مذاکرے میں ناصر کاظمی اس نظم پر اپنی بات کرتے ہوئے ایک عجیب کیفیت سے دوچار دکھائی دیتے ہیں وہ اپنی بات اس نظم کو بنیاد بنا کر اس طرح کرتے ہیں:

''اپنے زمانے کے ویرانے کی تصویر کشی کے چکر میں ہمارے مختلف شاعر انگلستان کی طرف نکل گئے اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی رسوائے عالم نظم ''ویسٹ لینڈ'' سے اثر لینے لگے۔ کچھ آج پر مخصوص نہیں۔ یہ نظم تو پندرہ بیس سال سے ہمارے شاعروں کے اعصاب پر سوار ہے۔ کچھ لوگ تو مغربی اسالیب اور نفسیاتی الجھنوں کے جنگل میں پھنس گئے۔ ادھر نظم کے لیے قلم اٹھایا اور اُدھر مغربی ارواح نے انہیں ستانا شروع کر دیا۔ باقی شاعروں پر ''ویسٹ لینڈ'' کا سایہ پڑ گیا تھا جس نے اب تک کسی کو پنپنے نہیں دیا۔'' (۲۱)

صرف ناصر کاظمی پر ہی موقوف نہیں، ساقی فاروقی نیز انتظار حسین کا رویہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''ایلیٹ صاحب کی ''ویسٹ لینڈ'' ہمارے ادب کے ویرانے کو شاداب نہیں کر سکی۔ ایلیٹ کا قصہ گل بکاؤلی کی جادوگرنی سے کم نہیں۔ ''ویسٹ لینڈ'' کیا لکھی ہے بلی کے سر پر چراغ جلایا ہے۔ ہمارا جو شاعر وہاں گیا۔ اس کا چراغ گل، بتی غائب ہوئی۔ بازی ہار داغی ہو کر گھر آیا۔'' (۲۲)

شاید اس نظم کے بارے میں متنازع ردِعمل نے ہی اسے شہرت سے ہم کنار کیا۔ اور سمجھ میں آنے

نہ والے پہلوؤں نے اسے موضوعِ بحث بنا دیا۔

''ویسٹ لینڈ'' پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ جن کے نام ہیں:

۱۔ Burial of Dead (مردے کی تدفین)

۲۔ A Game of Chess (شطرنج کی بازی)

۳۔ Fire Sermon (آتشیں وعظ)

۴۔ Death by water (پانی سے موت)

۵۔ What the thunder Said ? (بجلی کی کڑک نے کیا کہا؟)

"The Waste Land" پر ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں نے تفصیلی بحث کی ہے اور اس پر اپنی تنقیدی سوچ کو منفی رُخ اختیار کرنے سے روکے رکھا ہے۔ وہ اس نظم کو موجودہ عہد کے تناظر اور تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

''ہم ویسٹ لینڈ کو موجودہ عہد کا مرثیہ اور سمٹا ہوا علامتی رزمیہ کہہ سکتے ہیں جس میں ماضی کے تاریخی کردار اور گزرے ہوئے ماحول کی فنا پذیر اقدار کو ایلیٹ نے شدت کے ساتھ اپنے زمانے سے مربوط کیا ہے۔ اس نظم کا اہم عنصر اس کا تغزل آمیز شعری اسلوب ہے جو قاری کے وجدان کو متحرک کرتا ہے۔ طنز، ڈرامائی لہجہ، فطرت کے رنگا رنگ مظاہر۔ شاعر سب سے کام لیتا ہے اور انسانی نفسیات اور جنسی محرکات کو ضابطہ بند اخلاقیات میں نہیں چھپاتا۔ بلکہ اُن کا اشاراتی استعمال جانتا ہے۔'' (۲۳)

ویسٹ لینڈ کا تیسرا حصہ یا تیسری نظم ''آتشیں وعظ'' ہے یہ نظم لندن کی زندگی کو منعکس کرتی ہے۔ اس نظم کے چند مصرعوں کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔ جس سے اس کے صوتی تغزل اور معنوی آہنگ کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

''دریا کا خیمہ ٹوٹا ہوا ہے

پتے کو آخری انگلیاں

پکڑتی ہیں اور بھیگے ہوئے ساحل کے اندر ڈوب جاتی ہیں
ہوا بھورے میدان کو پار کرتی ہے
بغیر سنائی دیئے ہوئے جل پریاں رخصت ہوگئی ہیں
اے شہریں ٹمیز! آہستہ آہستہ بہتے رہو جب تک میں اپنا گیت ختم کروں
دریا کے پاس کچھ نہیں، نہ خالی بوتلیں، نہ گوشت آمیز روٹی کے کاغذ،
نہ ریشمیں رومال، نہ کارڈ بورڈ کے ڈبے، نہ سگریٹوں کے کنارے
اور نہ گرما کی راتوں کا کوئی اور ثبوت۔۔۔جل پریاں رخصت ہوگئی ہیں"

ویسٹ لینڈ عجیب سے حالات میں لکھی گئی۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کی بیوی جب سخت بیمار تھی اور وہ مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ نیز کام کی زیادتی سے جسمانی اور ذہنی طور پر وہ مضمحل ہو چکا تھا اور بحالی صحت کے لیے سینی ٹوریم میں داخل تھا۔ یہ نظم ان دنوں کی تخلیق ہے۔

"برٹش لٹریچر" میں انہی ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

" His wife's illness, their financial difficulties and his long workday took a physical and mental toll on him, and at the age of thirty three he was close to collapse. While resting for a few months in a swiss sanitorium he worked on " the Waste land" a long poem about the spiritual break down of the modern world. It proved to be one of the most influential poems of the twentieth century. " (۲۴)

"دی ویسٹ لینڈ" کے بعد ایلیٹ کی کئی مزید شعری تخلیقات شائع ہوئیں جن میں سے مشہور ہونے والی نظمیں چند ایک تھیں۔ جن کے بارے میں مطالعہ کرنے والے قارئین جانتے ہیں۔

جیسے

Animila (۳) Journey of the Magi (۲) Ash Wednesday (۱)

Coriolan (۶) Two Chorses from the Rock (۵) Marina(۴)

Hollow Man (۹) The Preludes (۸) Land Scapes (۷)

''دی ویسٹ لینڈ'' کے بعد ایلیٹ کی جس تصنیف کو پذیرائی ملی وہ ہے ۱۹۴۳ء میں شائع ہونے والی اُس کی نظم "Four Quartets" (چہار آہنگ) اس نظم نے مذہبی شاعری کے حوالے سے خاصی توجہ حاصل کی۔ اس نظم پر بھی ایلیٹ کا دعویٰ کہ ''شعر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کو سمجھنا ضروری نہیں'' صاد ہوتا ہے۔ جس پر محبوب خزاں کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

اُس بات کی عظمت نظر آتی ہے عموماً　　جس بات کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا

اور شاید اسی وجہ سے Four Quartets بھی ایک عظیم نظم ہے۔ اس نظم کے چار حصے ہیں۔

(۱۹۴۰ء) East Coker (۲) (۱۹۳۶ء) Burnt Norton (۱)

(۱۹۴۲ء) Little Gidding (۴) (۱۹۴۱ء) The dry Salvages (۳)

یہ نظم ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوتی رہی اور پھر ۱۹۴۳ء میں کتابی صورت میں سامنے آئی۔ ایلیٹ کو ۱۹۴۸ء میں اسی نظم پر ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔

اس نظم کے چاروں حصے باہم مربوط بھی ہیں اور الگ بھی۔ جب انہیں مربوط دیکھتے ہیں تو ایک ہی سلسلہ دکھائی دیتا ہے ہے لیکن جب چاروں کو علیحدہ رکھ کر پرکھتے ہیں تو چار سلسلے نظر آتے ہیں۔ یہ نظم اپنے اندر نئے آئیڈیاز اور جدید نکات لے کر آئی۔ سکاٹ جیمز کے مطابق:

"In these four poems we have reflective writing of a high order turned into vision by imagination. We find philosophic statement and poetic images so welded togather that we cannot say which is the poetry, for the two become one. (۲۵)

قبل ازیں بائبل اور خاص طور پر توریت کی تعلیمات انگریزی شاعری میں مذہب کے حوالے سے اِس کا حصہ بنتی رہی ہیں۔ جس سے دیگر مذاہب کی تعلیمات، اخلاقیات یعنی کہ آفاقیت کا اُن کی مذہبی شاعری میں فقدان پایا جاتا تھا۔ لیکن ''فور کوارٹیٹس'' میں شاعری عیسائیت کی امیجری یا روایت سے آگے نظر آتی ہے۔ اس میں جہاں دیگر مذاہب کی اخلاقیات کو علامات سے اجاگر کیا گیا ہے وہاں کرشن مہاراج کے حوالے سے بھی کہا گیا ہے کہ ''مستقبل ایک مدھم گیت کے مانند ہے۔ اُن لوگوں کے لیے جو پُر امید رہتے ہیں'' وہ مزید لکھتا ہے۔

''مسافرو اور ملاحو!

تم جو گھاٹ پر اترو گے اور

تم، جن کے جسم سمندر کے فیصلے سہیں گے

یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی، یہ تمہاری منزل ہے

کرشن نے ارجن سے میدانِ جنگ میں کہا

الوداع ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ بلکہ آگے بڑھو

مسافرو ! (۲۶)

اسی طرح ایلیٹ کی اس نظم میں ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی تہذیب پر واضح طور پر لکھا گیا ہے۔ جیسے

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے

تند مزاج، غصیلا

اپنے موسموں اور اپنے غیض و غضب کا مالک، تباہ کن

وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے

جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں''

یونانی تہذیب میں دیوتاؤں سے متعلق زیادہ واقفیت نہ ہونا آگے چل کر ایک فلسفے کی

صورت اختیار کر لیتا ہے جسے ہم قرۃ العین حیدر کے ترجمہ میں درج ذیل الفاظ میں دیکھتے ہیں!

"وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے
خاتمہ کہاں ہے۔۔۔ بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا
جو چُپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے؟
خاتمہ کہیں نہیں ہے، صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھٹتا ہوا تسلسل
ہم نے قرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا" (۲۷)

یوں جیسے جیسے یہ نظم آگے چلتی ہے فلسفہ الجھتا جاتا ہے اور قاری ان علامات اور تصورات کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس نظم میں اُس نے ایک الگ سی کوشش ضرور کی ہے لیکن جہاں تک آفاقیت کی بات ہے وہ اس میں بھی نظر نہیں آتی۔ ہاں عیسائیت تک کی بات تو تاریخ اور معروضیت کے حوالے سے ملتی ہے لیکن اس سے آگے کے تسلسل کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور اسلام جو ایک آفاقی دین ہے اس کا ذکر نظم کے تسلسل میں کہیں نہیں ملتا۔

ایلیٹ نے اس نظم میں فن پر بھی توجہ دی ہے۔ اس میں روایت پرستی کا رجحان بھی ملتا ہے جسے تصورِ روایت کہا گیا ہے۔ معروضیت اور علامات کا ذکر تو ہو چکا لیکن رومانیت سے بغاوت بھی اس نظم میں موجود ہے۔ جب کہ مذہب کی فوقیت کا اظہار اور آفاقیت کی طرف پیش قدمی کی کوشش بھی شامل ہے۔ اس نظم میں اُن سے آگے بڑھ کر تصورِ زماں پر بھی بات کی گئی ہے۔ جس کے بارے میں مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

"اس نظم کی دوسری نمایاں بات یہ ہے کہ یہاں ایلیٹ کے مخصوص وقت کا تصور

(تصورِ زماں) وہ نہیں جو اس کی دیگر تمام نظموں میں پایا جاتا ہے۔ یعنی وقت کا مستقیمی تصور اس نظم میں دکھائی نہیں دیتا۔ اور یہ بات کچھ کم اہم نہیں۔'' (۲۸)

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ 'Four Quantets' کے بارے میں ناقدین کی رائے ملی جلی کیفیت کی حامل تھی۔ لیکن یہ اس کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جب کہ اس نظم کو سمجھنا مشکل تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی ایلیٹ کے عہد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نظم کو سمجھنا وقت طلب قرار دیا ہے۔ لیکن محمد حسن عسکری نے اسے دوسرے پہلو سے دیکھا ہے۔ اُن کا کہنا ہے:

''ایلیٹ کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ Four Quartets میں جب منظر پیش کرتا ہے تو اس کو ایک بھوت نظر آتا ہے اور اس کے آگے وہ معنی بیان کرنے لگ جاتا ہے تو دونوں کا آپس میں ربط کہیں کمزور پڑ جاتا ہے۔'' (۲۹)

دراصل یہ ساری بحثیں جو ہمارے ہاں اس نظم سے متعلق چلتی رہیں۔ یہ گراہم ہُف کے اس مضمون سے نکلیں جو Vision Doctrine in Four Quartets کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں گراہم ہُف نے 'Killing Suspension of Disbelief' کا ایک نظریہ پیش کیا تھا۔ جس میں ایلیٹ کی مذہبی شاعری کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

اس نظم کا پہلا حصہ برنٹ نارٹن ہے۔ دراصل یہ ایک دیہی ٹھکانے کا نام ہے۔ جہاں ایلیٹ نے ایک بار قیام کیا تھا۔ نظم کے اس عنوان سے نظم کے مضمون کا کوئی معنوی ربط دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ زمان و مکاں کے فلسفے پر جو بات کی گئی ہے اُن اشعار کا ترجمہ شان الحق حقی نے کیا ہے۔ جس کا ابتدائی بند پیش کیا جاتا ہے۔

''زمانِ حال اور زمانِ رفتہ
ہیں دنوں شاید کہ آنے والے زماں میں موجود
اور آنے والا زماں تھا موجود جانیوالے زماں کے اندر
ہے گر زماں اک وجودِ دائم

تو کیا بھلا ذکرِ باریابی

گمان اُس کا کہ کیا تھا ممکن جو ہو نہ پایا بس اک گماں ہے

رہے گا جو دائماً اک امکاں

درونِ یک عالمِ خیالی

گمانِ ممکن، ظہورِ واقع، وہ جو کہ ممکن تھا اور وہ جو کہ آن گزرا

ہیں ایک حاصل پہ مرتکز جو ہمیشہ موجود و مستقل ہے

خیال میں گونجتی ہے قدموں کی چاپ اک ایسے راستے پر

کہ جس سے گزرے نہ تھے کبھی ہم

جو ہیں رواں ایک در کی جانب

کہ جس کو ہم نے کبھی نہ کھولا، وہ در جو کھلتا ہے گلستاں میں

مرے بھی الفاظ گونجتے ہیں اسی طرح ذہن میں تمہارے"

اسی طرح اس نظم کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں تو زمان و مکاں کے فلسفہ میں جہاں الجھنیں پیدا ہوتی ہیں وہاں کچھ گتھیاں سلجھنے کا بھی ادراک ہوتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں 'Four Quartets' پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

"Four Quartets" is a sustained meditation on the meaning of time in men. lives and its relation to eternity . It is a work of the most elaborate yet harmonious structure, full of subtle thought illuminated by imagery of great beauty and force. No other poet of those years could bring as Eliot brought in ' Four Quartets ', such a sanse of the past and its accumulated intellectual and imaginative experience to bear upon the present. Even those who disagreed with Eliot's philosophic position were obliged to yield tribute to the technical power of the work." (۳۱)

' Four Quartets ' کے بعد ٹی ایس ایلیٹ کا ایک اور شعری مجموعہ شائع ہوا۔ جس کا نام 'Collected poems' رکھا گیا۔ اسے ہم اردو میں کلیات کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۳ء میں اشاعت پذیر ہوا جس میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۶۲ء تک کی پوری شاعری کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ لیکن منظوم ڈرامے علیحدہ کتابی صورتوں میں شائع ہوئے۔ وہ اگرچہ نظم تو ہیں لیکن انہیں ایلیٹ کی شعری حیثیت سے صرف اس لیے علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ اگر اُن ڈراموں کو شعر کے ذیل میں رکھ دیا جائے تو ڈرامانویس کی حیثیت منہا ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی تینوں ادبی جہتوں کو آج تک الگ الگ حیثیت سے بحال رکھا گیا ہے۔

اگرچہ ایلیٹ کی شاعری موضوع بحث تھی لیکن اُس کے دوسرے کام پر بھی جس میں تنقید اور ڈرامہ شامل ہے ایک طائرانہ نظر اُس کی کتابوں کے عنوانات کے حوالے سے ڈال لینا اُس کے پورے کام کے بارے میں علم حاصل کرنے کے مترادف ہے سو ایلیٹ کی ۹ کتب تنقید اور ۴ کتب ڈراموں کی شائع ہوئیں۔

تنقیدی کتب:

(۱) The sacred wood. 1920 (۲) Selected Essys. 1932

(۳) The use of poetry and the use of criticism 1933

(۴) Elizabethan Essys 1934 (۵) The Idea of the christian society 1940

(۶) Notes towards the definition of culture 1948

(۷) Poetry and Drama 1953 (۸) Essays on Poets and Poetry 1957

(۹) To criticise the critique. 1966

یہ فہرست ڈاکٹر جمیل جالبی نے دی ہے لیکن اس کے علاوہ ایک کتاب جو اس دوران میرے زیرِ نظر رہی وہ Selected Essays کا ۱۹۵۲ء کا ایڈیشن ہے۔ جس میں ۱۹۳۲ء کے ایڈیشن سے چند مضامین زائد ہیں۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی نے رائدین جدیدیت میں ایلیٹ کی تنقیدی کتب کی تعداد بارہ لکھی ہے۔ جن میں شاید کچھ مطبوعہ مضامین کو اضافی شامل کر دیا گیا ہے۔

ڈرامہ کی کتب میں بھی مندرجہ بالا دونوں ناقدین کی دی گئی فہرست میں اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف تعداد، اسماء اور اشاعت کے سنین تینوں حوالوں سے ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر جمیل جالبی کی فہرست کے مطابق ڈراموں کی کتب کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) Sweeney Agonistes 1932 (۲) Murder in Cathedral 1935 (۳) The Family Reunion 1939 (۴) The Cocktail Party 1950 (۵) The Confidential Clerk 1954 (۶) The Elder Statesmen 1958

ایلیٹ چونکہ نئے نظریات کا شاعر اور نقاد تھا جسے بغاوت کا شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اُس نے شاعری میں کئی ایسی بحثیں چھیڑیں جو ناقدین کا موضوع بحث بن گئیں اور اُن حوالوں سے بہت کام ہوا۔ انگریزی یا دیگر زبانوں میں جو کام ہوا وہ الگ لیکن اردو زبان میں جو اس کی پذیرائی ہوئی اُس پر ڈاکٹر حامد بیگ نے تفصیل سے بات کی ہے لیکن کچھ نام ان کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکے جو نیچے دی گئی فہرست میں شامل ہیں۔ چونکہ تنقید اور ڈرامہ میرے اس موضوع میں بنیادی طور پر شامل نہیں لہٰذا ایلیٹ کی شاعری پر اردو میں جو کام ہوا اور جو میرے علم میں ہے وہ درج ذیل ہے۔

۱۔ The Waste Land (خراب آباد) ترجمہ عزیز احمد۔ ماہنامہ اردو، آکسفورڈ۔ جنوری ۱۹۳۷ء

۲۔ اس نظم کے دو تراجم مزید ہوئے احسن کلیم نے ساٹھ کی دہائی میں اور رفیق خاور، مطبوعہ تخلیقی ادب، کراچی مرتبہ مشفق خواجہ۔ شمارہ نمبر ۴

۳۔ Four Quartets (چہار آہنگ) ترجمہ: قرۃ العین حیدر، مطبوعہ: ماہنامہ افکار کراچی۔ شمارہ نمبر ۱۶۳، ۱۹۵۶ء دوسری بار، جوبلی نمبر ۱۹۷۰ء

۴۔ Four Quartets کے پہلے حصے Burnt Norton، ترجمہ: شان الحق حقی، مشمولہ درپن درپن از شان الحق حقی، مطبوعہ ۱۹۸۵ء

۵۔ Ash Wednesday (چہار شنبہ مبارک) ترجمہ: سید فیضی، مطبوعہ: نقوش، لاہور، شمارہ ۱۰۲۔ ۱۹۶۵ء

۶۔ Ash Wednesday (بازگشت) ترجمہ: رفیق خاور، مطبوعہ، تخلیقی ادب، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۵ء

۷۔ Boston Evening Transcript (بوسٹن کی شام کی خبر) ترجمہ: ناصر کاظمی، ماہنامہ نصرت، لاہور

۸۔ Gerontion (برگِ خزاں) ترجمہ: رفیق خاور، مطبوعہ: تخلیقی ادب، کراچی، شمارہ نمبر ا، ۱۹۸۰ء

۹۔ "Land Scapes" (شہر بہ شہر) ترجمہ: رفیق خاور، مطبوعہ: تخلیقی ادب، کراچی، شمارہ نمبر ا، ۱۹۸۰ء

۱۰۔ Land Scapes (تناظر) ترجمہ: ادیب سہیل، مطبوعہ: ماہنامہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۹۴ء

۱۱۔ 'Preludes' (طوفانی رات) ترجمہ: رفیق خاور، مطبوعہ: تخلیقی ادب، کراچی، شمارہ نمبر ا، ۱۹۸۰ء

۱۲۔ Sweeny. Among the Nightingales (سوینی، بلبلوں کے درمیان) ترجمہ: رفیق خاور، ایضاً

۱۳۔ Marina (مرینا) ترجمہ: رفیق خاور، ایضاً

۱۴۔ Journey of Magi (مغاں کا سفر) ترجمہ: رفیق خاور، ایضاً

۱۵۔ The love song of J. Alfred Prufrock (جے ایلفرڈ پروفراک کا محبت کا گیت) ترجمہ: احسان اکبر، مطبوعہ: نیا دور کراچی۔ شمارہ ۸۳۔۸۴

۱۶۔ The love song of J Alfred Prufrock (سازِ بے سوز) ترجمہ: رفیق خاور، مطبوعہ: تخلیقی ادب، کراچی، شمارہ نمبر ۵، اکتوبر ۱۹۸۵ء

۱۷۔ The love song of J. Alfred prufrock (جے ایلفریڈ پروفراک کا نغمۂ محبت) ترجمہ: انیس ناگی، دانشور، لاہور، شمارہ نمبر ۱

۱۸۔ Two Choruses from the Rock (سپاسِ سرمدی) ترجمہ: رفیق خاور، مطبوعہ: تخلیقی ادب، کراچی، شمارہ نمبر ۵، اکتوبر ۱۹۸۵ء

۱۹۔ The Rock (نورِ غیب) دوسرے کورس کا ترجمہ: شان الحق حقی، مشمولہ ''درپن درپن'' ۱۹۸۵ء

۲۰۔ The Waste Land سے اقتباسات کا ترجمہ: جن میں شطرنج کا کھیل، آتش وعظ، مردے کی تدفین، پانی کے کنارے موت۔ اور بجلی کی کڑک نے کہا، یعنی پانچوں نظموں کے کچھ حصوں کا ترجمہ: ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں مطبوعہ سہ ماہی تسطیر لاہور اپریل تا ستمبر ۲۰۰۰ء، اکتوبر ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء (دو شمارے)

۲۱۔ Hollow Men (کھوکھلے آدمی) ترجمہ: ادریس بابر، مطبوعہ: ماہنامہ آثار اسلام آباد۔ شمارہ ۵۔ ۱۹۹۹ء مرزا حامد بیگ اور جمیل جالبی کی کتب الگ ہیں۔ نیز ان کے علاوہ بھی ایلیٹ کی شاعری کے ترجمے اور تنقیدی حوالے سے اکٹھا کام بھی ہوا جسے تنقیدی عمل کے باعث شاعری سے الگ رکھا گیا ہے۔

T.S. Eliat کی تنقید نے تو ناقدین فن کو سوچنے اور لکھنے پر مجبور کیا ہی۔ اُس کے تصورات اور رمزیت نیز فکر کے متنازع پرتوں نے ہمارے ہاں کے اردو شعراء پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے جس کا اندازہ ایلیٹ کی تمام شعری تصانیف کو بغور پڑھنے کے بعد اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردو کے شعراء کا مطالعہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کے کئی شعراء نے ایلیٹ کی فکر سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں۔ ممکن ہے ایلیٹ کو پڑھنے کے بعد نادانستہ طور پر اس کی فکر ان شعراء

کے کلام میں در آئی ہو۔ ناقدینِ ادب نے ایسے کچھ نام گنوائے ہیں جن میں سے چند ایک کا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)۔ن۔م۔راشد حسنِ کوزہ گر، ایران میں اجنبی، لا۔انسان (۲) مجید امجد۔ مرے خدا مرے دل، نہ کوئی سلطنتِ غم نہ اقلیم طرب (۳) ضیاء جالندھری۔ خزاں، سرِ شام، زمستاں کی شام (۴) صفدر میر۔راکھ کا ڈھیر (۵) مختار صدیقی۔ موہن جودڑو (۶) رضی ترمزی رستہ خیز درخشاں (۷) شمس الرحمان فاروقی۔ بودلیئر اور ایلیٹ کے لیے حقیر تحفہ (۸) آفتاب اقبال شمیم۔ بے انت کا سپنا، میں ابد ہوں، نہیں اور ہاں سے آگے، دھوپ اور دھند (۹) شہر یار۔ اسمِ اعظم کی متعدد نظمیں (۱۰) اختر حسین جعفری۔ آئینہ خانہ (۱۱) وحید اختر۔ مٹی کی صدا (۱۲) افتخار جالب۔ قدیم بنجر (۱۳) مخمور سعیدی۔ ہوا کو نہ روکو (۱۴) ساجدہ زیدی۔ سمندر کے سینے کے خاموش اسرار (۱۵) زبیر رضوی۔ بشارت پانی کی (۱۶) پریم وار برٹنی۔ کتبے (۱۷) راج نرائن راز۔ آبروئے شیوۂ اہلِ نظر۔

جب کہ یہی قبول و اثرات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہوا ہمارے عہد کے دیگر کئی شعرا تک آتا ہے اور اُن کی غزلوں میں ایلیٹ کی فکر کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

دوبارہ یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ استفادہ ممکن ہے دانستہ نہ ہو۔ ہو سکتا ہے ان شعراء نے ایلیٹ کو پڑھا تک نہ ہو۔ یہ سوچ کا عمل ہے اور ذہنی اشتراک سے مفر نہیں۔ یہ کہیں بھی ہو سکتا ہے ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے دو اشخاص ایک ہی وقت میں ایک ہی بات سوچ رہے ہوتے ہیں اور انہیں قرطاس پر بھی منتقل کر رہے ہوتے ہیں۔ ہاں! اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے خیالات اور اُس کی فکر نے دنیائے شعر کے کئی شعراء کی سوچ بدل دی۔ نیز روایت سے جرأت اور اس کی روشنی میں آئندہ کی سوچ اپنا کر تصورِ زماں کا جو نظریہ دیا۔ بعد میں آنے والوں نے اس پر بھی سوچا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم اُس کے فکر و فن اور نظریات کو نہ صرف موضوعِ بحث بنائے ہوئے ہیں بلکہ اُن پر سوچ کے دائرے کو

وسعت دیتے ہوئے کئی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور آج لوگ اُس کے اپنے دور میں نہ سمجھ میں آنے والے خیالات کو سمجھنے کی کوشش اور سمجھانے کے عمل میں محو ہیں۔

ماخذات

۱۔ R.A. Scott James, fifty years of English Literature (1900-1950) Longman's Green & Co.London, 1951 p.150

۲۔ Lexicon Universal Encyclopedia vol.7 Lexicon publication Inc.New Yark, ed: 1987, p:139

۳۔ ذکاء الدین شایاں، ڈاکٹر، ایلیٹ کی شاعری۔ ماضی اور مذہب کا مسئلہ، مشمولہ سہ ماہی تسطیر، لاہور، اپریل تا ستمبر ۲۰۰۰ء ص ۱۸۵

۴۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر، رائدین جدیدیت، مکتبہ صریر فیڈرل بی ایریا، کراچی، ۲۰۰۲ء، ۳۱۶

۵۔ Beverly Ann Chin & Others, British literature. Mc Graw Hill, New York, 2003, p.1072

۶۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر، رائدین جدیدیت، ایضاً ص ۳۱۶

۷۔ R.A. Scott James, Ibid

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، بار ہفتم، ۲۰۰۳ء، ص ۴۸۵

۹۔ T.S.Eliot, Selected Essays, Faber & Faber limited London, 3rd ed, 1951, p.14

۱۰۔ B.C. Southam, A selection of critical essays, The Macmillan press Ltd. London, 1978. p.48

۱۱۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی، رائدین جدیدیت، ایضاً ص ۳۱۷

۱۲ نظیر صدیقی، اردو ادب کے مغربی دریچے، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، بار دوم، ۱۹۸۸ء ص ۲۱

۱۳ ایضاً ص ۲۵

۱۴ ایضاً ص ۲۸

۱۵ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، ایلیٹ کا اردو دنیا میں خیر مقدم، مشمولہ: ماہنامہ کتاب، اسلام آباد۔ جون ۲۰۰۰ء، ص ۴۴

۱۶ ایضاً ص ۴۵

۱۷ Tom payne, A to Z of Great Writers, Carlton Books limited Dubai, 1997. p-115

۱۸ Hugh Kenner, Eliot Moral Dialectic, from A selection of Critical essay, Edited by B.C. Southam, ibid, p.106

۱۹ عرش صدیقی، ٹی ایس ایلیٹ میرا پسندیدہ فنکار، مشمولہ ماہنامہ اوراق، لاہور، شمارہ خاص۔ا، ۱۹۶۶ء ص ۱۸۹

۲۰ ذکاء الدین شایاں، ڈاکٹر، ایلیٹ کی شاعری۔ ماضی اور مذہب کا مسئلہ، مشمولہ سہ ماہی تسطیر، لاہور۔ اپریل تا ستمبر ۲۰۰۰ء ص ۱۸۸

۲۱ نیا اسم، مذاکرہ، ناصر کاظمی، انتظار حسین، مشمولہ: ادبی مذاکرے مرتبہ: شیما مجید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۸۹ء ص ۸۹

۲۲ ایضاً ص ۹۰

۲۳ ذکاء الدین شایاں، ایضاً مشمولہ تسطیر لاہور اکتوبر ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء ص ۲۵۸

۲۴ Beverly Armchin & others, ibid p.1072

۲۵ R.A. Scoth Jamas ibid p.159

۲۶ ٹی ایس ایلیٹ چہار آہنگ، ترجمہ قرۃ العین حیدر، مشمولہ ماہنامہ افکار کراچی، جوبلی نمبر، جون۔ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۰۷۷

۲۷ ایضاً ۱۰۷۵

۲۸ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، ایضاً ۴۵

۲۹ ثیمنا مجید، ادبی مذاکرے، سنگِ میل پبلی کیشنز: لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۵۰۷

۳۰ شان الحق حقی، درپن درپن، ۱۹۸۵ء

۳۱ Encyclopaedia Britannica, vol.8 William Benton publisher Chicago, London. Toronto, 1959 p.360

قلمی معاونین سے التماس

ہماری بہترین کوشش کے باوجود ''الاقرباء'' کی سطور میں حرفی و لفظی اغلاط کہیں کہیں رہ جاتی ہیں، جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ تاہم ان اغلاط کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہاتھ سے لکھے مسودات پڑھنے میں اکثر دشواری پیش آتی ہے۔ ہم از حد ممنون ہوں گے اگر ہمارے فاضل قلمی معاونین اپنے مسودات ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں (ادارہ)

فضہ پروین

جون وولف گینگ وان گوئٹے (Johan Wolfgangvon Goethe)

۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو فری امپیریل سٹی آف فرینکفرٹ جرمنی میں اس ادیب نے آنکھ کھولی جس کی ادبی کامرانیوں اور تخلیقی فتوحات کو دیکھ کر پوری دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک قادرالکلام شاعر، عظیم ناول نگار، موثر ڈرامہ نگار، نیچرل فلسفی اور شہرہ آفاق سفارت کار کی حیثیت سے گوئٹے نے بڑے زوروں سے اپنے آپ کو منوایا۔ عالمی کلاسیک میں گوئٹے کی علمی و ادبی کامیابیوں نے پوری دنیا میں اس کی دھاک بٹھا دی۔ جذبہ، انسانیت نوازی اور سائنسی انداز فکر کو بروئے کار لانے والے اس ہفت اختر ادیب نے اپنی تخلیقات کے معجز نما اثرات عالمی ادبیات پر مرتب کیے۔ گوئٹے نے عالمی ادبیات کو معیار اور وقار کے اعتبار سے آفاق کی وسعت اور آسمان کی بلندی سے ہمکنار کر دیا۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں گوئٹے کے ادبی منصب کو لائق صد رشک و تحسین قرار دیا جاتا ہے۔ رومانیت اور کلاسیکیت کے پرتو گوئٹے کی تخلیقات میں جلوہ گر ہیں۔ ادب کی عالمگیریت اور آفاقیت کے تصور کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں گوئٹے کے خیالات کی افادیت کو دنیا بھر میں پذیرائی نصیب ہوئی۔ بالخصوص جرمن فلسفہ پر گوئٹے کے افکار نے فکر و نظر کی کایا پلٹ دی۔ ہیگل اور شیلنگ کے افکار پر یہ اثرات نمایاں ہیں۔ رفتہ رفتہ پورے یورپ میں گوئٹے کے خیالات کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

گوئٹے نے لاطینی، یونانی، فرنچ اور انگریزی زبان پر دسترس حاصل کی۔ فنون لطیفہ میں اس کی دلچسپی اس کے ذوق سلیم کی مظہر ہے۔ گوئٹے کو تھیٹر اور پتلی تماشا بہت پسند تھا۔ گوئٹے نے شعبہ قانون میں بھی دلچسپی لی اور قانون کی باضابطہ تعلیم حاصل کی۔ گوئٹے نے پسند کی شادی کی اور اس کا ایک بیٹا بھی پیدا ہوا ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو یہ عظیم تخلیق کار زینہ ہستی سے اتر کر

زیر زمین چلا گیا۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

گوئٹے کی تصانیف

گوئٹے نے اپنی متنوع تخلیقی فعالیت سے جرمن ادب کی ثروت میں اضافہ کیا۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ڈراما گوئس ۱۷۷۱ء　(۲) ناول ''نوجوان ورتھر کی داستان غم'' ۱۷۷۴

(۳) ڈراما ''ایگومنٹ'' ۱۷۷۸ء　(۴) ڈراما ''فاوسٹ'' پہلا حصہ ۱۸۰۸ء

(۵) غرب شرقی دیوان (شاعری کا مجموعہ) ۱۸۱۹ء

گوئٹے کی شاعری بالخصوص، غرب شرقی دیوان (West-Eastern Divan) پر فارسی کے ممتاز شاعر حافظ کے اثرات نمایاں ہیں۔ ڈراما فاوسٹ کا دوسرا حصہ گوئٹے نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مکمل کیا اور اس کی اشاعت گوئٹے کی وفات کے بعد ہوئی۔

گوئٹے کی زندگی جاں گسل تنہائیوں اور اعصاب شکن ماحول کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ۱۸۰۹ء میں گوئٹے جب عالم تنہائی میں ویمر (Weimar) میں اپنی خادمہ کرسٹین ولپیس (Chriestian Vulpius) کے ہمراہ مقیم تھا، اسی اثنا میں نپولین کی افواج نے اس قصبہ پر یلغار کی اور اسے فتح کر لیا۔ نیم مسلح دستوں نے گوئٹے کی رہائش گاہ پر قبضہ کر لیا۔ گوئٹے نے اسی عرصے میں خادمہ سے شادی کر لی۔ اس کا ایک بچہ پیدا ہوا گردش ایام ہر وقت گوئٹے کے تعاقب میں رہی ۱۸۱۶ء میں اس کی بیوی اسے داغ مفارقت دے گئی۔

گوئٹے عمر بھر سفاک ظلمتوں کو کافور کرنے کے لیے اپنا دل جلا کر اجالے کی تمنا کا آرزومند رہا۔ موت کے وقت اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

''روشنی! اے روشنی''

گوئٹے نے اپنی وسعتِ نظر اور تبحر علمی سے اپنے اسلوب کو تنوع سے آشنا کیا۔ جنس اور جذبات کے موضوع پر اس نے جرأت اظہار کی عمدہ مثال پیش کی۔ اس کے خیالات آفاقی اقدار کے ترجمان ہیں۔ وہ ایام کامرکب نہیں راکب دکھائی دیتا ہے۔ وہ علاقے، نسل، قوم اور کسی ملک کے حصار میں نہیں رہتا بلکہ اس کی تخلیقی فعالیت بے کراں نظر آتی ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اس نے کہا تھا۔ "Science and art belong to the whole world and before them vanish barriers of nationality" دنیا بھر میں گوئٹے کے افکار پر تحقیق اور تنقید کا ایک غیر مختتم سلسلہ جاری ہے۔ گوئٹے کے آخری الفاظ کے مطابق روشنی کی جستجو اور روشنی سے والہانہ محبت کرنے والوں نے اس کے پیغام کو دنیا بھر میں عام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ روشنی کا یہ سفر تا ابد جاری رہے گا گوئٹے نے اپنی تخلیقی فعالیت کے اعجاز سے الفاظ کو گنجینۂ معانی کا طلسم بنا دیا۔ اس نے اپنے فکر و فن کی اساس افکار تازہ کو بنایا۔ گوئٹے کی تخلیقات اور اس پر ہونیوالے کام کا اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے۔

Books of Johann Wolfgang Von Goethe:

1. Theory of colours by Johann Wolfgang von Goethe and Charles L. Eastlake
2. Italian Journey: 1786-1788(Penguin Classics) by Johann Wolfgang von Goethe, W.H. Auden, and Elizabeth Mayer
3. Selected poetry of Johann Wolfgang von Goethe (Penguin Classics) by Johann Wolfgang von Goethe and David Luke
4. Faust: A Tragedy (Norton Critical Editions) by Johann Wolfgang von Goethe, Cyrus Hamlin, and Walter W Arndt
5. Autobiography by Johann Wolfgang von Goethe
6. Faust: Der Tragodie, Erster Teil (Dodo Press) (German Edition) by Johann Wolfgang von Goethe

7 Johann Wolfgang Goethe: Urfaust(Universal-Bibliothek) (German Edition)

8 Selected Poems (Goethe: The Collected Works, Vol. 1) by Johann Wolfgang von Goethe, Christopher Middletion, Michael Hamburger and David Luke

9 Faust (German Edition) by Johann Wolfgang von Goethe

10 Essays on Art and Literature (Goethe: The Collected Works, Vol. 3) by Johann Wolfgang von Goethe, John Gearey, Ellen von Nardroff, and Ernest H. von Nardroff

11 Egmont by Johann Wolfgang von Goethe

12 Faust by Johann Wolfgang von Goethe and Bayard Taylor

علامہ اقبال نے بھی گوئٹے کے افکار کو بنظر تحسین دیکھا۔ پیام مشرق مطبوعہ ۱۹۲۳ء کے ابتدائی اوراق میں گوئٹے کا ذکر ملتا ہے۔ گوئٹے کی کتاب زیست کے تمام ابواب میں محبت کی زبان کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تمام کتابوں سے ارفع اور مقدس کتاب تو بہرحال کتاب محبت ہی ہے۔ وہ اسی کتاب کے مطالعہ کو حاصل زیست قرار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس جانب بھی متوجہ کرتا ہے یہ کتاب محبت کے اوراق میں جہاں رنگ خوشبو اور حسن و خوبی کے استعارے اپنی عطر بیزیوں کی بدولت دامن دل کھینچتے ہیں وہاں اذیت، مصیبت، ملامت اور بلائیں بھی کثرت سے موجود ہیں۔ انسان کو یہاں مرحلہ شوق طے کرتے وقت جہاں ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی کا سماں پیش نظر ہوتا ہے۔ وہاں ہر موج میں حلقہ صد کام نہنگ کا دام بچھا ہے جو قطرے کے گہر ہونے کے تمام مراحل کو شدید اضطراب سے دوچار کرتا ہے اور دل کے مقتل میں کئی حسرتیں خون ہو جاتی ہیں اور آرزوئیں مات کھا کر رہ جاتی ہیں۔ جب امیدوں کی فصل غارت ہو جائے اور صبحوں شاموں کی محنت اکارت چلی جائے تو انسان کرچیوں میں بٹ جاتا ہے۔ ان لرزہ خیز حالات میں بھی گوئٹے حوصلے اور امید کا دامن تھام کر محبت کی شمع فروزاں کیے ہوئے مہیب

سناٹوں، جان لیوا تنہائیوں اور گھمبیر تاریکیوں میں پیمانِ وفا باندھ کر پرورش لوح و قلم میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"تم نے اس کتاب کے موضوعات عطا کیے یہ تمھاری ہی عطا ہے۔" (۱)

"میری رگوں میں ایک بار پھر رقصاں ہے گرما اور بہار کا جاں بخش شعلہ" (۱)

English	آزاد اردو ترجمہ
No wonder,that our joy's complete	کیا عجب ہماری خوشیوں کی تکمیل ہو جائے
While eye and eye responsive meet,	جب آنکھ سے آنکھ ملے
When this blest thought of rapture moves usThat we're with Him who truly laves us	اظہار محبت سے قسمت تبدیل ہو جائے
And if He cries...Good, let it be !	اور یہ کہ ہم اس کے ہیں جو ہم سے حقیقی پیار کرتا ہے
Tis so for both, it seems to me .	وہ دلی کرب کا اظہار کرتا ہے
	مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے،
Thou' rt clasped within these arms of mine	
Dearest of all God's thoughts divine (۲)	کہ ہم دونوں کو یکساں ہی کرب کا احساس ہوتا ہے
	کیا تم وہی نہیں ہو جو کہ سمٹ آئے ہو
	میرے بازوؤں کی گرفت میں اس آن
	تم تو مجھے سب سے عزیز ہو
	خالق کائنات کی اس دھرتی میں سن لو میری جان (ترجمہ فضہ پروین)

ترجمے کے ذریعے دو تہذیبوں کو قریب تر لانے میں مدد مل سکتی ہے۔ گوئٹے کے تخلیقی فن پارے مواد، ہیئت، زبان و بیان اور موضوع کی ندرت کے اعتبار سے پتھروں کو بھی موم کر دیتے ہیں۔ حسن و رومان کی دلفریب کیفیت قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ایزرا پاؤنڈ نے ادب کی درخشاں اقدار کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھا ہے۔

"اعلیٰ ادب ایسی سادہ زبان ہے جس میں اعلیٰ ترین معانی ممکن حد تک سمو دیئے جائیں" (۴)

گوئٹے کی تخلیقات میں رومانی عنصر کا غلبہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ حسن و رومان کی علامتوں کے سوتے اس کے لاشعور سے پھوٹتے ہیں۔ گوئٹے نے فطرت کے حسن بے پروا کو رومانی جذبات اور حسن کی لفظی مرقع نگاری سے اس قدر مسحور کن بنا دیا ہے کہ اس کے دلکش اسلوب کے معجز نما اثر سے وجدان اور لاشعور کی حدیں باہم ملتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے بھی مقامات آتے ہیں جہاں وہ لاشعور کی ایک مخصوص طرز ادا یعنی اشاریت کو نہایت فن کارانہ مہارت سے رو بہ عمل لا کر خون بن کر رگ سنگ میں اترنے پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ زبان اور بیان پر اس کی خلاقانہ دسترس، تخیل کی ندرت، موضوعات کا تنوع اور اظہار کی انفرادیت اس کے ہاں نمایاں ہے۔ گوئٹے کا کمال یہ ہے کہ اس نے تہذیب و تمدن، ادب، کلچر اور معاشرتی زندگی کے تمام ارتعاشات کو اپنے تخلیقی اظہار کے وسیلے سے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا ہے۔ قلبی اور روحانی وارداتوں اور دروں بینی کا جو بے ساختہ پن گوئٹے کے ہاں جلوہ گر ہے وہ اسے منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس کی تمام تر تخلیقی فعالیت کا انحصار ندرت تخیل پر ہے۔

گوئٹے پر جرمن فلسفی ہرڈر کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ گوئٹے نے جرمن صوفی ہیمن سے بھی اثرات قبول کیے۔ لوک گیتوں سے بھی گوئٹے کی دلچسپی ہرڈر کی بدولت ہے اور جہاں تک روحانیت اور وجدان کا تعلق ہے اس کے سوتے بیش تر ہیمن کے افکار سے پھوٹتے ہیں۔

گوئٹے کی تخلیقات پر طائرانہ نظر

۱۔ ڈراما ''گوئس'' ۱۷۷۱

اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ جرمن ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ڈراما کا ہیرو ایک جانباز شخص ہے جو ظالمانہ استحصالی نظام کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے۔اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ کئی مہمات سر کرتا ہے بالآخر اپنی جان کی بازی ہار جاتا ہے۔حسن بے پروا کے ساتھ کشمکش میں اس کی زندگی کی راتیں اس طرح گزرتی ہیں کہ کبھی سوز وساز رومی اور کبھی پیچ وتاب رازی کی کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔چاند کی خاطر ضد کرنے والے رومانی مزاج عاشق دلوں کو مرکز مہر ووفا کس طرح کرتے ہیں اس کا نہایت دلکش انداز میں بیان گوئٹے کی تخلیقات میں ملتا ہے۔

۲۔ نوجوان ورتھر کی داستان غم ۱۷۷۴ء

یہ محبت کی ایک ایسی داستان ہے جس میں تخلیق کار کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ محبت کی راہ پر چلنے والے کی اپنی تباہیوں پر مبنی داستان ہے۔ تصورات اور احساسات کے مابین پائے جانے والے اختلافات اور متصادم کیفیات کا نہایت موثر انداز میں اظہار کیا گیا ہے۔

ورتھر نے ہلاکت خیزی کی راہ اپنائی اور اپنی تخریب کا باعث بن گیا۔حالات اور خواہشات کا سیل رواں انسانوں کو خس وخاشاک کے مانند بہالے جاتا ہے۔معاشرتی زندگی کے کئی پہلو مثلاً شادی پیمان وفا اور خلوص ومروت کے بارے میں اس ڈرامے میں جو سوال ابھرتے ہیں وہ آج بھی لمحہ فکر یہ ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے خلوص کی تابانیوں کو مصلحت نے گہنا دیا ہے۔

۳۔ڈراما ''فاؤسٹ'' (FAUST) ۱۸۰۸ء

یہ ڈراما کائنات اور حیات کے موضوع پر ہے۔کائنات کے موضوع (Cosmic) پر یہ ڈراما کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یہ ڈراما ریلزم (Realism) کی حدود سے آگے ہے۔شاعرانہ تخیل کی جولانیاں دکھاتے ہوئے گوئٹے نے عام زندگی کے حقائق کو اس دلنشیں

انداز میں پیش کیا ہے کہ زمانہ آئندہ کے تمام امکانات اس میں سمٹ آئے ہیں۔ فاؤسٹ اور ابلیس کے عہد و پیمان کو جس موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے فرسودہ نظام کہنہ کے بارے میں واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ گرتی ہوئی عمارت کے مانند ہے اس کے سائے میں عافیت سے بیٹھنے کے خواب دیکھنے والے احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ انسانیت کے نشوونما و ارتقا کی تفہیم میں اسے کلیدی مقام حاصل ہے۔

۴۔ اٹلی کا سفر (Italian Journey)

زندگی کے آخری دنوں کی یادوں پر مبنی ہے۔ پیرانہ سالی میں مصنف نے عمر رفتہ کو آواز دی ہے اور اس طرح یہ ایام گزشتہ کی کتاب کے اوراق کا ایک مجموعہ ہے۔ تہذیب، ثقافت، ادب، کلچر اور مسائل پر گوئٹے کی گہری نظر تھی۔ اس کی تخلیقات میں عصری آگہی کا عنصر نمایاں ہے۔

گوئٹے نے اپنے عہد کے ادب پر گہرے اثرات چھوڑے۔ یورپ کے طرز احساس کو عبوری دور میں ایک ایسی کیفیت کا سامنا تھا کہ ہر لحہ تغیر پذیر تھا۔ اس نے اس تناظر میں جذبات احساسات کا بنظر غائر جائزہ لیا اور حقیقی صورت حال کو اپنے فکر و فن کی اساس بنایا ہے۔ سستی جذباتیت اور بے لگام رومانیت کو اس نے کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا وہ کسی قسم کی تکثیریت کو پسند نہیں کرتا تھا ذوق سلیم پر مبنی فکر و خیال کی اہمیت کو وہ کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا

" There is nothing worse than imagination without taste" (1)

گوئٹے کو جرمنی میں بے پناہ قدر و منزلت نصیب ہوئی۔ جرمنی کا کلچرل انسٹی ٹیوٹ آج بھی گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے نام سے مشہور ہے یہ انسٹی ٹیوٹ جرمن ادب و ثقافت کی ترویج میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں جرمن قوم نے اس شہرۂ آفاق ادیب کی یاد میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ قائم کر رکھے ہیں۔ اس طرح اس عظیم تخلیق کار کے افکار کو پوری دنیا میں مثبت شعور اور آگہی کو پروان چڑھانے کے لیے بروئے کار لانے کی مساعی جاری ہیں۔ گوئٹے نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا۔ دنیا بھر میں اس کے مداح کثیر

تعداد میں موجود ہیں۔ اٹلی اور سسلی کا سفر گوئٹے کی زندگی کا یادگار سفر ثابت ہوا۔ اسی عرصے میں اس کی تخلیقی فعالیت کو نمو ملی۔ اس نے اٹلی اور سسلی کے سفر کو جس تناظر میں دیکھا اس کا اندازہ ان احساسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

"To have seen Italy wihtout having seen Sicily is not have seen Italy at all, for Sicily is the clue to every thing"(i)

گوئٹے کی زندگی میں کئی سخت مقام بھی آئے ایک مرتبہ نشے میں بدمست اجرتی قاتل اور کرائے کے بدمعاش اس کے گھر میں گھس گئے۔ وہ اس جری تخلیق کار سے متاع لوح قلم چھین کر ہنستے اور بولتے ہوئے چمن کو مہیب سناٹوں کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے مگر آزمائش کی اس گھڑی میں وہ اور اس کی اہلیہ کرسٹین (Christiane) ثابت قدم رہے اور ظالم و سفاک، موذی و مکار دہشت گردوں کو اپنے مذموم مقاصد میں ناکامی ہوئی۔ ہر عہد میں خفاش منش جید جاہل روشنی کی راہ میں دیوار بننے کی قبیح کوششوں میں مصروف رہے ہیں مگر اولوالعزمان دانش مند گوئٹے کی طرح نہ صرف اپنے لہو سے ہولی کھیل کر دکھوں کے کالے کٹھن پہاڑ اپنے سر پر جھیلتے ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے سفاک ظلمتوں میں ستارۂ سحر بننے کی درخشاں مثال چھوڑ جاتے ہیں۔ گوئٹے نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔

" Fires, rapine, a frightful night...Preservation of the house through sateadfastness and luck" (1)

اگرچہ قسمت اور حالات سازگار تھے مگر آلام روزگار نے گوئٹے کا تمام عمر تعاقب کیا۔ اس کی ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر دم نکلتا تھا۔ ہزاروں داستانیں ایسی تھیں کہ اس کے دل میں ناگفتہ رہ گئیں اس کی زندگی کا سفر تو کٹ چکا تھا مگر وہ خود کرچیوں میں بٹ گیا تھا۔ اس کے جسم میں ایک بے قرار روح تھی جو بے لوث محبت کے لیے تڑپتی رہی۔ اسے اس بت کا شدت سے احساس تھا کہ جسے بھی نہاں خانہ، دل کی جان لیوا تاریکیاں کافور کرنے کے لیے چراغ کے مانند پیار سے رکھا جاتا ہے وہی امیدوں کا خرمن خاکستر کر کے چلا جاتا ہے۔ گلشنِ

ہستی میں ایسے بھی مناظر دیکھنے پڑتے ہیں کہ جسے گلاب کے مانند جان سے بھی عزیز خیال کیا جاتا وہی نشتر جاں میں کانٹے چبھو کر عمر بھر کی کسک دے جاتا ہے۔ گوئٹے کو اس بات کا شدید قلق تھا کہ لوگ مثل آفتاب وادیٔ خیال میں طلوع ہو کر اپنی چکا چوند سے مرعوب کر دیتے ہیں لیکن یہ ساری صناعی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ثابت ہوتی ہے۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے کا المیہ یہ ہے کہ جو لوگ مرہم بدست آتے ہیں وہی زخموں پر نمک چھڑک کر دل دُکھا کر دائمی مفارقتوں کی بھینٹ چڑھا کر چلے جاتے ہیں۔ ان اعصاب شکن حالات میں ایک حساس تخلیقی فن کار جب دکھوں کے جال ہر سو بچھے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ اپنی بے بسی پر کف افسوس ملنے لگتا ہے۔

۱۸۲۳ء میں وہ الرائک واں لوٹزو (Ulrike Von Levetzow) کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا۔ اس کو دل دے کر خود عارضہ قلب میں مبتلا ہو گیا، اس ناکام محبت کے نتیجے میں اس کی تخلیق "Marienbad Elagy" منصۂ شہود پر آئی۔ اسے گوئٹے کی نفیس ترین اور عزیز تخلیق کا درجہ حاصل ہے۔ گوئٹے نے بحیثیت شاعر جو فقید المثال کامرانیاں حاصل کیں ان کا ایک عالم معترف ہے۔ اس کے مزاج میں عجز و انکسار کی فراوانی تھی۔ نارسیسی انہماک اس کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتا تھا۔ ایک بات کا اسے بہر حال احساس تھا کہ رنگ، خوشبو، جلال و جمال اور حسن و خوبی کے تمام استعارے جذبۂ عشق کے مرہون منت ہیں۔ جذبوں کی صداقت کی لفظی مرقع نگاری میں کوئی اس کا ہم سر نہیں۔ جرمن ادب میں گوئٹے کی تخلیقی کامرانیاں، متنوع تجربات اور مسحور کن اسلوب کو ایک لائق تقلید مثال قرار دیا جاتا ہے۔ اسے لطیف جذبات، قلبی احساسات پر مبنی دروں بینی (introversion) کے بنیاد گزار کے نام سے آج تک اہم سمجھا جاتا ہے۔ گوئٹے نے تخلیق فن کے لمحوں میں خون بن کر رگ سنگ میں اترنے کا ایسا اسلوب وضع کیا جو اس کی ذات اور پہچان بن گیا۔ وطن اور اہل وطن کے ساتھ قلبی وابستگی اور والہانہ محبت اس کا بہت بڑا اعزاز و امتیاز قرار دیا جاتا ہے۔ وہ ایک عظیم محب وطن تھا اس نے لکھا ہے کہ "کیا تم اس سرزمیں کے بارے میں جانتے ہو جہاں باغوں میں بہار ہی بہار ہوتی ہے اور جہاں لیموں کھلتے ہیں اور

باغ مہک اٹھتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ کاروانِ ہستی مسلسل رواں دواں ہے۔ رخشِ عمر پیہم رو میں ہے۔ انسان کا نہ تو ہاتھ باگ پر ہے اور نہ پا رکاب میں ہے۔ تقدیر کے فیصلوں پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ رخشِ عمر کہاں جا کر تھمے گا۔ آلامِ روزگار کے مہیب بگولوں کی زد میں آ کر انسان کی کشتیِ جاں قلزمِ زیست کی موجوں کے تلاطم اور گرداب میں ہے۔ ان اعصاب شکن حالات میں دفاع اور احتجاج کا تصور ہی عبث ہے۔ گوئٹے کے افکار و خیالات نے عالمی ادب پر دور رس اثرات مرتب کیے جن کا ہر عہد کے ادب میں نشان ملتا ہے۔ اس نے افقِ ادب پر اپنی ضیا پاشیوں سے اکنافِ ادب کا گوشہ گوشہ منور کر دیا۔ اس کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کا دنیا بھر میں اعتراف کیا جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برس میں گوئٹے نے فاؤسٹ (Faust) حصہ دوم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اس کی اشاعت گوئٹے کی وفات کے بعد ہو سکی۔ وہ شہرتِ عام اور بقائے دوام کے منصب پر فائز رہے گا، اس کی تخلیقات کی بازگشت ہر جگہ سنائی دیتی ہے ایسے یادگارِ زمانہ لوگوں کے نام کی تعظیم ہر دور میں تاریخ کرتی رہے گی۔

حوالہ جات/ مآخذ

۱ http://en.wikipedia org/wiki/Johann_Wolfgang_von_Goethe

۲ http://www.poetry-archive com/g/it_is_good htmi

۳ ڈاکٹر عزیز احمد خان ادب کیا ہے، مضمون مشمولہ دریافت، مجلّہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۶، صفحہ ۴۷۵

واجد ندیم (شکاگو۔ امریکہ)

قاتل کی تلاش

دلاور نگر پولیس اسٹیشن کا بہ حیثیت ایس۔ ایچ۔ او۔ چارج لیئے ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ ڈی۔ ایس۔ پی مسٹر بھٹی نے ابراھیم خاں مرڈر کیس کی فائل اوپن کرنے کا حکم دیا۔ میں نے جب اس قتل کے کیس کا سرسری جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ۱۴ سال قبل ابراھیم خاں نامی ایک شخص کو جو دلاور نگر کا رہنے والا تھا کلن نامی ایک شخص نے قتل کر دیا اور لاپتہ ہو گیا۔ حسب دستور کچھ عرصہ تفتیش اور کلن کی تلاش جاری رہی اور گواہوں کے بیانات سے بڑی حد تک یہ ثابت ہو گیا کہ یہ قتل کلن ہی نے کیا ہے اور ملزم کے لاپتہ ہونے سے اس کیس کی فائل سرد خانے میں چلی گئی۔

دلاور نگر پٹھانوں کی بستی ہے جس میں تقریباً ۹۰ فیصد پٹھان اور دوسرے آباد ہیں پٹھانوں کی وہ عام خصوصیات جو عام طور سے مشہور ہیں ان میں بھی ہیں۔ معاملات میں سیدھے، وعدے کے پکے اور اپنی آن پر مٹنے والے جان جائے پر آن نہ جائے۔

میں نے جب اس کیس کا تفصیلی جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ کلن جس کا اصلی نام کلیم داد خان تھا پولیس کے ریکارڈ پر تھا۔ معمولی مار پیٹ اور ضرب شدید کے واقعات میں ملوث اور اس علاقے میں اس کی حیثیت ایک روایتی۔ دادا گیر کی طرح تھی لیکن اس کی ذاتی شخصیت کے بارے میں پڑھ کر مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ کس طرح علاقے کا دادا گیر بن گیا کیونکہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے ایک چھوٹا موٹا اور مختصر آدمی تھا جس کا قد ۵ فٹ ۵ انچ اور وزن ۱۲۰ پونڈ دبلا پتلا چھریرے بدن کا۔ لیکن اس تھانے کے لا اینڈ آرڈر کے ایک پرانے ہیڈ کانسٹبل نے بتایا کہ کلن گو کہ چھوٹا اور مختصر سا آدمی تھا لیکن تھا بڑا دلیر۔ اچھے اچھے اس سے کانپتے تھے اور کلن کے نام سے انھیں پسینہ آجاتا مار پیٹ کے ایک سے زیادہ واقعات میں ملوث ہونے سے اس کی ''اوڈی شیٹ'' کھول دی گئی تھی۔

قتل کے واقعے کے بارے میں پتہ چلا کہ کلّن اور ابراہیم خان آپ میں دوست تھے پینے پلانے میں ایک دوسرے کے ساتھی ۔کبھی کبھی آپس میں جھگڑتے بھی لیکن پھر دوستی ہو جاتی۔ ابراہیم خاں شادی شدہ اور ۲۴۔۲۵ سال کا جوان اور دو بچوں کا باپ تھا جس کی شادی پٹھانوں میں عام دستور کے مطابق ۱۸۔۱۹ سال میں ہوگئی تھی لیکن کلّن کنوارا تھا اور اس کے آئے دن کے مار پیٹ کے واقعات نے اس کی شادی میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔

واقعہ کی رات دونوں نے ایک ساتھ شراب پی اور رات میں تقریباً ۱۲ بجے ان دونوں کو ایک ساتھ شراب خانے سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا۔اس کے بعد دوسرے دن صبح ابراہیم خاں کی لاش سڑک کے کنارے ملی ۔اور اس کے بعد کلّن لا پتہ ہوگیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوا کہ ابراہیم خان کے جسم پر چاقو کے لگائے زخم کا ایک گہرا نشان پسلیوں کے نیچے پایا گیا اور رپورٹ میں مزید یہ بھی صراحت تھی کہ خون کے زیادہ بہہ جانے سے جو چاقو کے زخم سے رس رہا تھا متوفی کی موت واقع ہوئی۔ مقام واقعہ کی رپورٹ بتا رہی تھی کہ جھگڑنے اور چاقو سے مار کھانے کے بعد مقتول تقریباً آدھا فرلانگ دوڑتا رہا جس کی وجہ سے خون بڑی تیز رفتاری سے بدن سے خارج ہوگیا اور مقتول بے جان ہو کر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے یہ رپورٹ پڑھ کر اندازہ لگایا کہ مقتول کے جسم پر چاقو کے ایک ہی زخم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قاتل نے مقتول پر قتل کی نیت سے حملہ نہیں کیا اور اگر اس کا ایسا ارادہ ہوتا تو مقتول کے جسم پر ایک سے زیادہ زخم کے نشان ہونے چاہیں تھے۔ اگر یہ قتل کلّن ہی نے کیا ہے اور ابراہیم خاں کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ اس کو کلّن کے پیچھے بھاگنے کی ہمت ہوتی اور نہ کلّن بھاگتا۔ دراصل ابراہیم خاں اور کلّن کی دوستی نے ابراہیم کے دل سے کلّن کا رعب اور ڈر دور کر دیا تھا جو بستی میں اوروں کو تھا۔ اس لیے وار کرنے کے بعد کلّن نے فرار کی راہ لی اور ابراہیم خاں اس کے پیچھے دوڑتا ہوا کچھ دور جا کر گر گیا اور وہیں فوت ہوگیا۔

ڈی ایس پی مسٹر بھٹی نے مجھے کلّن کی تصویر اور روڈی ٹیسٹ سے ضروری معلومات فراہم

کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ وہ ۱۴ سال قبل دلاور نگر تھانے کے انچارج تھے اور اسی زمانے میں یہ قتل کی واردات ہوئی تھی اور کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان ہی کے ہاتھوں ملزم گرفتار ہو کر عدالت میں پیش ہو۔ اس سے قبل کہ میں کلن کے بارے میں کچھ پوچھتا انھوں نے بتایا کہ کلن کے اس وقت امریکہ کے ایک قصبے میں خاموش اور گمنامی میں زندگی گزارنے کی اطلاع ملی ہے اور مجھے اس کی گرفتاری عمل میں لانی ہے۔ انھوں نے وارنٹ گرفتاری اور دوسرے ضروری کاغذات اور میرا ویزہ لگا ہوا پاسپورٹ اور ائر ٹکٹ میرے حوالے کیا۔

روانگی سے قبل میں نے قاتل اور مقتول کے بارے میں کچھ اور معلومات فراہم کر لیں کلن اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور ماں باپ کے بے جا لاڈ اور پیار نے اسے بگاڑ دیا جس کی وجہ سے وہ پڑھ لکھ نہ سکا اور آوارہ ہو گیا اور قتل کے واقعے کے بعد اس کے والدین بھی ۶۔۷ سال بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور مقتول ابراہیم خان اپنے پیچھے ایک بیوہ رابعہ خاتون اور دو بچے چھوڑ گیا تھا۔ ابراہیم خان کے قتل کے بعد ۳۔۴ سال بیوہ اور بچوں پر بڑی مصیبت کے دن گزرے اور رابعہ خاتون نے سلائی اور دوسرے کام کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرا لیکن گذشتہ ۱۰۔۱۱ سال میں ان کی حالت بہتر ہوگئی۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان کو پختہ اور دو منزلہ بنا لیا جس میں نیچے خود رہتے ہیں اور اُوپر کرایہ پر دے رکھا ہے اور بچے بھی ۲۰۔۲۱ سال کے ہو گئے ہیں اور کالج میں پڑھتے ہیں۔ میں نے اس تبدیلی کے بارے میں معلومات کیں تو پتہ چلا کہ رابعہ خاتون کا بھائی کسی خلیجی ملک میں ہے اور وہ اپنی بہن کی مدد کرتا ہے اور اس نے خود بھی اپنا ایک مکان اسی بستی میں بنا لیا ہے۔

امریکہ کے شہر ڈیٹرائٹ تک میرا ہوائی سفر نہایت آرام دہ رہا سوائے اس کے کہ پورے سفر میں، میں سو نہ سکا۔ ایرپورٹ سے میں نے ٹیکسی لی اور بتائے ہوئے قصبے کے ایک ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ شام کے سائے ڈھل چکے تھے پھر بھی کھڑکیوں کے پردے نیچے گرا کر آرام دہ بستر پر لیٹا تو پھر میں نے صبح کی خبر لی۔ گرما کے دن تھے اور موسم خوشگوار۔ میں بلا مقصد ہی باہر نکل

گیا۔ دوکانیں بجی ہوئی تھیں اور شاپنگ پلازا میں گاہکوں کی آمد و رفت تھی جن میں مقامی امریکن اور کچھ عرب خواتین تھیں جو اپنے حجاب کی وجہ سے نمایاں نظر آئیں۔ ویسے بھی یہ جمعہ کا دن تھا جو کام کا دن ہوتا ہے اس لیے کوئی دیسی چہرہ جو اپنے ملکوں کا ہو سکتا ہے نظر نہیں آیا۔ واپس ہوٹل پہنچ کر میں نے ٹیلیفون ڈائرکٹری میں نام تلاش کرنے شروع کیے کچھ دیسی نام نظر آئے جن میں کچھ ایسے بھی تھے جو خاں پر ختم ہوتے تھے لیکن کلیم داد خاں کوئی نہ تھا۔ دوسرا دن ہفتہ کا تھا اور امریکہ میں ہفتہ اتوار چھٹی ہوتی ہے۔ میں پھر بازار میں نکل گیا اور گھومتا رہا۔ اتفاق سے دو ایک دیسی عورتیں نظر آئیں اور ان سے گفتگو میں پتہ چلا کہ قریب ہی ایک سنٹر ہے جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور اتوار کے دن بچوں کا اسکول ہوتا ہے جہاں اس علاقے کے رہنے والے تقریباً سبھی جمع ہوتے ہیں۔

اتوار کے دن صبح ۱۰ بجے کے قریب میں سنٹر پہنچ گیا ابھی لوگ بچوں کو سنڈے اسکول کے لیے لے کر آ رہے تھے۔ بچوں کے اسکول کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی کچھ پروگرام تھے جس کی نشاندہی نوٹس بورڈ پر کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے لیے میں نیا تھا لیکن ہر ایک نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنا تعارف کروایا۔ اپنے بارے میں۔ مَیں نے یوں ہی گول مول باتیں کیں۔ مجھے دراصل ۵ فٹ ۵ انچ قد والے چھریرے بدن کے آدمی کی تلاش تھی جو ہو سکتا ہے اس مدت میں کافی بدل گیا ہو پھر بھی قد میں تو تبدیلی ممکن نہیں۔ آج کسی باہر سے آئے ہوئے مہمان کی تقریر کی اطلاع نوٹس بورڈ پر تھی جس میں ابھی کچھ دیر تھی اور میں دل بہلانے کے لیے نوٹس بورڈ پر لگے اعلانات پڑھ رہا تھا لیکن میری پوری توجہ ہر آنے جانے والے پر تھی میں نے دیکھا کہ چھوٹے قد کا ایک آدمی اپنے ۸۔۹ سال کے دو بچوں کے ساتھ داخل ہوا۔ اب تک نظر آنے والوں میں یہی ایک واحد شخص تھا جس کی قد میں بالکل مشابہت تھی۔ پروگرام کے بعد لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور مختلف لوگوں سے تعارف ہوا جن میں وہ شخص بھی شامل تھا جس کا قد ۵ فٹ ۵ انچ کے لگ بھگ تھا۔ قد کے علاوہ کوئی بھی چیز اس تصویر سے نہیں ملتی تھی جو میرے جیب میں رکھی

تھی۔فربہی کی طرف مائل جسم۔ چہرے پر بھرپور داڑھی۔ سر بالوں سے بے نیاز اور نام تھا اس کا کے۔ کے۔ بھائی جب کہ کلّن چھریرے بدن کا، سر میں گھنے بال اور داڑھی صفا چٹ۔ میں نے سوچا کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ تبدیلی تو آسکتی ہے لیکن ایک آخری نشانی کلّن کے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کا وہ تل تھا جو کلّن کے نشان شناخت میں لکھا تھا۔ میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ کے۔ کے بھائی نے جب اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تو میری نظریں اس کے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کے پشت پر جمی تھیں جس پر وہ تل کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔ کے۔ کے بھائی نے جلد ہی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے علیحدہ کرتے ہوئے معذرت کرلی کہ بچوں کی کلاس ختم ہو چکی ہے اور انھیں گھر لے جانا ہے۔ اور لوگوں سے ملاقاتوں کے دوران میں نے کے۔ کے۔ بھائی کے بارے میں معلومات فراہم کرلیں کہ کے۔ کے۔ بھائی ڈیرائیٹ کی آٹو انڈسٹری میں ملازم ہے نہایت شریف، نیک اور ہمدرد آدمی ہے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ عرصہ سے یہاں رہتا ہے۔ سنٹر کے قیام اور سنٹر کی کارکردگی میں اس کا نمایاں حصہ ہے لیکن سنٹر کے کسی عہدہ یا ذمہ داری کی پیشکش کو رد کر کے خاموش زندگی گزار رہا ہے۔

ملازمت کی تلاش کے بہانے کے۔ کے بھائی سے میں نے دوستی بڑھالی اور دو ایک مرتبہ اس کے گھر جانے کا بھی موقعہ ملا۔ بیوی کا تعلق گجرات سے رہا ہوگا کیونکہ وہ بچوں سے گجراتی زبان میں ہی بات کرتی تھی اور کے۔ کے۔ بھائی بھی اس سے گجراتی زبان میں بات کر رہا تھا لیکن وہ روانی نہیں تھی جس کی وجہ سے جگہ جگہ انگریزی الفاظ اور اٹک اٹک کر بات کرنے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ کے۔ کے۔ بھائی گجراتی نہیں لیکن نام میں گجراتی رنگ ضرور تھا۔ دن بدن میرا شبہ یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ کے۔ کے بھائی ہی کلیم داد خان عرف کلّن ہے اور کلیم اور کلّن کے دونوں حروف کے۔ کے ساتھ بھائی جوڑ کر گجراتی بن گیا ہے۔

میں نے کلّن کے اطراف جو جال بچھایا تھا وہ آہستہ آہستہ تنگ ہوتا جا رہا تھا آخر ایک روز

میں نے اسے اپنے ہوٹل پر بلایا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے ہی اس سکوت کو توڑا۔ "کہے۔ کے بھائی کیا تم کلیم داد خاں عرف کلّن نہیں ہو ؟" بغیر کسی تمہید کے میرے اس براہ راست سوال پر میں سمجھ رہا تھا کہ وہ چونک پڑیگا۔ لیکن وہ نہایت پرسکون انداز میں نظریں نیچے کیئے فرش کو تکتا رہا جیسے اس سوال کی اسے پہلے سے امید تھی اور وہ اس کے لیے تیار تھا "جی ہاں میں ہی کلیم داد خاں عرف کلّن ہوں۔ میں نے آپ کو اس دن تاڑ لیا تھا جب پہلی ملاقات میں مصافحہ کے وقت آپ کی نظریں میرے ہاتھ پر جمی تھیں جب کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا ملاقات کرنے اور مصافحہ کرنیوالوں کی نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوتی ہیں۔" کچھ دیر رک کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموشی سے خلا کو گھورنے لگا جیسے برسوں پہلے گزرے واقعات کو نظروں کے سامنے لا رہا ہو۔ پھر اس نے کہا "کوئی اگلا قدم اٹھانے سے پہلے آپ میری روداد سن لیں پھر اس کے بعد آپ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں میں اس کے لیے ہر طرح تیار ہوں۔ کیونکہ میرے پاس اب مزید فرار کی ہمت نہیں۔ میں اپنی بے قصور بیوی اور معصوم بچوں کو بے سہارا اور بے یار و مددگار نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ دیر دم لینے کے لیے وہ رکا تو میں نے محسوس کیا کہ بظاہر تو وہ پُرسکون نظر آ رہا ہے لیکن بے حد ذہنی دباؤ میں ہے اور اس کی زبان خشک ہو رہی ہے میں نے اسے پانی سے بھرا ایک گلاس پیش کیا۔ ذرا تازہ دم ہو کر اُس نے اپنی کہانی سنائی۔

"اُس رات ابراہیم اور میں یونیک بار میں شراب پی کر نکلے۔ ابراہیم کا اس کی بیوی کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور نشہ کی حالت میں وہ اسے گالیاں بک رہا تھا۔ میں رابعہ کی بہت عزت کرتا تھا اور اسے اپنی سگی بہن کی طرح چاہتا تھا۔ میں ابراہیم کو گالیاں بکنے سے روکتا رہا لیکن اس نے میری ایک نہ سنی اور مجھ سے ہاتھا پائی کرنے لگا دراس نے میرے منہ پر ایک گھونسا بھی رسید کر دیا میں نے اسے برداشت کر لیا لیکن جب اس نے کہا "تو اس کی تائید کیوں کر رہا ہے کیا تو اس کا یار لگتا ہے" اتنا سننا تھا کہ میرا خون کھول اٹھا اور میں نے چاقو سے اس پر ایک وار

کر دیا۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ وہ گر پڑا لیکن فوری اٹھ کھڑا ہوا اور گالیاں بکتے ہوئے میرا پیچھا کرتا رہا "میری بیوی کا یار۔ ٹھہر" میں بس بھاگتا رہا بھاگتا رہا۔ نہ جانے کتنا بھاگا۔ اپنا علاقہ چھوڑا اپنا شہر چھوڑا اور اپنا ملک بھی چھوڑا اور مسلسل چار سال بھاگتا رہا کبھی اِس ملک تو کبھی اُس ملک۔ آخر کار میری قسمت مجھے یہاں لے آئی اور میں ۱۰ سال سے یہاں مقیم ہوں ۱۰ سال ہوئے میں نے ایک گجراتی لڑکی سے شادی کر لی اور میرے ۷۔۸ سال کے دو بچے ہیں جنھیں آپ دیکھ ہی چکے ہیں میں نے پوچھا کیا تمہیں خبر ہے کہ ابراہیم کا کیا ہوا اور رابعہ خاتون اور اس کے بچے کس حال میں ہیں "کلن کے چہرے پہ اب سکون و اطمینان کی کیفیت تھی جیسے اس کے ذہن سے ایک بڑا بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اس نے کہا "ہاں مجھے سب پتہ ہے ابراہیم میرے لگائے ہوئے زخم سے فوت ہو گیا اور میرے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہو گیا اور رابعہ نے ۳۔۴ سال بڑی مصیبت میں گزارے لیکن اس کے بعد اس کی حالت سنبھل گئی "میں نے کہا" کلن کیا تمہیں پتہ ہے؟ رابعہ کا بھائی ایوب خاں کس خلیجی ملک میں ہے اور اپنی بہن کی مدد کرتا ہے۔" کلن نے میری بات درمیان ہی میں کاٹ دی اور کہا "سر آپ نے بھی دنیا دیکھی ہے اور دنیا کے حالات سے واقف ہیں اور خلیجی ممالک میں آج کل دی جانے والی تنخواہوں سے بھی واقف ہونگے اور یہ بھی جانتے ہونگے کہ ایوب خاں میں کون سی فنی صلاحیت ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کے علاوہ کیا وہ اپنی بہن اور اس کے بچوں کی بھی کفالت کر سکتا ہے؟ کلن کی بات معقول تھی اور میں لاجواب ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس درمیاں میں کلن نے اپنے بیگ سے جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا وہ سارے چیک دکھائے جو وہ ایوب خاں کے نام گزشتہ ۱۰ سال سے بھیجتا رہا ہے اور کہا "میں رابعہ کو اپنی بہن کی طرح چاہتا ہوں اور اپنے آپ کو اس کی بیوگی کا ذمہ دار سمجھتا ہوں اس لیئے میں نے رابعہ اور اس کے بچوں کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس کا مکان بنوایا اور اس کے بچوں کی پڑھائی لکھائی کا انتظام کروایا" اس نے مزید کہا کہ اس کی بھجوائی ہوئی رقم ہر ماہ ایوب خاں کی وساطت سے رابعہ کو مل جاتی ہے اور وہ یہ ذمہ

داری رابعہ کی یا اپنی زندگی تک نباہے گا۔ پھر ذرا رک کر اس نے کہا'' آفریدی صاحب خدا گواہ ہے کہ میں ابراہیم کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابراہیم میرا دوست تھا۔ اس کی گالی کہ'' کیا تو رابعہ کا یار لگتا ہے'' میری برداشت سے باہر ہوگئی اور میں مشتعل ہو کر اس پر وار کر بیٹھا۔ میں اس کی جان لینا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی قانون کی نظر میں ہی اس کا ذمہ دار ہوں آپ جیسا چاہیں مجھ سے سلوک کر سکتے ہیں لیکن میری گرفتاری سے پہلے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دیجئے کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں کوئی انتظام کر سکوں۔ میں نے کلّن کو گھر جانے کی اجازت دیدی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا بیوی اور بچے اور جما جمایا گھر اس کے پیروں میں بیڑی ڈال رہے ہیں۔

رات بڑی کشمکش میں گزری۔ میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا میرے سامنے دو راستے تھے ایک تو یہ کہ کلّن کو گرفتار کر کے لے جاؤں اور یہی اپنی ملازمت سے دیانتداری کا تقاضا بھی تھا لیکن اس صورت میں دو خاندانوں کی تباہی میرے سامنے سوالیہ نشان بن کر ابھر رہی تھی۔ ایک تو اس کا اپنا خاندان یعنی اس کی بیوی اور بچے جو اس کی زیر پرورش تھے دوسرا رابعہ کا خاندان کیونکہ رابعہ اور اس کے بچے بھی اس کے ہی زیر پرورش تھے اور اس کی کفالت کی ذمہ داری گذشتہ ۱۰ سال سے نباہ رہا تھا اور قرائن یہ کہہ رہے تھے کہ وہ آئندہ بھی یہ ذمہ داری نباہے گا۔ اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں اور واپس جا کر اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کر دوں کہ کلیم داد خاں عرف کلّن کا پتہ نہیں چل سکا جو سراسر میرے پیشے کے اصول اور Ethics کے خلاف تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اگر میں ایسا کروں تو کیا میرا ضمیر مجھے معاف کریگا۔؟

دوسرا دن بڑی کشمکش اور حالتِ کرب میں گزرا اور آخر کار میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور کلّن کو اپنے ہوٹل پر بلایا اور کہا کہ اسے میرے ساتھ چلنا پڑیگا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس سے ہمدردی ضرور ہے لیکن میں اسے یہاں چھوڑ کر خالی ہاتھ جا نہیں سکتا کیونکہ یہ میرے پیشے کے

اصول کے خلاف بات ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ کیا تم یہ بدنامی کا داغ اپنے ضمیر پر ساری زندگی محسوس نہیں کرو گے۔ تمھیں سچا سکون تو اس وقت ملے گا جب تم اپنے کیئے کی سزا نہ بھگت لو اور تمھارے دامن سے یہ دھبہ ہمیشہ کے لیے دھل جائے۔ کلّن خاموشی سے یہ سب سنتا رہا لیکن اس کے چہرے سے درد و کرب کے آثار نمودار تھے شاید وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بڑے ضبط سے بھرائی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہہ سکا میں ہر بات کے لیے تیار ہوں۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کرونگا میں نے اس سے کہا کہ میں اس کو ہر طرح مدد کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ وہ بھی میرے ساتھ کوآپریٹ کرے اور وہی کرے جیسا کہ اس سے کہا جائے۔ میں نے اُسے اپنے پلان سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا کہ یہ سب کچھ قبل از وقت ہوگا اور اگر میں اس سے کسی بات کا وعدہ کرلوں اور اسے کسی بات کا یقین دلا دوں اور وہ بات ہونے نہ پائے تو مجھے اس کے سامنے شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق ایک ہفتہ کی مہلت دی کہ اس عرصہ میں وہ اپنی بیوی بچوں کا کوئی انتظام کردے۔

اس قتل کے سارے واقعے میں ایک جملہ جو مقتول کی زبان سے ادا ہوتھا ''کیا تو میری بیوی کا یار لگتا ہے۔'' بڑی اہمیت رکھتا تھا اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو کلّن کے بچاؤ کی کوئی صورت نکل سکتی تھی۔ اسی خیال کے تحت میں نے کلّن سے پوچھا کہ کیا اسے اس رات کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے اور کیا اس کا ابراہیم خاں سے جھگڑا ہوتے ہوئے اور ابراہیم خاں کا اسے گالی گلوچ کرتے ہوئے کسی نے دیکھا اور سنا ہے۔ کلّن نے کہا'' مجھے اس رات کی ایک ایک بات اچھی طرح یاد ہے اور یہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ابراہیم خاں نے جب مجھے مکا مارا اور گالی دیتے ہوئے کہا تھا'' کیا میری بیوی کا یار لگتا ہے'' تو اسی وقت یونیک بار کا ملازم جوزف باہر نکل رہا تھا اس نے یہ سب دیکھا اور سنا ہوگا''

میں نے اپنے پلان کی تیاری مکمل کرلی تھی اور میں نے ڈی ایس پی مسٹر بھٹی کو Mission Accomuplished اور روانگی کی اطلاع دے دی۔

بھٹی صاحب نے جب کلّن کو دیکھا تو اسے پہچان نہ سکے کہاں وہ پوری بستی کا دادا گیر جس سے سب لوگ کانپتے تھے کہاں وہ آج کا کلّن بھیگی بلی بنا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے بھٹی صاحب کو اس کے گذشتہ ۱۲۔۱۴ سال کے حالات سے آگاہ کر رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کو اس پہلی ملاقات میں اسے دیکھ کر حیرانی نہیں ہوئی۔ ماضی کا ایک آوارہ منش اور بستی کا دادا گیر آج کا ایک شریف نیک اور بیوی بچوں والا ذمہ دار آدمی تھا بھٹی صاحب بھی خوش تھے کہ جب وہ دلا ور نگر تھانے کے انچارج تھے تو انھوں نے یہ کیس درج رجسٹر کیا تھا اور آج ان ہی کے ہاتھوں اس کیس کی تفتیش مکمل ہو کر ملزم عدالت میں پیش ہونے جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی جب اس کے بدلے ہوئے حالات اس کا سدھرا ہوا چال چلن اور بہ حیثیت باپ اور شوہر اس کی ذمہ دارانہ شخصیت بھٹی صاحب کے سامنے آئی تو گو کہ ان کے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور پیدا ہوا لیکن پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے جہاں میں مجبور تھا وہیں وہ بھی تھے اور اس بات سے تو وہ بے حد متاثر ہوئے کہ گذشتہ ۱۰۔۱۱ سالوں میں کلّن نے ابراہیم خاں کی بیوہ رابعہ خاتون اور اس کے بچوں کی پرورش کر رہا ہے اور ان کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔

میں نے کلّن سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق شہر کے ایک مشہور فوجداری وکیل کا انتظام کروا دیا۔ جنھوں نے کلّن اور ابراہیم کی دوستی اور واقعہ کی رات دونوں کا جھگڑا اور خصوصیت سے جوزف کے بیان سے یہ ثابت کیا کہ یہ واقعہ ''قتل عمد'' کا نہیں بلکہ Sudden and (Grave Provocation) (ایسی بات جو کسی آدمی کو یکا یک مشتعل کر دے اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور وہ کام کر بیٹھے جسے اس کا احساس نہ ہو) کا کیس ہے جو ابراہیم کے یہ کہنے سے کہ ''کیا تو میری بیوی کا یار ہے'' کلّن مشتعل ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور ابراہیم پر حملہ کر دیا۔ جب کہ وہ ابراہیم کی بیوی کو بہن کی طرح چاہتا تھا اور ایک بھائی کی ذمہ داری رابعہ اور اس کے بچوں کی کفالت کر کے آج تک نبھا رہا ہے۔

واقعات اور حالات کی روشنی میں کلیم داد خاں عرف کلّن قتل عمد کے الزام سے تو بری ہو گیا

لیکن ابراہیم خاں پر چاقو سے حملہ کر کے زخمی کرنے پر جج نے ضرب شدید کی دفعہ کے تحت ۳ ماہ کی قید سنائی اور اس کے ساتھ ہی کلّن کی ۱۴ سالہ پرامن زندگی اور بہترین کیریکٹر اور اس کے ساتھ ہی مرحوم ابراہیم خاں کے بیوی بچوں کی کئی سال سے کفالت کرنے پر اس کی یہ سزا بھی معاف کر دی گئی۔ اور بھٹی صاحب اپنے وعدے کے مطابق اس فیصلہ کے خلاف اوپر کی عدالت میں اپیل کرنے کے حق سے دستبردار ہو گئے۔

جب کلیم داد خاں عرف کلّن کے۔ سے۔ بھائی واپس جانے لگا تو مجھ سے ملنے آیا اور میرے گلے لگ کر ایک معصوم بچے کی طرح دھائیں دھائیں رونے لگا۔ جب اس کے جذبات قابو میں آ گئے تو کہا ''آفریدی صاحب میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھے دوبارہ زندگی دی۔ اب میں سر اٹھا کے جی سکتا ہوں جس اذیت ناک کرب اور بے چینی سے میں دوچار رہا اور زندگی بھر رہتا وہ آپ نے دور کر دیا اور وہ داغ جو سینے کا ناسور بن کر مجھے ایک عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا دھل گیا۔ جس قاتل کی تلاش تھی وہ آپ کو مل گیا اور جس سکون اور راحت کی تلاش تھی وہ مجھے مل گیا۔ گو کہ عدالت نے مجھے قتل عمد کے الزام سے بری کر دیا جو کہ ایک حقیقت بھی ہے لیکن مجھے ہمیشہ خلش ستاتی رہے گی کہ نہ میں اپنے دوست ابراہیم خاں پر چاقو سے حملہ کرتا اور نہ اس کی جان جاتی۔

آصف الرحمٰن طارق (نیو جرسی۔ امریکہ)

خاندانی

چلتے چلتے جب رات ہوئی تو ان دونوں کو پڑاؤ ڈالنے کی سوجھی۔ منزلوں پر منزلیں مارتے وہ یہاں تک تو پہنچ گئے تھے، پھر بھی کئی کوس کی مسافت باقی تھی۔ ان کے اندازے کے مطابق ان کو ابھی بھی تقریباً دو دن اور ایک رات اور چلنا تھا۔ تھکن کے مارے دونوں کا برا حال تھا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ اگر اب بھی چلتے رہے تو ڈھیر ہو جائیں گے۔ بھوک نے ان کی تھکن کو سہ آتشہ بنا دیا تھا۔ توشہ دان کھنگالا تو آدھی روٹی اور سالن کا بچا کچھا لب دھڑا شوربہ پڑا تھا ۔جس سے ایک ڈاڑھ بھی گرم نہ ہوتی۔ اس لیے کہیں رُکنا اور رُک کر کچھ کھانا اب ان کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا سانس لینا۔ مگر ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو کسی بھی بستی کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ راستہ بھی سنسان۔ کسی قسم کی کوئی آہر جاہر نہیں کہ کسی کو روک کر کم از کم کسی بھٹیار خانے یا کسی سرائے کا پتا پوچھتے معاً ان کو خیال آیا کہ کسی نے اس علاقے میں کسی پیر صاحب کے مزار کی بات کی تھی، بجواب ان کی بے حد ناقص اطلاع کے مطابق یہیں کہیں اریب قریب ہی تھا۔ انہوں نے قیاس آرائیاں شروع کیں کہ مزار کس طرف ہو سکتا ہے۔ مگر مزار کوئی بجلی کے کھمبے تو نہیں ہوتے جو تاروں سے اپنی سمت کا پتہ بتا دیں۔ لاکھ سر مارنے کے باوجود بھی ان کو مزار کا سراغ نہیں ملا۔ قبل اس کے کہ ان کی ہمتیں جواب دے جاتیں، ان کے دماغ میں ایک بجلی سی کوندی۔ اُن کو یاد آیا کہ کسی نے اُن کو بتایا تھا کہ مزار ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ہے۔ اب رات کے وقت اُس پہاڑی کا رخ معلوم کرنا بھی دقت طلب تھا۔ پھر بھی اندھیرا ابھی اس قدر گہرا نہ تھا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ لشتم پشتم انہوں نے کسی نہ کسی طرح پہاڑی کی سمت معلوم کی اور اسی طرف چل پڑے۔ دور سے ان کو بے حد مبہم سا ایک ٹیلا نظر آیا جو ان کے قیاس کے مطابق ایک پہاڑی ہی تھی۔ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ اندھیرے میں جوا

کھیلتے اور نتیجہ خدا کے سپرد کر دیتے۔ مگر قسمت نے یاوری کی۔ قریب پہنچے تو وہ نہ صرف پہاڑی ہی تھی بلکہ اپنے دامن میں ایک مزار کی حاملہ بھی۔ دراصل انہوں نے بعد میں مزار کے ذریعہ ہی پہاڑی کی تشخیص کی۔ پہاڑی تو اس قدر چھوٹی تھی کہ قریب آنے کے باوجود بھی ایک دھند لکا ہی بنی رہی مگر مزار کے اندر کی روشنیاں اور زندگی کی چہل پہل ان کو کافی دور سے ہی نظر آ گئی، بلکہ سنائی بھی دے گئی۔ چونکہ جمعہ کی رات تھی اس لیے مزار پر قوالی کا اہتمام تھا۔ قوال خوش گلو نہ تھے مگر جاندار خوب تھے۔ ان کی تانیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں اور ان کی یہی تانیں ان کے لیے مشعلِ راہ بنیں۔۔۔ وہ ان کی آوازوں کی سمت بے دھڑک چل پڑے اور دیکھتے دیکھتے مزار پر پہنچ گئے۔ رات میں ان کو مزار کی بیرونی شناخت نے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔۔ بے حد عام سی عمارت تھی۔ احاطہ البتہ وسیع تھا جو چاروں طرف سے دیواروں کے حلقے میں بند تھا۔ مزار کے چار دروازے تھے جو چاروں کے چاروں احاطے میں کھلتے تھے۔ مزار کے اندر قوالی زوروں پر تھی۔ کافی خلقت تھی جن کی جوتیاں بڑی بے ترتیبی سے چاروں دروازوں کے آگے بکھری پڑی تھیں۔ انہوں نے یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ احاطے کے اندر لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی چند چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں جہاں مزار سے متعلق مختلف قسم کی چیزیں فروخت کے لیے موجود تھیں۔ ایک پر پھول اور پھولوں کے ہار، اگر بتیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔۔۔ دوسری دکان ان کے مطلب کی نکلی اس پر چائے پانی کے علاوہ کھانے پینے کی دوسری چیزوں کا انتظام بھی تھا۔۔ انہوں نے جھٹ اس دکان کا رخ کیا۔ پیٹ پوجا کا اہتمام کیا اور جب سیر ہو گئے تو سونے کی ٹھانی۔ دکاندار سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ بستی قریب ہی ہے مگر بستی جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دور دور سے لوگ مزار پر آتے ہیں اور یہیں احاطے میں پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ اکثر لوگ رات کو یہیں رہ جاتے ہیں۔ احاطے میں رات کو سونے پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ احاطے کے پیچھے پانی کے نلکے ہیں۔ حمام ہیں جنہیں استعمال کرنے کی کھلی آزادی ہے۔ جب ان کا پیٹ بھر گیا اور رات رہنے کے انتظام سے بے فکری ہوئی تو ان کو

مزار اور مزار میں مدفون پیر کا خیال آیا۔ انہوں نے دکان دار سے پیر صاحب کے متعلق معلوم کیا تو پتا چلا کہ پیر صاحب کے مزار کا دور دور تک شہرہ ہے۔ کوئی نامی گرامی پیر تھے جو یہاں مدفون ہیں کسی کو اُن کے نام کا علم نہیں تھا وہ صرف بڑے پیر صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے اور اسی نام سے مشہور تھے۔ عقیدت مند دور دور سے آتے۔ منتیں مانتے اور مرادیں پاتے۔ کچھ لوگ ان کو کرامت والے اور معجزے والے پیر بھی کہتے تھے۔

پیر صاحب کے مزار کی ایک اور بڑی خصوصیت وہاں کے چھوٹے پیر صاحب تھے، جو تھے تو مزار کے مجاور مگر بڑے پیر صاحب کے لیے دل میں بڑی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ جب سے مزار بنا تھا انہوں نے اس کی دہلیز کی مٹی لے ڈالی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن انہوں نے مزار کی چوکھٹ کو نہ چھوڑا تھا۔ عقیدت مند آتے تو ان کی لگن اور شدتِ جذبات کو دیکھ کر نذر اور نیاز میں سے ان کو حصہ دیتے جس کو وہ فوراً غریبوں میں تقسیم کر دیتے۔ اپنے لیے اتنا ہی رکھتے جتنے کی ان کو ضرورت ہوتی۔ لوگ چھوٹے پیر صاحب کو وہ رتبہ تو نہ دیتے جو بڑے پیر صاحب کا تھا تاہم ان کی عزت توقیر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ سرِ دست یہ معلومات ان دونوں کے لیے کافی تھیں۔ چونکہ تھکاوٹ کے مارے ان کا برا حال تھا اور نیند نے ان کو ادھ موا کیا ہوا تھا اس لیے انہوں نے قوالی سننے اور چھوٹے پیر صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کے پروگرام کو اگلے دن تک ملتوی کر دیا اور احاطے کے ایک قدرے پرسکون کونے میں لمبی تان کر سو گئے۔

دوسرے دن ان کو علی الصبح ہی اٹھا دیا گیا۔ چھوٹے پیر صاحب بنفسِ نفیس خود اپنے ہاتھوں سے مزار کی جھاڑو دیتے تھے۔ جو عقیدت مند ہوتے وہ بھی ساتھ لگ جاتے اور پیر صاحب کا ہاتھ بٹاتے۔ ان دونوں نے چھوٹے پیر صاحب کو جھاڑو دیتے دیکھا تو ان کے لیے اپنے دل میں عقیدت سی محسوس کی اور اسی جذبے کے تحت وہ بھی چھوٹے پیر صاحب کا ہاتھ بٹانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

چھوٹے پیر صاحب کے لیے یہ معلوم کرنا قدرے مشکل نہ تھا کہ وہ دونوں اجنبی ہیں وہ اس لیے کہ آس پاس کے جتنے لوگ مزار پر حاضری کے لیے آتے چھوٹے پیر صاحب کے لیے نذر نیاز ضرور لاتے، اس لیے پیر صاحب تقریباً سب ہی کو جانتے تھے۔ یہ دو چہرے ان کو نئے نظر آئے تو پیر صاحب نے بڑی شفقت سے ان کو اپنے پاس بلایا اور بڑی دیر تک ان کا حال احوال معلوم کرتے رہے۔

چھوٹے پیر صاحب کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور تھی، جس نے ان دونوں کے دلوں کو ان کی محبت اور عقیدت سے بھر دیا۔ حالانکہ دوسرے دن ان کو اپنے باقی ماندہ سفر پر روانہ ہونا تھا، مگر چھوٹے پیر صاحب کی مقناطیسیت نے اُن کو ایسا کھینچا کہ انہوں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا کہ چند ایک دن وہ ضرور وہاں رہیں گے اور پیر صاحب کی خدمت کریں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ہر چند کہ وہاں دیگر عقیدت مند بھی تھے جو بڑی تن دہی سے پیر صاحب کی خدمت میں لگے ہوئے تھے، مگر ان دونوں نے کچھ زیادہ ہی جوش اور ولولے سے چھوٹے پیر صاحب کی خدمت کی۔ پیر صاحب کی خدمت کرنیوالے تو اور بہتیرے لوگ موجود تھے جو دن رات ان کی اللہ آمین میں لگے رہتے تھے۔ کوئی صبح کا ناشتہ لا رہا ہے تو کوئی دوپہر کا کھانا لئے چلا آرہا ہے۔ رات کے کھانے کا انتظام مستقل طور پر علی نواب خاں کے ذمہ تھا جو اس علاقے کے بہت بڑے تو نہیں پھر بھی چھوٹے موٹے چودھری ضرور تھے اور گاؤں میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ لوگوں کے اس خلوص اور عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ مزار پر روزانہ سیکڑوں آدمیوں کا کھانا آجاتا اور روز لنگر بٹتا۔ علاقے کے غریب، مسکین اور فقیر دوڑے دوڑے مزار کی راہ لیتے، مفت کی روٹیاں توڑتے اور دوسرے روز دندناتے ہوئے پھر آجاتے۔ کھانے پینے کی ہی نہیں چھوٹے پیر صاحب کو زندگی کی دوسری ضروریات کی طرف سے کوئی فکر نہ تھی۔ فقیر آدمی تھے اس لیے موٹا جھوٹا پہن لیتے۔ تہبند پر صرف یک سفید کرتا پہنتے، اور سر کو بڑی باقاعدگی سے ایک سندھی ٹوپی سے ڈھکے رکھتے۔ سوتے وقت بھی ٹوپی کو سر سے نہ اتارتے،

کہتے تھے کہ یہ سنت نبویؐ ہے۔ کپڑے بے حد سادہ ہوتے چونکہ صفائی پسند تھے، اس لیے ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے۔ مریدوں نے کپڑوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے اس لیے روز ایک جوڑا بدل لیتے۔ میلا جوڑا ہاتھوں ہاتھ دھلنے کو چلا جاتا اور ٹِنک سے سِک واپس لا کر حجرے میں رکھ دیا جاتا۔

جسمانی اعتبار سے بھی چھوٹے پیر صاحب سکھی تھے۔ جو لوگ فاتحہ پڑھنے آتے وہ بے حد ادب سے اُن کو سلام کرتے اور مؤدب ہو کر ان کے پاس بیٹھ جاتے۔ اپنی اپنی بپتائیں سناتے اور مشوروں اور دعاؤں کا نذرانہ وصولتے۔ اس دوران کوئی نہ کوئی عقیدت مند کھجور کے سوکھے پتوں کا پنکھا جھلتا رہتا۔ کوئی ان کے پاؤں دباتا اور کوئی ان کے حکم کی تعمیل میں ان کے دیگر احکامات بجا لاتا۔ بظاہر ان دونوں کے لیے اب کوئی خدمت باقی نہیں بچی تھی جس کو وہ پیر صاحب کے لیے مخصوص کرتے پھر بھی انہوں نے ان کی دہلیز کی مٹی لے ڈالی۔ دوسروں سے چھین چھین کر پیر صاحب کے کام خود سے کیے۔ گھنٹوں ان کو پنکھا جھلا۔ ان کے پاؤں دبائے۔ ان کے کھانا کھانے کے دوران بھاگ بھاگ کر ان کو پانی پلایا۔ پیر صاحب حمام جاتے تو اُن سے پہلے اُن کی بدھنی حمام پہنچ جاتی۔ مزار کی صفائی ستھرائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پیر صاحب کی طرف سے ان کے عقیدت مندوں اور ضرورت مندوں کی جیسے وہ پیر صاحب کے نہیں خود اُن کے مہمان ہیں۔ جو بھی مزار پر فاتحہ پڑھنے آیا ان کے ساتھ ہر بار فاتحہ میں شریک ہوئے۔ جمعہ کی رات قوالی کی محفل جمی تو وہ حال کھیلا کہ ایک بار تو پیر صاحب بھی دنگ رہ گئے کہ یا خدا یہ ماجرا کیا ہے۔

دوسرے روز شام ڈھلتے ڈھلتے انہوں نے پیر صاحب کی نظروں میں جگہ بنالی۔ اُن دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ پیر صاحب ان کی خدمت گزاری اور مستعدی کو تحسین کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ پیر صاحب نے از راہِ نوازش ان سے باتیں بھی کیں اور ان کو دعائے خیر میں خاص طور سے یاد کیا۔

تین دن متواتر پیر صاحب اور مزار کی دیکھ ریکھ میں لگے رہے۔ ان تین دنوں میں انہوں نے اب پیر صاحب کے دل میں جگہ بنالی تھی اور ان پر اب مسلسل پیر صاحب کی نظرِ عنایت تھی۔ تیسرے دن معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ پیر صاحب نے ان کو اپنی ہی غوری میں کھانا کھلایا اور اپنی ہی کٹوری میں ان کو پانی پلایا۔ تیسری رات انہوں نے باری باری جاگ کر گزاری۔ اُس رات گرمی زیادہ تھی اس لیے جب تک پیر صاحب سو نہیں گئے، ان دونوں میں سے ایک نے پنکھا ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک سوتا تو دوسرا پنکھا جھلتا اور یہ عمل رات بھر جاری رہا۔ صبح ہوتے ہوتے پیر صاحب پر اُن کی خدمت گزاری کے نقش بڑے گہرے ہو گئے۔ اس لیے جب انہوں نے پیر صاحب سے اجازت چاہی کہ ابھی طویل سفر باقی ہے تو پیر صاحب نے ان کے باقی ماندہ سفر کے بارے میں پوچھا اور جب راستے کی مشکلات کا ذکر سنا تو از راہِ شفقت و ہمدردی اپنا پرانا پالتو گدھا ان کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ رکھیں، تا کہ وہ ان کا سامان ڈھو سکے اور سفر آسان ہو جائے۔ پہلے تو انہوں نے پس و پیش کیا مگر پیر صاحب کے اصرار کے سامنے ان کی ایک نہ چلی تو بڑے ادب کے ساتھ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ان کے اس تحفے کو قبول کیا اور اس کو اپنے لئے عزت اور خوش بختی کا سبب گردانا۔ بادلِ ناخواستہ اور بوجھل طبیعت کے ساتھ انہوں نے پیر صاحب سے اجازت لی اور ان کو خدا حافظ کہا۔ گدھے کی لگام کو جو ایک بے حد بوسیدہ رسی کی شکل میں تھی، ہاتھ میں پکڑا اور عقیدت کے ساتھ اس کو مزار کے احاطے سے باہر نکال کر آگے چل پڑے۔

دن بھر اُن دونوں کا سفر بغیر کسی تکلیف کے گزر گیا۔ پیر صاحب نے زادِ راہ کے طور پر کھانے پینے کا وافر انتظام ان کے ساتھ کر دیا تھا جو اُن کے مزید تین چار دن تک کام آتا۔ رات ایک جگہ پھر پڑاؤ کرنا پڑا تو انہوں نے برگد کے ایک تناور اور گھنے درخت کا انتخاب کیا۔ گدھے کو انہوں نے پاس کے ہی دوسرے درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ ابھی وہ پیر صاحب کے دیئے ہوئے من و سلویٰ کو نوشِ جان کر کے سونا ہی چاہ رہے تھے کہ گدھے نے یکا یک ایک

طویل سی جُھرجُھری لی اور پٹ سے زمین پر گر گیا۔ یہ عمل اس قدر تیزی سے ہوا کہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ ہو کیا گیا۔ بھاگ کر انہوں نے گدھے کا معائنہ کیا تو پتا چلا کہ وہ غریب تو اب مرحوموں اور مغفوروں میں اپنا نام لکھوا چکا ہے۔ ان کے دل پر پتھر سا آن گرا کہ یا خدا، یہ کون سا قہر ہے۔ پیر صاحب کی دی ہوئی سوغات جس کو وہ اپنے لیے بھاگوان سمجھ رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سامنے یوں اچانک دم توڑ دے گی۔ اُن کے دل قدرے بوجھل ہو گئے۔ تھوڑی دیر وہ گُم سم بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر باہمی صلاح اور مشورے سے انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ چونکہ پیر صاحب کی دی ہوئی چیز متبرک ہے اس لیے اس کو اس طرح کھلے آسمان کے نیچے چھوڑ کر جانوروں کی خوراک نہیں بننے دیں گے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس کو احترام کے ساتھ دفنا دیا جائے۔ بغیر کسی کدال پھاوڑے کے لشتم پشتم انہوں نے ایک گڑھا کھودا اور پیر صاحب کی امانت پر مٹی ڈال کر چھوٹی سی ایک قبر بنا دی اور جو لمبی تان کر سوئے تو صبح اس وقت آنکھ کھلی جب ان کو اپنے اِردگرد کچھ گُھسر پُسر سی محسوس ہوئی۔ آنکھ کھلی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اس لیے کہ جو منظر اُنھوں نے دیکھا وہ وقتی طور پر ان کے لئے نا قابلِ یقین تھا۔ بلکہ یہ منظر دیکھ کر وہ نہ صرف یہ کہ گھبرا گئے بلکہ ڈر بھی گئے۔ ہوا یہ کہ چند ایک لوگ جو اُدھر سے گزرے ان میں سے کچھ ضعیف الاعتقاد بھی تھے انہوں نے برگر کے نیچے ایک قبر دیکھی، دو آدمیوں کو اس قبر کے پاس سوتا ہوا دیکھا تو اللہ جانے کیا سمجھے کہ فاتحہ پڑھنی شروع کر دی اور دونوں کو مجاور سمجھ کر کچھ پیسے ان کے آگے ڈال دیئے۔ ان کی دیکھا دیکھی چند اور لوگوں نے بھی جو اس وقت وہاں سے گزر رہے تھے، فاتحہ پڑھی اور چند ایک سکے ان دونوں کی نذر کر دیئے۔ وہ ہڑبڑا گئے اور کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ فاتحہ خوانوں میں سے ایک نے ان سے پوچھا۔ ''بابا۔ یہ کون سے پیر صاحب کی قبر ہے۔۔۔'' ان دونوں کے لیے یہ سوال بھی بڑا تکلیف دہ تھا۔ قبر میں کون دفن تھا یہ ان کو اچھی طرح سے معلوم تھا۔ وہ اس کو پیر کا رتبہ دے کے اپنے کو گنہ گار نہیں کرنا چاہتے تھے انہوں نے اپنے آگے پڑے ہوئے سکوں کو دیکھا تو کوندے

کی طرح بیک وقت ایک ہی خیال ان دونوں کے ذہن میں لپکا۔ ان دونوں کو بڑے پیر صاحب کا مزار اور اس کے مجاور کے طور پر چھوٹے پیر صاحب کی وہ ناز برداریاں یاد آ گئیں جو ان کے معتقد کر رہے تھے۔ وہ تو بہر حال کسی پیر کے مزار کے مجاور تھے، مگر یہاں تو اللہ میاں نے غالباً چھپر پھاڑ کر ان دونوں کو کچھ دے دیا تھا۔ انہوں نے یکلخت ایک فیصلہ کیا اور اس سوال کا جواب یوں دیا۔۔۔ ''بھائی۔۔۔ یہ پیر کراماتی کا مزار ہے بڑے عرصے سے کچا پڑا ہے ہمارا ارادہ ہے کہ اب اس کو پکا کرا کر احاطہ کھینچ دیں۔۔۔''

یوں بات آگے بڑھی اور بڑھتی چلی گئی۔ پیرا کراماتی کا مزار دیکھتے دیکھتے پکا بن گیا۔۔۔ ایک کچی سی چار دیواری کھینچ دی گئی رات میں دیئے بھی جلنے لگے۔ لوگ گزرتے تو فاتحہ پڑھتے۔ کچھ پیسے اور نذر و نیاز کی کچھ چیزیں کھانے کے ساتھ ان دو مجاوروں کو دے دیتے جو بڑی عقیدت اور خلوص سے مزار کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

چند دنوں میں مزار کی بات کچھ اور آگے بڑھی اور بڑھتے بڑھتے چھوٹے پیر صاحب تک جا پہنچی۔ چھوٹے پیر صاحب نے کسی کراماتی پیر کے مزار کا سنا تو ان کو اچنبھا ہوا کہ اچانک یہ پیر صاحب کہاں سے پیدا ہو گئے اور نہ صرف پیدا ہو گئے بلکہ ایک مزار کے مکین بھی بن بیٹھے۔ ان کو یہ بھی بتایا گیا کہ دو مجاور ہیں جو پیر کراماتی کے عقیدت مندوں میں سے ہیں اور مزار کی تمام تر ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر چھوٹے پیر صاحب کا ماتھا ٹھنکا انہوں نے اس مزار کی زیارت کی خواہش کا اظہار کیا اور ایک دن علی الصبح اس کی طرف چل پڑے۔ مزار پر پہنچ کر انہوں نے وہی منظر دیکھا جو تمام مزاروں پر ضعیف الاعتقاد قسم کے لوگوں کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ یہ بات ان کے لیے نئی نہ تھی۔ مگر مجاوروں کو دیکھ کر ان کی بھنویں تن گئیں۔ ان کو کچھ غصہ آیا مگر کچھ سوچ کر اور چند لوگوں کی موجودگی کے باعث خاموش ہو گئے اور ایسے وقت کا انتظار کرنے لگے جب کچھ تنہائی ملے اور وہ دونوں مجاوروں سے بات کریں۔۔

چھوٹے پیر صاحب کو دیکھ کر دونوں کی حالت غیر ہو گئی۔ اُن کو سانپ سا سونگھ گیا۔ بدن

سُن ہو گئے۔ ایسا کہ کاٹو تو لہو نہ نکلے۔ پیر صاحب کافی دیر تک مصلحتاً خاموش رہے۔ جب قدرے تنہائی ملی تو دونوں مجاوروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ دونوں کا خیال تھا کہ اب پیر صاحب کا عذاب نازل ہوگا۔ مگر ان کو توقع کے برخلاف پیر صاحب نے بڑی آہستگی اور نرمی سے سوال کیا۔ میاں۔۔۔ یہ کن کراماتی پیر کا مزار ہے۔ ہم نے تو آج تک نہیں سنا۔۔۔''

دونوں سر جھکائے شرمندہ بیٹھے تھے۔ پیر صاحب کے نرم رویئے نے ان کی ہمتیں کچھ بڑھا دیں، تو انہوں نے بات اُگل دی کہ کس طرح ان کے دیئے ہوئے گدھے کی یہ عزت و توقیر ہو رہی ہے۔ پھر انہوں نے یہ بھی کہا۔۔۔ ''سچ پوچھیں تو ہمارے دلوں میں بدی بھی آ گئی۔ یہاں کے لوگ ضعیف الاعتقاد ہیں۔ مزاروں اور مجاوروں کو ہتھیلی کا پھولا بنائے رکھتے ہیں۔''

چھوٹے پیر صاحب نے بڑے غور سے یہ باتیں سنیں اور سن کر ایک دم جیسے مراقبے میں پہنچ گئے اور چند لمحوں بعد جب اس کیفیت سے نکلے تو بڑا بھرپور اور جاندار قہقہہ لگایا۔ وہ دونوں پیر صاحب کے ردِ عمل کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا یہ قہقہہ پیر صاحب کے لعن طعن کرنے کا کوئی طریقہ ہے یا وہ واقعی خوش ہیں۔۔۔ بظاہر یہ موقع کسی خوشی کا موقع تو نہ تھا۔ انھوں نے سوچا کہ بڑے لوگوں کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں، وہ کسی طور سے بھی اپنے غصے یا مسرت کا اظہار کر سکتے ہیں۔

پیر صاحب نے بڑے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے احتیاط سے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور اس دوران انہوں نے بڑی آہستگی سے دونوں سے کہا۔

''معلوم ہوتا ہے تمہارا واسطہ کسی اعلیٰ نسل ونسب والے سے پڑ گیا ہے۔۔۔''

اتنا کہہ کر انہوں نے پھر بڑے غور سے ان دونوں کو دیکھا جو ہونقوں کی طرح پیر صاحب کی بات سن رہے تھے۔ پیر صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا۔۔ بولے

''کیا خدا کی قدرت اور شان ہے۔۔ یہاں یہ پوجا جا رہا ہے۔ اور جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں اس کا باپ پوجا جا رہا ہے۔ ارے میاں۔۔ خاندانی تھا خاندانی۔۔۔''

سلیم زاہد صدیقی

پاگل

جب سے دفتر میں کام کی کمی کا رونا رویا جا رہا تھا۔ یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ کمپنی اپنے اوور ہیڈز کم کرنے کے لیے اسٹاف میں کمی کرے گی اور شاید کچھ انجینئر نکالے جائیں گے۔ اسٹاف کے اکثر لوگ لنچ کے وقفے میں متوقع چھانٹی پر بات کرتے تھے ہر انجینئر اپنے آپ کو دوسرے انجینئر پر فوقیت دیتا مگر اسٹاف کی اکثریت کا خیال تھا جس کا اظہار وہ مجھ سے بھی برملا کیا کرتے تھے کہ اس چھانٹی میں میرا نام نہیں ہوگا۔ شاید اس لیے کہ میں کمپنی کا سب سے پرانا انجینئر ہوں۔ میرے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ مجھے مالکان کا قرب حاصل رہا تھا۔ کمپنی کے مالکان اکثر مجھ سے پروا جیکٹس کے بارے میں مشورہ کرتے رہتے تھے۔ میری محنت کردار خلوص اور ایمانداری کا تذکرہ وہ اکثر اپنے سٹاف سے مثال کی طرح کرتے تھے۔ داخلی سیاست میں ہمیشہ غیر جانبدار رہا تھا۔ ایک آدھ موقع پر جب کمپنی کے مالکان نے میری انا کے خلاف بات کی میں نے استعفیٰ پیش کر دیا تھا۔ میں نے ان کے احکامات سے کبھی روگردانی نہیں کی تھی ان تمام وجوہات کے باوجود میری برطرفی سارے اسٹاف کے لیے حیران کن تھی۔

صبح جب میں دفتر پہنچا تو میری میز پر ایم۔ ڈی صاحب کا پرچہ رکھا ہوا تھا ”دس بجے مجھ سے ملیں“ میں دس بجے ایم۔ ڈی صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا وہ سڑک پر کھلنے ولی کھڑکی کے پاس کھڑے تھے ”آؤ مہندس آؤ“۔ وہ مجھے مہندس ہی کہا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے میرا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے لے کر صوفے کی جانب آ گئے۔ ”کیا پیو گے۔ چائے یا کافی۔“

مجھے حیرت ہوئی یہ ان کا طریقہ نہ تھا۔ میں نے انکار کیا مگر انہوں نے انٹر کام پر دو کافی کا

آڈر دے دیا۔ میں سخت تذبذب کا شکار تھا۔ سارا ماحول اجنبی سا لگ رہا تھا۔ کوئی خاص بات ہے۔ میرے ذہن نے مجھ سے کہا اور میں فوجیوں کی طرح الرٹ ہو گیا" میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں۔" انہوں نے بولنا شروع کیا۔" آپ کہیے! میں الرٹ ہوں" میں نے کہا

انہوں نے جو کچھ کہا اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ کمپنی کے پاس کام نہیں تھا۔ جونیئر اور کم تنخواہ پانے والوں کو فارغ کرنے کے بجائے فیصلہ کیا گیا تھا کہ سینئر اور بھاری تنخواہ والوں کو جواب دیا جائے تا کہ برطرفی کے اس اقدام سے زیادہ خاندان متاثر نہ ہوں۔ میرا نام بھی ان میں تھا جنہیں ایک ماہ کے نوٹس کے ساتھ فارغ کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ میری ملازمت سے برطرفی کی اطلاع سارے آفس کو ہو گئی تھی سب مجھ سے افسوس اور حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے ایک ہفتہ میں سارا کام سمیٹ لیا۔ اب میں صرف خانہ پُری نوٹس پیریڈ میں دفتر آرہا تھا۔ کام تو ویسے بھی دفتر میں کسی کے بھی پاس نہ تھا۔

اسی دوران مزید تین سینئر انجینئر اور دو سینئر افسران نکالے گئے۔ ان لوگوں نے چاہا کہ وہ کورٹ کچہری کریں۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر میں نے معذرت کر لی۔ میرا کہنا یہی تھا کہ ایک تو ہمیں خود کمپنی کے حالات کا اندازہ ہے کہ کمپنی کے پاس کام نہیں ہے دوسرے یہ کہ جس کمپنی کے ساتھ ہم نے اتنی مدت کام کیا ہے۔ اب ان کے لیے مشکلات پیدا کرنا نمک حرامی ہو گی۔

ان کا کہنا تھا کہ سب ٹھیک ہے مگر ہم لوگ پرانے لوگ تھے نکالنا تھا تو لاسٹ کم فرسٹ گو۔ "پہلے آؤ آخر میں جاؤ" والی پالیسی اپنانی چاہیے تھی جیسا کہ ہوتا ہے۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ یہ ہمارے سوچنے کی بات نہیں۔

بہر حال انہوں نے کمپنی پر مقدمہ کر دیا جب کہ میں دوسری ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ مجھے بے روزگار دیکھ کر میرے ایک دوست شاہد نے مجھے اپنا پارٹنر بننے کی آفر دی۔ وہ

ایک اسٹیسٹ ایجنٹ تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں ان کے ساتھ مل کر ایک کنسٹرکشن کمپنی بنالوں۔ پلاٹ لے کر ان پر مکان تعمیر کراؤں اور بیچ دوں۔ مجھے اس کام میں کشش معلوم ہوئی۔ شاہد نے ایک ۵ مرلے کا پلاٹ خرید کر میرے حوالے کر دیا اور میں نے پلاٹ پر مکان کی تعمیر شروع کرادی۔ میں نے ہر کام اپنی مرضی اور انجینئرنگ کی تصریحات کے مطابق جاری رکھا اور جب مکان مکمل ہو گیا تو پتہ چلا کہ مکان پر آنے والی لاگت مکان کی بکنے والی قیمت سے زیادہ ہے جب شاہد کو اس کا پتہ چلا کہ مکان کی تعمیر سے بجائے منافع ہونے کے نقصان ہو رہا ہے تو وہ سناٹے میں آ گیا۔

''یار! تم نے تو میری لٹیا ڈبو دی۔ میں نے تو تمہیں انجینئر سمجھ کر پارٹنر بنایا تھا کہ تم کم لاگت میں کام مکمل کرادو گے اور یوں منافع زیادہ ہوگا۔ مگر تم نے تو میرا بیڑا ہی کر دیا۔ اگر میں کسی عام اور جاہل ٹھیکیدار سے بھی یہ کام کرواتا تو بھی مجھے کم از کم دو لاکھ کا فائدہ ہوتا۔''

میں نے کہا۔ شاہد! یقین جانو میں نے اس کام کو اپنا سمجھ کر ہی کرایا ہے۔ اس مکان کی تعمیر میں ایک پیسہ بھی ناجائز استعمال نہیں ہوا ہے۔'' ''پھر کیا وجہ ہے کہ تمہارے بنائے ہوئے مکان پر چار لاکھ روپے لاگت آئی جب کہ ایسے کتنے ہی مکان جو اطراف میں بنے ہیں ان پر ڈیڑھ پونے دو لاکھ سے زیادہ لاگت نہیں آتی؟''

''وجہ۔ وجہ ہے شاہد۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مکانات جو اس مکان کے اطراف میں بنے ہوئے ہیں۔ مکان نہیں دھوکے کی ٹٹی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دھوکا ہے جو مکان بن رہا ہے۔ وہ دھوکا ہے جو مکان بنا رہا ہے دھوکا دے رہا ہے۔ جو مکان بنوا رہا ہے وہ دھوکا کھا رہا ہے۔''

''اوہ! امجد بس کرو۔ خدا کے لیے بس کرو۔ اب میں سمجھا لوگ انجینئرز سے مکان کیوں نہیں بنواتے۔''

''نہیں شاہد یہ بس کرنے کی بات نہیں ہے۔۔ مگر تم بھی کیا کرو۔ تم بھی تو اسی معاشرے کا حصہ ہو اور ہمارا معاشرہ تو ہو ہی ایسا گیا ہے کہ ہم شتر مرغ بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم کسی خطرے کو

دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ کوئی دکھانا چاہے تو اس کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ اور اگر وہ پھر بھی بولتا رہے تو اسے پاگل قرار دے دیتے ہیں۔۔۔ تم مجھے پاگل قرار دو مگر مجھے بولنے دو۔ مجھے بولنے دو۔ کم از کم اگر ایک آدمی بھی میرا ہم خیال ہو گیا تو میں سمجھوں گا میری زندگی رائیگاں نہیں گئی۔۔۔ شاہد! میں نے اس مکان کی تعمیر کے دوران یہاں بننے والے اور مکانات بھی دیکھے ہیں۔ لوگ مجھ سے ملتے میرے مکان پر ہونے والے کام کی کوالٹی کو دیکھتے تو اکثر مجھ سے پوچھتے کہ صاحب مکان بنا رہے ہیں یا قلعہ۔ مجھ پر ہنستے میرا مذاق میری تعلیم کا مذاق میرے پروفیشن کا مذاق اڑاتے مجھے پاگل سمجھتے تھے، مجھے مشورہ دیتے کہ میں بھی اسی طرح کام کروں جس طرح وہ جاہل ٹھیکدار اور مستری کرتے ہیں کہ ایک ٹرک ریت میں چھ بوری سیمنٹ ملا کر دیواروں کے لیے بلاک بناتے ہیں۔ کالم اور چھت میں کنکریٹ کی بھرائی کے لیے جہاں سو کیوبک فٹ کنکریٹ میں کم از کم سولہ بوری سیمنٹ ڈالنی لازمی ہے وہاں صرف آٹھ دس بوری سیمنٹ ڈالتے ہیں۔ کم گیج کا سریا ڈالتے ہیں۔ کرش اسٹون یا گریول ڈالتے ہی نہیں بجری سے کام چلاتے ہیں۔

الغرض کہاں تک گنواؤں کہ کیا کیا غلطیاں کرتے ہیں۔ یہی بات میں نے سب کو سمجھانے کی کوشش کی اور یہ مثال بھی دی کہ بھائی دیکھو جس کا کام اسی کو ساجھے۔ جو جس کا کام ہے وہی اس کو سمجھتا ہے اور صحیح طریقے پر کر سکتا ہے۔ یہ مثالیں بھی دیں کہ کسی کشتی میں سوراخ ہو جائے تو اسے کوئی موچی بند نہیں کر سکتا کسی مشک میں سوراخ ہو جائے تو اسے کوئی بڑھئی بند نہیں کر سکتا۔ کوئی نرس ساری زندگی اگر کسی سرجن کے ساتھ دل کا آپریشن دیکھتی رہے تو بھی کوئی اس نرس سے آپریشن نہیں کرا سکتا۔ تم لوگ ایک طرف اپنا سوٹ سلوانے کے لیے اچھے اور ماہر درزی کی تلاش کرتے ہو۔ حالانکہ وہ سوٹ صرف چند ہزار روپے میں سلتا ہے۔ اگر اچھا نہ بھی سلا ہو تو بھی صرف ہزار کے نقصان پر افسردہ ہوتے ہو۔ غصہ کرتے ہو۔ مگر وہ مکان جو زندگی میں مشکل سے ایک بار ہی بنا پاتے ہو، جس کی تعمیر میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں جس میں اپنی زندگی بھر کا سرمایہ لگا دیتے ہو، جس کی چھت کے نیچے تم عافیت تلاش کرتے ہو۔ اسے ایسے غیر تعلیم یافتہ

ٹھیکیداروں۔ جاہل راج اور مستریوں کے حوالے کردیتے ہو جو مکان تو سستا بنا دیتے ہیں مگر تم یہ نہیں سوچتے کہ خراب اور غیر معیاری مٹیریل سے بنا ہوا وہ مکان ایک دھوکے کی ٹٹی ہوگا۔ اس کے غیر معیاری ہونے کے بارے میں ایک بار بھی نہیں سوچتے؟۔ شاہد! میں لوگوں سے یہ بات کہتا تو لوگ مجھ پر ہنستے اور آگے بڑھ جاتے"

"لوگ کیا، میں بھی تم پر ہنسوں گا۔ تمہارے پاگل پن پر ہنسوں گا۔ تم نے مجھے غرق کر دیا ہے۔ میں تمہارے پاگل پن پر ہنسنا چاہتا ہوں لیکن تمہارے ہاتھوں جو نقصان ہوا ہے امجد! مجھے اس کا غم ہنسنے کی بجائے رونے پر مجبور کرتا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ اس نقصان کو کس طرح پورا کیا جائے گا۔ دراصل بات یہ ہے کہ پلاٹ تمہارا اپنا نہیں تھا تعمیر پر پیسے، تمہارے نہیں تھے نا۔ اس لیے تمہیں اس نقصان کا افسوس نہیں ہے اس نقصان کا دکھ نہیں ہے کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ ہے تم کو کوئی دکھ؟"

"شاہد! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ کیونکہ میری نظر میں یہ نقصان ہے ہی نہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ دکھ اس لیے نہیں ہے کہ رقم تمہاری تھی تو یہ نہ صرف غلط بلکہ اتنی گری ہوئی سوچ ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ شاہد! اس مکان کو میں خود خرید لیتا ہوں تم کو تمہارا منافع مل جائے گا۔"

"تم لو گے اس مکان کو؟" وہ تمسخرانہ ہنسی ہنسا۔ "لو۔ ہاں لے لو۔ تم لے لو، میں منافع بھی چھوڑتا ہوں۔ دو لاکھ کا پلاٹ تھا اور چار لاکھ روپے لے آؤ۔ چھوڑ دیا میں نے منافع" شاہد نے کہا۔

"یہی تو ایک ایسی مجبوری ہے۔ جس نے مجھے اس وقت تمہاری باتس سننے پر مجبور کیا شاید ورنہ میں کب کا یہ چھ لاکھ تمہارے منہ پر مار چکا ہوتا لیکن تم فکر نہ کرو مجھے صرف ایک ماہ کا وقت دے دو ایک ماہ کے اندر اندر میں اس مکان کی قیمت تمہیں ادا کروں گا۔ خدا حافظ"

میں شاہد کے دفتر سے بڑی عجلت میں نکلا تھا۔ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر وعدہ کر لیا

تھا۔ اگر میں اپنے کُل اثاثے، بیوی کا زیور اور اس کے جہیز کی ہر چیز بھی فروخت کر دیتا پھر بھی چھ لاکھ روپے نہ بنتے۔ وہ گھر جس میں میں رہ رہا تھا پندرہ برس پرانا بنا ہوا تھا اس کی قیمت بھی لگائی جائے تو چار لاکھ سے زیادہ کا نہ بک سکتا تھا۔ پھر وہ مکان میرا ذاتی نہ تھا اس میں بھائی بہنوں اور ماں کا بھی حصّہ تھا۔

اس کو اگر فروخت کر دوں پھر بھی میرے حصے میں کیا آئے گا۔ میں پریشان حال گھر آیا۔ میرا چہرہ دیکھ کر بیوی پریشان ہوگئی پھر ماں نے کہانی سنی۔ وہ بھی پریشان ہوئیں۔ رات کھانا کھانے کے بعد میرے بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''بھائی جان! آپ پریشان نہ ہوں میرے پاس اس کا حل ہے۔ مہینہ تو بہت ہے ہفتہ بھر میں ہی آپ کی مشکل حل ہو جائے گی۔'' میں نے کہا ''وہ کیسے؟''

بھائی نے کہا اگر کوئی آپ کو اس مکان کے عوض چھ لاکھ روپے بھی دے دے اور دو فلیٹ بھی دے تو کیسا رہے گا؟

میں نے کہا ''مکان لینے والے کو میں نفسیاتی ہسپتال لے کر جا کر پہلے اس کی دماغی صحت کا سرٹیفکیٹ لوں گا۔ پھر مکان بیچ دوں گا۔''

بھائی بہت ہنسا اور پھر بولا ''بھائی آپ نہ جانے کس دنیا کے باسی ہیں۔ یہ کراچی ہے بھائی جان کراچی، یہاں لوگ کوڑی لے کر آئے اور کروڑی ہو گئے۔ جمال ٹھیکدار بہت دنوں سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ میں آپ کو راضی کروں کہ یہ مکان اسے ایک معاہدہ کے تحت دے دیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اس سے ایک معاہدہ کر لیں جس کی رو سے یہ مکان ہمارا ہی رہے گا مگر اسے توڑ کر بنانے کا کام وہ کرے گا اور ہمیں کوئی رقم خرچ نہیں کرنے پڑے گی بلکہ اس کی تعمیر کا خرچہ وہ اپنے پاس سے کرے گا۔''

''کیا بیوقوفی کی بات ہے کہ وہ یہ مکان توڑ کر بنائے گا اور خرچہ خود کرے گا۔ کیوں؟ وہ میرا ماما چاچا ہے؟ یا پاگل ہے۔''

ارے بھائی جان! پوری بات تو سنیں! اس کا پلان تو سنیں! دراصل وہ اس مکان کو توڑ کر۔اس پر پانچ منزلہ عمارت بنائے گا ہر منزل پر دو فلیٹ ہوں گے جب کہ گراؤنڈ فلور پر بارہ دکانیں بنائے گا۔اس طرح یہاں بارہ دکانیں اور آٹھ فلیٹ بنیں گے۔ہر فلیٹ کی پگڑی دو لاکھ روپے اور ہر دوکان کی پگڑی ایک لاکھ روپے آئے گی اس میں سے وہ ہمیں ۴ لاکھ روپے ادا کرے گا اور دو فلیٹ اور ۴ دوکانوں کے ہم مالک ہوں گے اور وہ ۶ فلیٹس اور ۸ دکانوں کی پگڑی لے گا۔ہمیں اس کی تعمیر پر خود ایک کوڑی بھی نہیں خرچ کرنا پڑے گی۔کہیے کیسی اسکیم ہے۔ہم اس سے بات کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اس وقت چھ لاکھ روپے دے دے اور بعد میں ہمیں ملنے والے دو فلیٹوں اور چار دکانوں کی پگڑی کی رقم آٹھ لاکھ روپے سے یہ چھ لاکھ کی رقم منہا کر لے؟"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ارشد۔" میں نے حیرانی سے بھائی سے کہا۔"تم کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ سب کچھ ناممکن ہے اور اگر ممکن بھی ہو تو۔کیا تم نے سوچا کہ ان آٹھ فلیٹ اور بارہ دکانوں کے لیے بجلی، پانی، سیوریج کا انتظام کیسے ہوگا۔؟۔۔بجلی کون دے گا۔۔اتنا پانی کہاں سے آئے گا؟ ۔۔۔سیوریج کہاں جائے گا؟"

"آپ کس دنیا میں ہیں بھائی جان! ہمیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا، بجلی کا کنکش اس مکان میں ہے یا نہیں؟ اسی سے سارے فلیٹس کو بجلی دیں گے "سب میٹر" الگ الگ لگا دیں گے۔"

"ارشد بے وقوفی کی بات نہیں کرو۔جانتے ہو یہ روز روز بجلی کا بریک ڈاؤن، بجلی کی تاروں کا ٹوٹنا، پانی کی لائن کا پھٹنا۔سیوریج کے گٹروں کا ابلنا۔اور پانی کی کمی کی شکایات کیوں ہوتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی بے قاعدگیاں ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔میرے بھائی! ہمارے انجینئرنگ کے ادارے کیا کریں، بدنام انجینئرز ہوتے ہیں۔انتظامیہ ہوتی ہے، میونسپل کمیٹی ہوتی ہے کے۔ڈی۔اے، اور بجلی فراہم کرنے کا ادارہ "کیسکو" ہوتا ہے۔مگر ان مسائل کی اصل وجہ کیا ہے؟ کوئی نہیں دیکھتا۔کوئی نہیں سوچتا۔ہم نہیں سوچتے۔سمجھو! بھائی سمجھو۔یہ ہمارے محلے کی اس گلی کا گٹر۔اس گلی کے دس گھروں کے لیے بنا تھا۔اس میں اتنی گنجائش تھی کہ دس گھروں کی

گندگی کو بہالے جائیے اب اگر ہر گھر پر آٹھ فلیٹ بن جائیں تو گلی کے انھیں گھروں کی گندگی اس گٹر کی گنجائش سے بہت زیادہ ہے۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟ وہ بجلی جو ہمارے گھروں میں آئی ہے ایک گھر کے لیے ہے اسی بجلی کو ہم اگر آٹھ فلیٹوں اور بارہ دکانوں کے لیے استعمال کریں گے تو کیا ہوگا؟۔ بجلی کے تاروں پر زیادہ بوجھ پڑے گا۔ بوجھ زیادہ ہوگا تار گرم ہوجائیں گے۔ تاریں جل جائیں گی۔ ٹرانسفر بار بار ٹرپ ہوتا رہے گا۔''

ارشد نے ہنسنا شروع کردیا ''بھائی جان! میں یہ سب نہیں جانتا میں تو دو اور دو، چار کا قائل ہوں جو باتیں آپ کر رہے ان کو کون سنتا ہے اور کون سنے گا۔ آپ یہ اسکیم نہیں بنائیں گے تو دوسرے رک تو نہیں جائیں گے۔ آپ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ شہر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''یہ تم نے کیسے کہا کہ شہر کو فائدہ نہیں ہوگا۔ کم از کم ایک مکان کا فرق تو پڑے گا۔''

''کیا فرق پڑے گا؟۔۔ گٹر تو پھر بھی ابلیں گے۔ بجلی تو پھر بھی جائے گی۔ ٹرانسفارمر تو پھر بھی ٹرپ ہونگے۔ پھر اگر ابلتے ہوئے گٹر میں آپ کے گھر کا سیوریج بھی شامل ہو تو کیا اور نہ ہو تو کیا۔''

''اسی سوچ نے ہمارے ملک کو یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ ارشد! بہر حال اس گھر پہ فلیٹس نہیں بنیں گے۔ یہ میری تعلیم اور میرے پروفیشن کے خلاف ہے قانون کے بھی خلاف ہے ا ور میری معاشرتی ذمہ داری کے خلاف ہے میں ایسا نہیں کروں گا''۔ میں یہ کہتا ہوا اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ جب میں اپنے کمرے میں جا رہا تھا تو میں نے سنا۔ میرا بھائی کہہ رہا تھا۔''بھائی جان کے دماغ پر غالباً نوکری چھوٹ جانے کا شدید اثر ہوا ہے''میں شاید اس کی بات کا اتنا اثر نہیں لیتا۔۔۔ مگر مجھے افسوس ہوا جب میں نے سنا کہ میری ماں اور بیوی بھی ارشد کی تائید کر رہی تھیں۔ میں بستر پر گر گیا اور تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔ نوکری چھوٹ جانے پر۔۔۔ خود کو پاگل کہے جانے پر۔۔۔ یا لوگوں کی عقل پر۔۔۔

قیصر طارق (نیو جرسی۔امریکہ)

میرے شہر میں امن ہو گیا۔

میں نے جب اپنے یارِ غار فاروق سے کہا کہ۔۔

”لو بھئی۔۔۔مبارک ہو۔۔اپنے شہر میں تو امن ہو گیا ہے۔۔۔۔“

میرا یہ جملہ سن کر فاروق کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔۔اس نے ہونقوں کی طرح مجھے دیکھا اور کہا۔۔

”ارے اللہ کے بندے۔۔۔جس شہر میں ہمہ وقت گولیاں چلتی ہوں۔گولیاں تو گولیاں بم پھوٹتے ہوں۔۔قدم قدم پر لاشیں گرتی ہوں تو میری جان۔۔۔وہاں امن کی بات کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ اس نے چیل کے گھونسلے میں ماس دیکھا ہے۔۔“

میں نے بے حد سکون سے فاروق کی بات سنی اور اُسی سکون سے سُنی اَن سُنی کر دی۔۔۔

میرے ہاتھوں میں اخبار تھا، جس کو چند منٹ پہلے میں نے آنکھوں کے سامنے سے ہٹا کر گود میں رکھ لیا تھا اور فاروق سے شہر میں امن کی بات کی تھی۔اتنا کہہ کر میں نے اخبار کو پھر اپنی گود سے ہٹایا اور اس کو ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے کر کے اُس کو پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔۔۔

میری اس حرکت پر فاروق کو بہت غصہ آیا کہ میں کس قدر نامعقول ہوں کہ پہلے تو میں نے ایک بات کا شوشہ چھوڑا اور جب اس نے میری بات کی وضاحت کی تو میں نے پھر اخبار آنکھوں کے سامنے کر لیا اور اس کو ایسا لگا جیسے میں نے اس کو درگزر سا کر دیا ہے۔فاروق کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے غصے کو قابو میں کیا، مگر ایک مصنوعی غصے کے سے انداز میں مجھ سے کہا۔۔۔۔

”تم سے بات کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی بھینس کے آگے بین بجائے۔۔۔ارے بندۂ خدا۔۔جواب نہیں ہے تو نہ دو۔۔یہی سہی۔مگر یہ کہاں کا اخلاق ہے کہ دوسرے کو سرے سے درگزر ہی کر دو۔۔“

اس بات کے باجود کہ میں نے فاروق کی سنی ان سنی کر دی تھی، اس نے یہ بات دل کو نہ لگائی اور پھر مجھ سے وہی سوال کر ڈالا جو اس نے شروع۔۔۔۔" ارے جس شہر میں لاشوں پر لاشیں گر رہی ہوں، وہاں امن کا کیا کام۔۔تمہارا بھی جواب نہیں ہے جو کہہ رہے ہو کہ شہر میں امن ہو گیا۔۔۔"

بات تو اس کی صحیح تھی۔۔ بلکہ بالکل صحیح تھی۔۔ یہ حقیقت ہے کہ شہر میں آگ سی لگی تھی۔۔انسانی جان کے آگے مکھی کی جان زیادہ اہم تھی۔۔۔کون سا دن ایسا تھا جب یہ خبر نہ آئے کہ اتنے مرے اور آج اتنے قتل ہوئے۔۔۔ بلکہ دن کی بات تو دور کی ہے، نوبت تو گھنٹوں اور منٹوں تک پہنچ چکی تھی۔۔۔

اللہ جانے ہمارے لوگوں کو کیا ہو گیا تھا کہ بات بعد میں کرتے تھے۔گولی پہلے مارتے تھے۔۔۔اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ گولی مارنے کی نہ کوئی وجہ تھی نہ کوئی بنیاد۔۔بس۔۔جس کا جب اور جہاں دل چاہا گولیاں داغ دیں اور چلتے پھرتے انسان کو ڈھیر کر کے رکھ دیا۔۔۔نہ یہ دیکھا کہ مرنیوالی کوئی عورت ہے یا کوئی مرد۔۔کوئی بچہ ہے یا کوئی ایسا جوان جس کی ابھی تک مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔کوئی بوڑھا ہے یا کوئی معذور۔۔بس ان کو تو مارنے سے غرض تھی۔۔۔

گھر کے بزرگ اللہ اللہ کا ورد کرتے اور اللہ سے کہتے۔۔۔۔

"یاالٰہی۔۔۔یہ ماجرا کیا ہے۔۔۔آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔۔۔نہ کوئی کسی کے لینے میں نہ کوئی کسی کے دینے میں۔۔۔اور نہ ہی کسی کو کسی سے بُغضِ للّٰہی۔۔تو پھر یہ کیسا ظلم ہے کہ یہ جانیں لی جا رہی ہیں۔۔۔۔"

یہ بات کسی کی بھی سمجھ سے باہر تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔۔۔

کوئی کہتا۔۔۔"انسان، انسان نہیں رہا۔۔حیوان بن گیا ہے۔۔۔" دوسرا کہتا۔۔۔ارے حیوانوں کی کیا بات کرتے ہو۔۔ان کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔۔۔۔"

ایک نے گرہ لگائی۔۔۔"ارے بابا۔۔تم جانوروں اور حیوانوں کی بات کرتے ہو۔۔لو

میں تم کو وہ نظم سناتا ہوں جس میں جانوروں کے حوالے سے جنگل کے قانون کی بات کی گئی ہے۔
لو۔۔۔وہ نظم سنو۔۔۔جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔

سنا ہے، جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے، شیر کا جب پیٹ بھر جائے
تو وہ حملہ نہیں کرتا۔۔۔۔
سنا ہے جب کسی ندی کے پانی میں
بئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو
پڑوسی مان لیتی ہیں۔۔۔
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوّے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے
سنا ہے، گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو
سارا جنگل جاگ جاتا ہے۔۔۔
ندی میں باڑ آجائے
کوئی پُل ٹوٹ جائے
تو کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری۔۔۔سانپ۔۔۔چیتا اور بکری
ساتھ ہوتے ہیں۔۔۔
سنا ہے۔۔۔جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے۔۔۔
خداوندا۔۔جلیل ومعتبر۔۔۔دانا و بینا۔۔منصف و اکبر
ہمارے شہر میں اب
جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر۔۔۔۔

کیا سچی بات کہی ہے شاعر نے۔۔ہم تو جنگلوں کے جانوروں سے بھی گئے گزرے ہو گئے ہیں۔۔۔
ہمارا تو کوئی دین اور ایمان بھی نہیں رہا۔۔۔
فاروق سے نہ رہا گیا۔۔اس نے شدّ و مد سے وہی بات دہرائی جو اس نے پہلے کی تھی۔۔اس نے کہا۔۔۔

''تم واقعی عقل سے عاری ہو گئے ہو۔۔۔یا پھر شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر یہ سمجھ رہے ہو کہ باہر کی دنیا میں تو چین ہی چین اور امن ہی امن ہے۔۔۔''

میں نے فاروق کی بات غور سے سنی۔۔۔مگر اپنی بات اسی مدلل طریقے سے دوہرائی۔۔۔میں نے کہا ''ہاں میں مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔۔۔لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، مگر پھر بھی اپنی بات دہراؤں گا کہ شہر میں امن ہو گیا ہے۔۔۔''
اس بار فاروق بھنا گیا اور قدرے دُرشتی سے سوال کیا۔۔۔
''تو پھر ایک مثال ہی دے دو، جس سے اندازہ ہو جائے کہ ہاں واقعی شہر میں امن ہو گیا ہے۔۔۔''
میں نے گردن ہلائی۔۔۔اور کہا۔۔''تم تو نرے گدھے ہو۔۔گاؤدی کے گاؤدی ہی رہے۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔۔۔یہ بتاؤ کہ امن کہتے کسے ہیں۔۔۔؟''
فاروق نے جواب دینے کے سے انداز میں کہا۔۔۔
''یہ تو کوئی بے وقوف بھی جانتا ہے کہ امن کیا ہوتا ہے۔۔۔
میں نے بیچ ہی میں فاروق کو ٹوک دیا اور پوچھا۔۔۔
''اگر تم کو معلوم ہے کہ امن کیا ہوتا ہے تو پہلے یہ بتاؤ کہ امن کی تعریف کیا ہے۔۔۔''
فاروق نے جواب دیا۔۔۔ارے عقل کے اندھے۔۔امن وہ ہوتا ہے جہاں کوئی اُٹھک پٹخ نہ ہو۔۔۔کوئی خون خرابہ نہ ہو۔۔سکون ہی سکون ہو۔۔تو سچ بولو کہ کیا ہمارے شہر میں امن ہو گیا ہے۔۔۔؟

میں زیادہ دیر فاروق کو شش و پنج میں رکھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے فوراً جواب دیا۔۔۔

''یہی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی میری جان۔۔۔ہاں۔۔۔امن وہی ہوتا ہے جہاں راوی چین لکھ رہا ہو۔۔۔تو آؤ۔۔۔میں تمہاری بات کا جواب دوں۔۔۔میری بات غور سے سنو۔۔۔بلکہ میرے منہ کے پاس کان لگا کر سنو کہ میں کہہ کیا رہا ہوں۔

''ارے میاں صاحب زادے۔۔۔دو لاشوں کے گرنے کے دوران کچھ وقفہ ہوتا ہے۔۔۔اس وقفے میں کچھ نہیں ہوتا۔۔۔کوئی لاش نہیں گرتی اور جب کوئی لاش نہیں گرتی تو سمجھو امن ہوتا ہے۔ ہاں امن اور صرف امن۔۔۔۔''

گزارش

بعض موصولہ نگارشات نظم و نثر ''الاقرباء'' میں بوجوہ شائع نہیں کی جاسکتیں جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے تاہم ایسے مسودات کے محترم مرسلین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تحریروں کی نقل اپنے پاس محفوظ فرمالیا کریں کیونکہ ادارہ کے لیے انہیں واپس بھیجنا ممکن نہیں۔ شکریہ

فرزانہ اعجاز (شکاگو) امریکہ

یہ کیسی رات

وہ کتنا سہانا دن تھا دو دن بعد اس کے گھر پر بہت سے لوگ رات کے کھانے پر آنے والے تھے وہ اسی کے انتظامات میں مصروف تھی کہ پاس کے کمرے سے اس کے شوہر نے اسے آواز دے کر بلایا، جہاں وہ کمپیوٹر پر اپنی 'ڈاک' دیکھ رہے تھے، کہنے لگے دیکھو تمہارا چھوٹا بیٹا کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کچن کا کام چھوڑ کر گئی اور 'ای میل' پر نظر ڈالی لکھا تھا۔۔۔ ابو یہاں ابھی آدھی رات ہے ہم سو رہے تھے کہ خواب دیکھا کہ آپ کے گھر کے دروازے کی کسی نے گھنٹی بجائی آپ نے دروازہ کھولا آنے والے نے کچھ کہا اور آپ نے گھبرا کر ارے کب کہاں کہا۔۔۔ ہم گھبرا کر اٹھ گئے بہت ڈر لگ رہا ہے دوبارہ سونے کی کوشش کی تو پھر وہی تسلسل سے خواب دیکھا ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ نے کوئی بہت بُری خبر سنی ہو آپ کے یہاں سب خیریت تو ہے نا؟۔۔ ای میل پڑھ کر اسنے اپنے شوہر سے کہا۔۔ اسے لکھ دیجئے کہ جب بھی باہر نکلے آیت الکرسی پڑھ کر خود پر دم کر لیا کرے۔ اور گاڑی ذرا سنبھل کر چلایا کرے۔۔ اور وہ باورچی خانے میں واپس آ کر کام میں مصروف ہو گئی ابھی دعوت میں دو دن باقی تھے مگر وہ اکیلی بہت سے لوگوں کا کھانا پکا رہی تھی ابھی تو مصالحہ پیس رہی اور دال 'چن' رہی تھی اور ایسے ہی کئی کام۔

دور دراز کے شہر میں اس کا بڑا بیٹا سرجن تھا وہ ہر بدھ کو اپنی گاڑی سے آ جایا کرتا اور جمعہ کی شام کو چلا جاتا تھا وہ بہت منع کرتی کہتی جلدی جایا کرو پہاڑی اندھیرا اور لمبا راستہ ہے وہ ناراض ہو جاتا کہتا۔۔ اماں۔۔ ہم آپ کے ہی پاس آتے ہیں اور آپ ہی منع کرتی ہیں۔ وہ دلاور سے کہتی۔۔ بیٹے منع نہیں کرتے ہیں، بس ذرا جلدی جایا کرو تا کہ روشنی روشنی میں اپنے گھر پہنچ جاؤ۔۔۔

اس کو بچپن ہی سے اندھیرے سے گھبراہٹ ہوتی تھی، ڈر لگتا تھا اندھیرا ہوتے ہی وہ اپنے اندر ہی اندر 'چھپ' جانے کی کوشش کرتی تھی نہ معلوم کیا بات تھی کہ وہ گھر کے باہر جانے سے

کتراتی اور ڈرتی تھی ویسے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی تھی بس ایک اندھیرا ہی تھا جو اس کے اعصاب پر چھایا رہتا تھا۔

اس کے کئی جاننے والے یہاں اپنی مدت ملازمت ختم کر کے اپنے ملک واپس جا رہے تھے اسی سلسلے میں جگہ جگہ ان کی الوداعی دعوتیں ہو رہی تھیں وہ خود بھی کئی جگہ مدعو تھی اب اس نے جمعہ کی دوپہر کو سب کو اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا یہ سوچ کر کہ اس کا بیٹا بھی ہوگا اور دن میں فارغ ہو کر سرِ شام ہی وہ روانہ ہو سکے گا۔۔۔ وہ بہت خوش تھی اس کو اپنے بیٹے کے لیے اپنے ملک میں ایک لڑکی پسند آ گئی تھی اسی وجہ سے وہ خود بھی اپنی پوری فیملی کے ساتھ اپنے ملک اپنے شہر جا رہی تھی دو روز پہلے ہی پتہ لگا کہ جمعہ کو دوپہر کی نماز میں 'بڑی مسجد' کا افتتاح بھی ہے اور وہاں بڑے بڑے لوگ آئیں گے تو کہیں اس کے گھر کا رستہ بند نہ ہو۔ عین وقت پر نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے دن کی دعوت رات کے کھانے میں تبدیل کر دی اب اس کو یہی فکر تھی کہ کھانا وقت پر ہو جائے اور اس کا بیٹا جلدی روانہ ہو جائے۔

ایک دن پہلے اس کا بیٹا بھی آ گیا کیونکہ اگلے دن اس کا آف تھا آپریشن ڈے نہ تھا وہ کچن میں مصروف تھی وہیں رکھی کرسی پر بیٹھا اس سے باتیں کرتا جا رہا تھا اچانک کہنے لگا۔۔ اماں۔ ہم نے عجب خواب دیکھا ہے ہم کو کچھ ہو گیا ہے اور ہم آپ سے منع کر رہے ہیں کہ آپ روئیے نہیں ۔۔ وہ کھانا پکاتے پکاتے رک گئی اور ڈرے ڈرے دل میں اس کے چھوٹے بھائی کا خواب یاد کرنے لگی، اس کا دل آپ ہی آپ دھک دھک کر رہا تھا اور وہ وہ تمام دعائیں پڑھ رہی تھی جو اس کو یاد تھیں اب اس کا دل بالکل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا کہنے لگی۔۔۔ بیٹا تم لوگ ہماری بات نہیں مانتے ہو ہم کو اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔'' بیٹا اس کو تسلی دینے لگا کہنے لگا اماں آپ کیوں گھبراتی ہیں ساری دنیا گھومتی رہتی ہے اور میں تو دعائیں پڑھ کر گھر سے نکلتا ہوں، وہ خاموش ہو گئی مگر اس کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔

رات کی ایک دعوت میں تیار ہو کر اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ گئی، وہ بھی الوداعی پارٹی

تھی بہت سارے لوگ تھے اور کافی بے تکلف باتیں ہوتی رہیں، وہ جلدی چلی آئی اس کو کل کی دعوت کا انتظام کرنا تھا۔ رات بہت دیر تک وہ کچن میں کام کرتی رہی اور وہیں کرسی پر بیٹھا اس کا بیٹا اس سے باتیں کرتا رہا دنیا جہان کی باتیں فلسفے کی باتیں، مذہب کی باتیں، آپریشنوں کی باتیں اور وہ خوشی خوشی اس کو جواب دیتی رہی ساتھ ہی اس کی پسند کا کھانا بھی تیار کرتی رہی، وہ شوخی سے فرج کھول کھول کر ایک ایک ڈش دیکھتا رہا اور ذرا سا چکھنے کو کہتا رہا اور وہ اس کو مذاقاً ندیدہ ندیدہ' کہتی رہی وہ مسکرا رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ ہو وہ بہت وجیہ ذہین اور اُجلے خیالات والا، ماں باپ کا بہت خیال کرنیوالا بچہ تھا وہ اسے 'اپنے بڑھاپے کی لاٹھی کہتی تھی اور کبھی نظر بھر کر دیکھتی تک نہ تھی، اکثر وہ کہتی ۔۔ بیٹے ہم تو تمہارے ساتھ رہیں گے، وہ فوراً کہتا نہیں اماں ہم آپ کے ساتھ رہیں گے ۔۔ بیٹے کے علاوہ اس کے دو اور بچے تھے جن پر وہ جان چھڑکتی تھی، اس کے تصور میں بھی اگر کسی کو کانٹا چبھتا تو وہ خود بلبلا اٹھتی تھی شاید سب مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

دوسرے دن جمعہ تھا حسب عادت بیٹے نے لباس تبدیل کیا گہرا نیلا شلوار سوٹ پہنا، جیب میں جیبی قرآن شریف رکھا اور اپنے ابو کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے چلا گیا وہ ایسا ہی تھا، عشا کی آدھی نماز وہ مسجد میں پڑھتا باقی اپنے گھر پہنچ کر اور کہتا اتنی دیر تک میں نماز میں شامل لکھا جاؤں گا۔

وہ دونوں جلدی واپس بھی آگئے اور پھر وہ لوگ انتظامات میں مصروف رہے وہ خود بہت مصروف تھی مگر اس کو یہی خیال تھا کہ اس کا بیٹا جلدی سے دعوت سے فارغ ہو کر روانہ ہو جائے۔ اس کا گھر جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا بہت سے مہمان آنے والے تھے اس کے گھر کے ہر کمرے میں مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا، سب مرد لوگ ڈرائینگ روم میں اور خواتین دوسرے کمروں میں، اس کا بیٹا کھانے کی میز پر رکھی پلیٹوں میں کاغذ کے 'نیپکن' لگا رہا تھا اور گلاس تیچے سجا رہا تھا کہہ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ بٹا رہا ہے کیونکہ وہ بہت تھک گئی ہے۔

شام رات کی طرف بڑھتی جا رہی تھی مہمانوں کے آنے کا وقت تھا اس کا بیٹا تیار ہو کر اس

کے پاس آیا اس نے اپنے ایک ماموں کی لائی ہوئی گہری عنابی قمیض اور کالی پتلون معہ عنابی
موزوں اور کالے جوتوں کے پہن رکھی تھی، قیمتی پرفیوم کی خوشبو اس کے پاس سے آرہی تھی کہنے لگا
دیکھئے اماں میں سب سے پہلے تیار ہوگیا، اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور جلدی سے ایک آیت
پڑھ کر اس پر پھونک دی، وہ 'ماں' تھی، ذرا وہمی قسم کی ماں، یا شاید تمام دنیا کی مائیں ایسی ہی
ہوتی ہوں گی۔

بچے اب بڑے ہو چکے تھے الگ الگ شہروں اور ملکوں میں رہتے تھے مگر وہ اب بھی ویسے
ہی ڈرتی تھی کہ کسی کو چوٹ نہ لگ جائے کسی کو نقصان نہ ہو جائے جیسے وہ اب بھی ننھے منے سے
ہوں۔ایک بار اس کی امی نے اسے لکھا تھا۔۔ کہ اب تم خود بچوں والی ہو، اس لیے ماں کے درد
کو بخوبی سمجھ سکتی ہوگی ہاں۔۔ سچ بات ہے وہ خود ماں بننے کے بعد اپنی امی سے اور بھی قریب ہو
گئی تھی زیادہ محبت کرنے لگی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ ایک بچے کی غیر موجودگی اور اس کی ذرا سی تکلف
ماں کو کس قدر مضطرب کر دیتی ہے وہ خود اپنے بچوں کے لیے جیتی انہی کے بارے میں سوچتی اور
ان ہی کی پسند کو اولیت دیتی تھی ان کی پسند کے کھانے بناتی اور ایک ایک نوالہ اپنے ہاتھ سے
کھلاتی اور ساتھ ساتھ کہانیاں بھی سنائے جاتی اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ جب وہ یا اس کا
کوئی بھائی بہن بھوکا سو جایا کرتا تھا تو ابو امی سوتے بچے کو ایک ایک نولہ کیوں کھلاتے تھے۔ بچہ
بھوکا ہو تو ماں باپ کے حلق میں نوالہ کیوں اٹک جاتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس نے آج بھی ایک ایک چیز اپنے بیٹے کی پسند کی بہت محنت سے پکائی تھی
وہ اپنی پسند نا پسند، آرام، سکون اور اپنے تمام شوق بھولتی جارہی تھی وہ جو بھولے سے بھی کچن کا
رخ نہیں کرتی تھی بچوں کی خاطر زیادہ تر کچن میں نظر آتی تھی، اب اسے اچھے اور بُرے گوشت کی
بھی پہچان تھی وہی گوشت جس کو وہ کھاتی تک نہیں تھی۔

سب مہمان آچکے تھے، پورا گھر خوبصورت آوازوں، ہلکے اور اونچے قہقہوں سے گونج رہا
تھا وہ خود تھکی ہوئی تو بہت تھی مگر خوش تھی کہ اس کے تمام قریبی جاننے والے اس کے گھر میں موجود

تھے سب کو معلوم تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے دلہن پسند کر چکی ہے اور اب عنقریب دلہن اس گھر میں آئے گی۔

جون کا تپتا مہینہ تھا، اسکول بند ہونے والے تھے، تقریباً سب ہی لوگ اپنے اپنے ملک چھٹی جا رہے تھے، اس کا بیٹا سب کو کولڈ ڈرنک پیش کر رہا تھا اور سب کے سب اس سے مذاق کر رہے تھے، وہ کچن میں مصروف تھی مگر اس تک خوشگوار آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کو یہی ایک فکر تھی کہ اس کے بیٹے کو دیر نہ ہو جائے ابھی 'سویٹ ڈش' پیش ہی کی جا رہی تھی کہ اس نے ناشتہ دان میں اپنے بیٹے کی پسند کا سامان رکھنا شروع کر دیا، قورمہ، پلاؤ، گلاوٹ کے کباب، شاہی ٹکڑے، کچن میں کام کرتا نوکر اس کی حالت دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔۔۔ بھائی تو روز ہی جاتے ہیں آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں، وہ برابر بیٹے سے کہہ رہی تھی۔ بیٹا رات ہو گئی ہے اس وقت نہ جاؤ ہم تم کو صبح چار بجے جگا دیں گے وقت سے اسپتال پہنچ جاؤ گے۔ مگر اس کا بیٹا کہنے لگا صبح اس کا آپریشن ڈے ہے اور وہ مہمانوں کی موجودگی ہی میں اپنے دوست کے ساتھ روانہ ہو گیا جب وہ گاڑی میں بیٹھ گیا تو بھی وہ بے اختیار ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی اور گاڑی کا شیشہ اتار کر اس پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونک آئی وہ وہیں ننگے پیر سڑک کے کنارے کھڑی رہی جب تک اس کے بیٹے کی گاڑی اسے نظر آتی رہی۔

تمام مہمان جا چکے تھے نوکر برتن دھو کر بچا ہوا کھانا فرج میں رکھ رہا تھا اس کا شوہر دن بھر کی دوڑ بھاگ سے تھک کر اپنے بستر پر بے خبر سو چکا تھا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی کہ ابھی تک بیٹے کا فون نہیں آیا، جب کہ اس کو معلوم ہے کہ اس کی اماں تب تک نہیں سوئے گی جب تک اس کے گھر پہنچنے کا فون نہیں سن لے گی۔ وہ خود بار بار فون کر رہی تھی مگر فون کہتا تھا ابھی کال نہیں مل سکتی، فون مشغول ہے وہ جھنجھلا رہی تھی اور اپنے بستر پر بیٹھی ہی تھی کہ داخلی دروازے کی کال بیل بجی اس نے گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اس نے حیرانی سے دروازے کے 'کی ہول' سے دیکھا اس کا بھائی اور بھابی دروازے پر کھڑے تھے جیسے سوتے سے اٹھ کر آ گئے ہوں ابھی ابھی تو

وہ یہاں سے گئے تھے اس نے دروازہ کھولا اور حیرت سے پوچھا سب خیریت ؟

لیکن خیریت کہاں تھی اس کے بیٹے کی گاڑی غلط راستے سے آتی گاڑی سے بچنے کی کوشش میں پہاڑ سے نیچے گر گئی تھی وہ بے تحاشا چلّانے لگی اس کا شوہر بھی دوڑ کر آ گیا۔

ایک قیامت تھی جوان دونوں پر ٹوٹ پڑی اس کے بڑھاپے کی لاٹھی اس کا دُلارا سہارا بیٹا اسپتال میں پڑا تھا وہ جو دوسروں کا مسیحا تھا آپریشن کر کے جانیں بچاتا تھا وہ جو اپنی ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا وہ جو ہر وقت مدد کے لیے صرف 'اللہ' کی طرف دیکھتا تھا وہ جو 'صراط المستقیم' پر چلنے کو کوشش کرتا تھا۔ وہی بے سدھ، آئی سی یو میں پڑا تھا، خدا معلوم وہ کس کے سہارے اس کے پاس گئی اور کس دل اور کن آنکھوں سے اس نے بیٹے کو دیکھا شاید اپنے بیٹے کو یاد دلانے کے لیے کہ 'وہ یاد رکھے کہ وہ اپنی ماں کی بڑھاپے کی لاٹھی ہے۔ وہ رات۔ کیسی اندھیری خوفناک رات تھی جو اس کے اعصاب پر کسی عفریت کی طرح چھا گئی سالوں گزر گئے۔۔ اسے آج بھی امید ہے کہ ایک روز اس کا ڈاکٹر بیٹا اس کے بڑھاپے کی لاٹھی اس کا سہارا اپنے پیروں پر کھڑا ہو گا اور پھر ماں کو حسب وعدہ 'عمرہ' کرانے لے جائے گا اور پھر دونوں بھائی مل کر اپنی ماں کو قبر میں اتاریں گے۔۔ اب یہی ایک خواب ہے جو ماں کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں بسا ہے۔

پروفیسر جلیل احمد صدیقی

عشق رسولؐ اور قائداعظمؒ

قائداعظم سندھ مدرستہ الاسلام میں پانچویں جماعت میں تھے۔ انھوں نے ۳۰ جنوری ۱۸۹۲ء کو یہ مدرسہ چھوڑا۔ اس کے بعد ان کی شادی ہوگئی شادی کے بعد وہ چرچ مشن سکول میں چھٹے سٹینڈرڈ میں داخل ہوئے۔ ان کے والد جناح پونجا نے ایک برآمدی فرم ''مسٹر محمد علی جناح بھائی'' کے نام سے قائم کی۔ اور فرم کا مالک اپنے بڑے بیٹے محمد علی جناح کو بنایا۔ اس فرم نے پچیس ہزار روپے کی مالیت کی مچھلیاں انگلستان بھیجیں۔ اور دس ہزار کی مچھلیاں چین روانہ کیں۔ انگلستان میں ان رقوم کے حاصل کرنے اور کاروبار کو فروغ دینے کی ذمہ داری نبھانے کے لیے محمد علی جناح کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ محمد علی جناح نے ۳۱ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو چرچ مشن سکول کو چھٹی جماعت میں چھوڑ دیا۔ اور ان کی انگلستان جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

انگلستان میں ان کا تین سال رہنے کا پروگرام تھا۔ ان کی والدہ ان کی طویل جدائی کی وجہ سے بہت فکر مند تھیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب ''میرا بھائی'' میں صفحہ ۴۰ پر تحریر ہے کہ ان کی والدہ نے اس جدائی کو محمد علی کی بہتری کے خیال سے قبول کر لیا تھا۔ ان کی والدہ نے ان سے کہا میرے بیٹے مجھے تم سے جدا ہونا پسند نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ انگلینڈ جا کر تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ یہ میری زندگی کا خواب ہے۔ ان کا بیٹا خاموشی سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔

ان کی والدہ کو یہ خدشہ تھا کہ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کے انگلستان سے واپسی تک زندہ نہ رہیں گی۔ انہوں نے یہ باتیں سسکیاں لے کر روتے ہوئے کہیں۔ محمد علی نے جذباتی ہو کر اپنی والدہ کو گلے لگا لیا۔ ان کی والدہ نے بیٹے کو الوداع کہا اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے اپنے حفظ وامان میں رکھنے کی دعا کی اور اس توقع کا اظہار کیا کہ وہ بڑے آدمی بنیں گے۔ اور یہ بات ان کے لئے باعث فخر ہوگی۔

جنوری ۱۸۹۳ء کو محمد علی جناح انگلستان روانہ ہو گئے۔ انگلستان میں انہوں نے اپنی فرم کی رقوم وصول کر کے ایک حصہ اپنے والد کو بھیجا اور باقی خود اپنی ضروریات کے لیے رکھ لیا۔ لندن میں وہ گراہم ٹریڈنگ کمپنی کے صدر دفتر میں بطور اپرنٹس کام کرنے لگے۔ اس فرم کا دفتر کراچی میں بھی تھا اور محمد علی جناح کے والد کے اس فرم سے کاروباری تعلقات تھے۔ محمد علی جناح ناشتہ ختم کرنے سے پہلے صبح کے اخبار پڑھ لیتے۔ وہ انگلستان کے مشہور لیڈروں کی تقریروں کو بہت دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ان لیڈروں کے بیانات اور تقریریں عام لوگوں کا موضوع سخن ہوتیں۔ وہ فرم کے دفتر میں صبح سے شام تک معمول کے خشک اور اُکتا دینے والے کام میں مصروف رہتے۔ وہ اپنے کام میں مہارت حاصل کر رہے تھے تاکہ واپس آ کر اپنے والد کے کاروبار میں شامل ہو جاتے جس سے ان کا کاروبار زیادہ نفع بخش اور وسیع تر ہو جاتا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے بیان کیا ہے کہ اگرچہ ان کے کامیاب تاجر بننے کے امکانات روشن تھے لیکن وہ سوچنے لگے کہ اس طرح وہ اپنی قوم کی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے اور اپنی قوم کے رہنما نہیں بن سکیں گے۔ ان کے خیال میں ان کا تجارتی کیریئر انتہائی بودا اور محدود مستقبل کا حامل تھا۔ انہوں نے انگلستان کے موجودہ اور ماضی کے لیڈروں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان لیڈروں میں سے اکثر بیرسٹر تھے۔ قانون میں مہارت کی وجہ سے انہوں نے زندگی میں کامیابیاں حاصل کیں۔ چنانچہ انہوں نے گراہم ٹریڈنگ کمپنی میں بطور اپرنٹس کام ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے لندن کی کسی قانون کی درسگاہ میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ وہ آئندہ زندگی میں بیرسٹر بن سکیں۔

محمد علی جناح میٹرک پاس نہ تھے۔ چھٹی جماعت میں انہوں نے چرچ مشن سکول چھوڑ دیا تھا۔ میٹرک کی مطلوبہ تعلیم میں ڈیڑھ سال کی کمی تھی۔ اس لیے انہیں بیرسٹری میں داخلہ کے لیے لٹل گو کا امتحان پاس کرنا ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے اس سال لٹل گو کے امتحان پاس کرنے کا آخری موقعہ تھا۔ آئندہ برس سے داخلے کے قواعد وضوابط میں تبدیلیاں کی جا رہی تھیں جس کے

باعث بار ایٹ لا میں داخلہ لینے کے لئے انہیں مزید دو برس لگ جاتے۔ چنانچہ انہوں نے گراہم میں اپرنٹیس کا سلسلہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا اور لٹل گو کا امتحان پاس کرنے لیے دن رات ایک کردیئے وہ اپنی کتابوں کے مطالعہ کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت دینے لگے۔ ان کی محنت کا صلہ انہیں جلدی ہی مل گیا اور انہوں نے لٹل گو کا امتحان نمایاں حیثیت میں پاس کرلیا اور لندن کے کسی قانون کی تعلیم کے ادارے میں داخلہ حاصل کرنے کے اہل قرار پائے۔

یہ تمام تفصیل دینے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو علم ہو جائے کہ قائداعظم لندن اپنی فرم کے مسائل حل کرنے کے لیے گئے تھے۔ جب انہوں نے بیرسٹر بننے کا فیصلہ کیا تو میٹرک پاس نہ ہونے کی بنا پر داخلہ کے لیے لٹل گو کا امتحان پاس کرنے کا یہ آخری موقعہ تھا۔ اگر انہیں یہ سہولت میسر نہ ہوتی تو ہوسکتا ہے دو سال داخلے کے انتظار میں لندن رہنے کی ضرورت کے پیش نظر وہ بیرسٹر بننے کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ایسا کرنے میں قدرت انہیں امت مسلمہ کی قیادت سنبھالنے کے لیے ماحول سازگار بنانے کا اہل بنا رہی تھی۔

قانون کے تعلیمی ادارے کے لیے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد محمد علی جناح نے لندن کے چار مشہور تعلیمی اداروں کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ چار ادارے انرٹیمپل، مڈل ٹیمپل، گریز ان اور لنکنز ان تھے۔ محمد علی جناح نے لنکنز ان میں داخلے کا اس لیے فیصلہ کیا کہ اس تعلیمی ادارے کی دیوار پر دنیا کے جتنے بھی مشہور قانون دہندہ (Law Givers) گزرے ہیں ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔ ان ناموں میں سرفہرست عظیم محسنِ انسانیت پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا نام لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کا یہ فیصلہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے محبت اور گہری عقیدت کا آئینہ دار ہے (میرے قائداعظم صفحہ ۲۳)

۱۹۴۷ء میں قائداعظم نے کراچی میں وکلاء کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے لنکنز ان میں داخلہ لینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول اکرمؐ کے لیے جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین

مدبروں میں ہوتا ہے میرے دل میں بہت عزت تھی۔ایک دن اتفاقاً میں ''لنکنز اِن'' گیا اور میں نے دروازے پر پیغمبر اسلام کا اسم مبارک لکھا دیکھا میں نے ''لنکنز اِن'' میں داخلہ لے لیا کیونکہ اس کے دروازے پر آنحضرت کا نام مبارک دنیا کے عظیم قانون سازوں میں سرفہرست تھا۔'' (ہمارے قائداعظم صفحہ ۶)

کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے رسولؐ برحق کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

''آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی رسول کریمؐ کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔آپ کی عزت وتکریم کروڑوں انسان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی عظیم شخصیتیں آپ کے سامنے سر جھاتی ہیں۔میں ایک عاجز ترین، انتہائی خاکسار بندۂ ناچیز اتنی عظیم ہستیوں میں عظیم ہستی کو بھلا کیا اور کیسے نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔رسول اکرمؐ عظیم مصلح تھے۔عظیم رہنما تھے۔عظیم قانون وضع کرنے والے تھے۔عظیم سیاست دان تھے عظیم حکمران تھے۔''
(اقراء قائداعظم نمبر جون ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۲۰۲)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن حکومت برطانیہ کی جانب سے حکومت پاکستان کو اختیار واقتدار منتقل کرنے کے لیے کراچی آئے۔ماؤنٹ بیٹن نے مختصر خطاب کرتے ہوئے کہا

''مجھے امید ہے کہ رواداری کی جو روایت اکبر اعظم نے قائم کی تھی پاکستان میں اسی کو اپنایا جائے گا۔''

قائداعظم تقریر کرنے کے لیے اٹھے اور وہیں ماؤنٹ بیٹن کو جواب دیا۔

''شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں سے جو رواداری برتی اور خیرسگالی کا جو مظاہرہ کیا وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔اس کی تعلیم تیرہ سو سال قبل ہمارے رسول مقبولؐ نے ہمیں دی ہے۔اور صرف الفاظ کی صورت میں ہی نہیں بلکہ عمل کر کے بتایا ہے۔جب انہیں یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل ہوئی تو ان کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا گیا تھا۔ان کے مذہب اور اعتقادات کا بڑا

احترام کیا گیا۔ مسلمانوں نے جہاں بھی حکمرانی کی ہے ان کی ساری تاریخ رواداریٔ، حسن سلوک اور انسانیت کے انہی عظیم اصولوں سے بھری پڑی ہے۔ جن کی تقلید لازمی ہے اور ان کو روبہ عمل لائیں گے۔ (میرے قائداعظم صفحہ ۱۸۵)

قائداعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ فرمایا وہ لائق صد تحسین ہے۔ نئی نسل کے قائدین کو ان زریں خیالات پر غور کرنا چاہئے۔ قائداعظم امت مسلمہ کے دکھوں کا مداوا اور تمام مسائل کا حل ہادیٔ برحق کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے میں مضمر سمجھتے تھے۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۶ء کو شاہی دربار سبی (بلوچستان) میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اُس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے۔ جو ہمیں قانون عطا کرنے والے ہمارے پیغمبرؐ اسلام نے دیا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔'' (خطبات قائداعظم صفحہ ۵۹۵)

مجھے افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں عام پڑھے لکھے حضرات کو قائداعظم پاکستان کے رہنماؤں اور تحریک پاکستان کے ولولہ انگیز دور کے متعلق صحیح معلومات نہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر، ''انجینئر''، سائنس دان اور اساتذہ بھی بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے پروفیشن کے متعلق تو کتابیں پڑھتے ہیں لیکن اچھی کتابیں سوانح عمریاں سفرنامے پڑھنے کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے۔ کوئٹہ کے معروف دانشور مصنف ڈاکٹر انعام الحق نے تحریک پاکستان اور بلوچستان توضیحی کتابیات میں بلوچستان اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں تحریک پاکستان قائداعظم اور دوسرے رہنماؤں کے متعلق لکھی ہوئی کتابوں کی تفصیل دی ہے۔ ان میں کتابوں کے نام کے ساتھ ساتھ کتابوں کے نفس مضمون پر بھی مختصر طور سے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتابیں قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں لکھی گئیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم اچھی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اگر کچھ مطالعہ کے شوقین ہیں تو جاسوسی کتابیں، افسانوں کے مجموعے پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

نوائے وقت مورخہ ۱۳ اپریل ۲۰۰۲ء کے سنڈے ایڈیشن میں خالد یزدانی نے ''یادگار قائد'' کے عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون تحریر کیا تھا۔ جس میں وہ قائداعظم کی لائبریری کے متعلق لکھتے ہیں ''بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ کے اثاثوں میں سب سے بڑا اور اہم اثاثہ قائد کی لائبریری میں نایاب کتب کا ذخیرہ ہے۔ اس سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قائد کو مطالعہ کا شوق تھا۔ قائد کے کتب کے ذخیرے میں قانون کی کتابوں کی بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی کتب کی بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ قانون کی کتابوں کے علاوہ ادبی کتابوں کی بڑی تعداد بھی ہے جس میں شیکسپیئر بائرن اور ورڈز ورتھ کے ساتھ ساتھ عمر خیام کی رباعیات کے انگریزی تراجم شیخ سعدی کی گلستاں بوستاں کے مجموعے شامل ہیں۔ بعض کتابوں پر قائد نے دستخط بھی کیے ہیں۔ یہ کتابیں ۱۹۰۶ء کے بعد خریدی گئی تھیں۔ قائد کی ذاتی لائبریری میں قرآن پاک کے نسخے اردو انگریزی اور گجراتی تراجم کے ساتھ ہیں۔ اسلامی کتب کی بڑی تعداد ان کے مذہب سے خاص لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ قائد کی کتب، تصاویر اور دستاویزات، جامعہ کراچی کے لیے ایک یادگار ذخیرہ ہے۔ یہ قیمتی سرمایہ یہاں آنے والوں کو قائداعظم محمد علی جناح کی ذاتی اشیاء اور کتب کے ذریعے ان کی ساری زندگی کی جھلک دکھاتا ہے۔ ہمارے عظیم قائد نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو جدوجہد کی ہے اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی زبان کے نامور ادیب ٹامس کارلائل نے ایک معرکۃ الآرا کتاب ''مشاہیر اور مشاہیر پرستی'' لکھی تھی اس کتاب کے دوسرے باب میں اس نے حضور سرور پاک پیغمبرؐ اسلام کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس کا غالباً پہلا ترجمہ محمد اعظم صاحب سابقہ لیکچرار اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے کیا تھا۔ قائداعظم نے اس کا پیش لفظ تحریر کیا تھا۔ قائداعظم کا مکتوب پڑھنے سے قائداعظم کی حضور پاکؐ سے گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں آپ نے اسوۂ رسولؐ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے جو خط پروفیسر محمد اعظم مؤلف ''سید الانبیاء'' کو لکھا اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ، مالابار ہل بمبئی

۲۶ اگست ۱۹۴۴ء

''آپ کا مکتوب مورخہ ۱۷ اگست وصول ہوا۔ آپ کے حسب خواہش چند الفاظ اپنی جانب سے بطور پیش لفظ ارسال کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہا ہوں۔

میں حقیقت میں نہایت مسرور ہوں کہ آپ کارلائل کی کتاب ''مشاہیر اور مشاہیر پرستی'' کے ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔ میں جب انگلستان میں طالب علم تھا اس وقت میں نے کارلائل کی اور کتابوں کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اور اس وقت سے چیلسیا کے اس مرد عاقل کی عظمت میرے دل میں جا گزیں ہے۔ اس نے ہمارے پیغمبر آنحضرتؐ کی زندگی کے حالات اور ان کے کارناموں کی سچی تصویر کھینچ کر نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ساری دنیا کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب کے اردو ترجمے کے دوسرے ایڈیشن کے متعلق میں آپ کے ارادے کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

آپ کی روانہ کردہ اردو ترجمہ کی ایک جلد وصول ہوگئی جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' (سید الانبیاء مؤلف محمد اعظم صفحہ ۴)

آپ کا مخلص

محمد علی جناح

محمد اعظم صاحب کی کتاب سید الانبیاء پر قائداعظم کے لکھے گئے پیش لفظ میں ہمیں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اوّل قائداعظم لندن میں دوران تعلیم مطالعہ کتب کے شوقین تھے۔ انہوں نے تھامس کارلائل کی دوسری کتابوں کے علاوہ ''مشاہیر اور مشاہیر پرستی'' کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ قائداعظم کو حضور سرور کونینؐ سے گہری عقیدت تھی۔ انہوں نے سیرت نبویؐ پر کتابیں پڑھی تھیں اس کا اندازہ یوم عید میلاد النبیؐ کے مبارک موقع پر قائداعظم کے رحمتہ العالمینؐ کو خراج عقیدت پیش کرنے سے کیا جاسکتا ہے۔

"آج ہم کروڑوں انسانوں کے ہادیٔ برحقؐ اور عظیم ترین رہنماؐ انسانوں کے ممدوح کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو ایک بزرگ ترین منتظم مدبر اور قانون ساز تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک عظیم حکمران بھی تھے۔ اسلام چند روایات اور مذہبی اصولوں کا نام نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے سیاسی اقتصادی و دیگر مسائل کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام کی بنیاد صرف ایک خدا پر ہے۔ انسان انسان میں کوئی فرق نہیں۔ مساوات، آزادی اور بھائی چارہ اسلام کے مخصوص اصول ہیں۔ حضورؐ کی زندگی اس لحاظ سے نہایت سادہ تھی۔ کاروبار سے لے کر حکمرانی تک ہر معاملہ میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ حضورؐ جیسا انسان دنیا نے کبھی پیدا نہیں کیا۔ انہوں نے تیرہ سو سال پہلے ہی جمہوریت کی بنیاد رکھ دی تھی۔" (قائداعظم نے فرمایا صفحات ۷۹۔۸۰)

سلمان غازی، ممبئی (انڈیا)

لمحہ فکریہ

دنیا کا شائد ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس کا حل ہمیں سیرت نبویؐ میں نہ مل سکے اس لیے آیئے ہم اپنے ہر عمل کو سیرت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ سیرت کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ بات میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ رسول اللہ کی زندگی میں نفرت اور انتقام ان دو جذبوں کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہی نہیں آپ کے صحابہؓ کی زندگی میں بھی یہ دونوں چیزیں ہمیں نظر نہیں آتیں۔ غصے میں یا نفرت کی بنیاد پر کسی کو مار دینا گناہ کبیرہ ہے اور جہاں ایسا عمل کرنے والا جہنم کا مستحق ہے وہیں دل میں نفرتیں پالنے والا بھی جہنم کا مستحق ہونا چاہئے۔ ایک بار حضرت علیؓ کسی مشرک سے لڑ رہے تھے۔ ایک بار حضرت علیؓ نے اسے کو پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے قتل کرتے مشرک نے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ فوراً اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اسے پچھاڑ دیا تھا پھر اسے کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا پہلے میں صرف اللہ کے لیے اس سے لڑ رہا تھا۔ اس کے تھوکنے سے اب مجھ میں انتقام کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا یعنی نیت خالص نہیں رہی اس لیے میں نے اسے قتل کرنے کا اردہ ترک کر دیا۔ دیکھئے ایک مشرک جو ایک مسلمان کے قتل پر آمادہ ہے اسے بھی انتقام کی نیت سے یا نفرت کی وجہ سے قتل کرنا غلط فعل ہوا۔ اس کے برخلاف عوام وخوص ہی کیا اس وقت ساری دنیا نفرت کی آگ میں جل رہی ہے اسلام صرف اور صرف اعتدال کا نام ہے جس میں نفرت کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

اسلام میں انتقام کے جذبے کی تسکین ناقابل قبول ہے۔ اسلام انسانوں کی فلاح کے لیے آیا تھا نفرتوں کو مٹانے کے لیے اور انتقام کے جذبوں کو سرد کرنے کے لیے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان دنوں منفی جذبوں کی تسکین اسلام کے نام پر اور اسلام کے لیے کرتے ہیں جو اپنی

جگہ خود قابل تعزیر جرم ہے۔ غصہ تھوڑی دیر کے پاگل پن کا نام ہے اور اس پاگل پن میں انسان ہر غلط کام کر سکتا ہے۔ بدقسمتی سے آج یہ نفرتیں اس انتہا پر ہیں جہاں اب دشمن کا غیر ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ آپس میں مسلمان ایک دوسرے سے دست گریباں ہیں۔ ایران اور عراق کی آٹھ سالہ جنگ میں دس لاکھ نوجوان قتل ہوئے لیکن تاریخ کے ان صفحات پر ہمارے اہل قلم کی کبھی نظر نہیں جاتی۔ افغانستان میں جب مختلف قبیلے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں تو ہمارے صحافی انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب شیعہ اور سنی ایک دوسرے کے قتل کا بازار گرم کرتے ہیں تو ہمیں ان میں سی آئی اے اور اسرائیل کی سازشیں نظر آتی ہیں۔ کہیں ہم اپنی حکومتوں سے نالاں ہیں اور ان کا تختہ الٹنے کے لیے شر و فساد کا بازار گرم کرتے ہیں۔ جب کہ حدیث پاک ہے کہ جیسے تمہارے اعمال ہونگے ویسے ہی حاکم تم پر مسلط کر دئے جائیں گے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب حاکم بُرے ہوں تو انہیں بدلنے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنے اعمال بدلنے پر توجہ دی جائے۔ حکام خود ہی بدل جائیں گے۔ ہمیں شعائرِ اسلام پر ہر تنقید احتجاج پر اُکساتی ہے۔ کہیں داڑھی یا برقعے پر کسی کے اعتراض پر ہم آگ بگولہ ہو رہے ہیں تو کہیں انتقاماً سڑکوں پر نماز پڑھ کر عام آدمی کی زندگی میں خلل ڈالنے سے خوش ہوتے ہیں کبھی ہم اپنے خلاف مخالفین کی بات سن کر غصہ میں بھنا رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے بیانات جان بوجھ کر ہمیں غصہ دلانے کے لیے دئے جاتے ہیں تا کہ ہم اس عارضی پاگل پن میں وہ حرکتیں کریں جو ہمارے دشمن ہم سے کروانا چاہتے ہیں بدقسمتی سے وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس پر سیرت سے ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ مکہ میں کفار مکہ نے جناب رسول اللہؐ کا نام (نعوذ باللہ) مذموم رکھ لیا تھا اور مذموم کو گالیاں بھی دیتے تھے۔ بعض صحابہ نے شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا تم کیوں پریشان ہوتے ہو وہ لوگ تو کسی مذموم کو گالیاں دے رہے ہیں اور میں محمدؐ ہوں۔ دیکھئے کتنی خوبصورتی سے ایک جاہلانہ فعل کی عالمانہ تعبیر کر کے لڑائی سے اعراض فرمایا۔ لیکن بدقسمتی سے آپؐ کے اس قول اور اس فعل میں ہمارے لیے کوئی سبق نہیں

اسلامی تاریخ میں نفرت کی انتہا اور جذبۂ انتقام کی تسکین پر دو واقعات یاد آتے ہیں۔
کفار مکہ کی نفرتوں، ریشہ دوانیوں اور مظالم سے تنگ آ کر رسول اللہ ہجرت فرماتے ہیں لیکن یہاں بھی کفار آپ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے اور تین بڑی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ لیکن آپ اپنی طاقت بڑھاتے رہے اور آپ کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہو کر لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتے رہے یہاں تک کہ آپ دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ فتح کرتے ہیں۔ یہ اس زمانے کا بلکہ ہر زمانے کا قاعدہ رہا ہے کہ جنگ جیتنے والا ہارنے والی قوم پر انتہا درجے کے مظالم کرتا ہے۔ قتل عام ہوتا ہے لوگوں کو لوٹا جاتا ہے اس لیے مکہ کے کفار بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ اب ان کے ساتھ محمدؐ بھی یہی برتاؤ کریں گے لیکن آپؐ نے نہ صرف یہ کہ جنگ بغیر خون بہائے جیتی بلکہ فرمایا کہ جو اپنے گھر میں بند ہو جائے اُسے امان ہے، جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے جو خانہ کعبہ میں پناہ لے لے اسے امان ہے، جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اسے امان ہے۔ دیکھئے اپنے بدترین دشمنوں سے جب انتقام لینے کا وقت آیا تو انہیں معاف فرما دیا اور سب کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ لیکن ہمارے لیے اس میں بھی کوئی سبق نہیں ہے۔

مکی دور میں ہر طرف سے مایوس ہو کر آپؐ نے طائف جانے کا قصد فرمایا لیکن وہاں پر شقی القلب لوگوں نے بدتمیزی کی اور کہا کہ تمہارے اللہ کو تمہارے سوا اور کوئی نہیں ملا تھا رسول بنانے کے لیے۔ کسی کی بے عزتی کے لیے یہ بدترین کلمہ ہو سکتا تھا پھر انہوں نے آوارہ بچوں کو پیچھے لگایا اور انہوں نے آپؐ پر اس طرح پتھراؤ کیا کہ آپ کے جوتے خون سے بھر گئے۔ اس وقت جبریل امینؑ اپنے ساتھ فرشتۂ اجل کو لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آپ حکم دیں تو یہ پہاڑوں کا فرشتہ ان دو پہاڑوں کے بیچ اس قوم کو کچل دے۔ اس وقت کے حالات اور واقعات سے آپ رسولؐ اللہ کی ذہنی کیفیات کا اندازہ لگایئے کہ اُس قوم سے آپ کے ذہن میں کتنی نفرت ہونی چاہیے لیکن آپ کا جواب مثبت فکر کی وہ نادر مثال ہے جو رہتی دنیا تک ہمارے لیے مشعلِ راہ رہے گا۔ فرمایا کہ نہیں انہیں مت ختم کرو مجھے امید ہے کہ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو ان کی اولادیں ایمان

لائیں گی۔ غور فرمایئے کہ مستقبل بعید کے ایک ایسے امکان کو بنیاد بنا کر آپ نے بدترین دشمنوں کا معاف فرمایا جس کے پورا ہونے کا اس وقت کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس مثبت سوچ کے برخلاف ہم اپنی ذہنی حالت کا جائزہ لیں کہ اگر ہمارا بس دشمنوں پر نہیں چلتا تو ہم ان کی تصویر پر جوتے مار کر خوش ہوتے ہیں اور اس کی تائید میں خوشی کا اظہار کر کے پوری قوم ہی اپنے لیے جذبۂ انتقام کی تسکین کا سامان فراہم کر لیتی ہے۔ لیکن ہمارے لیے جناب رسول اللہؐ کے اس واقعے میں بھی کوئی سبق نہیں ہے۔

ممکن ہے کچھ حضرات میرے اس تجزیئے سے متفق نہ ہوں لیکن میں نے بدلتے ہوئے حالات میں مسلمانوں کی ذہنی تبدیلیوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ دریا دراصل ہمارے اخبارات اور رسائل نے بہا رکھے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خیالات آج دیوانے کی بڑ معلوم ہوتے ہیں اور میری یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی کیونکہ ہمارے اذہان اب اس قدر مسموم ہو چکے ہیں کہ ہم ایسی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں جو ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے کی دعوت دے۔ جو افیون ہمارے صحافی، ادیب و شاعر ہمیں برسوں سے پلا رہے ہیں ان کا نشہ اتنی جلد نہیں اترے گا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میرے مخاطب خواص ہیں کیونکہ انہی کی فکر اور فیصلے تاریخ کے دھاروں کا رخ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خواص کی ایک لمحے کی خطا پوری قوم کو صدیوں تک سزا بھگتنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب خلیفہ اول چنے گئے تو وہ اپنی چھوٹی موٹی تجارت کرتے تھے جسے انہوں نے جاری رکھا لیکن جب لوگوں نے کہا کہ آپ خلیفہ ہیں اور آپ کا پورا وقت عوام کے لیے ہے اس لیے آپ تجارت کے بجائے بیت المال سے اپنے لیے روزینہ مقرر کر لیں تو آپؓ نے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کسب حلال فرض ہے لیکن اگر وہ اپنا پورا وقت قوم کے لیے وقف کر دیں اور بیت المال سے اپنے اخراجات لیں تو یہ بہتر ہے اس لیے آپ نے اسی پر عمل کیا اور تجارت چھوڑ دی۔ انہیں میٹھا پسند تھا اس لیے ان کی اہلیہ نے روزانہ ایک پیسہ بچا کر ایک عرصے میں اتنا پیسہ جمع کر لیا کہ میٹھا بنا سکیں۔ دستر خوان پر میٹھا دیکھ کر آپؓ

نے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا۔ بیوی نے جواب دیا کہ میں نے ایک ایک پیسہ بچت کر کے بنایا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ ہم ایک پیسہ زیادہ تنخواہ لے رہے ہیں اور فوراً بیت المال سے اپنی تنخواہ میں اتنی کمی کر دی۔ حقیقتاً یہ تقویٰ ہے آپ کے اسوے میں خواص کے لیے بھی درس ہے کہ کہ اپنے مقام کو پہچانیں اور اسی کے مطابق عمل کریں۔

یہ باتیں اس لیے تلخ ہیں کیونکہ ہمارے مزاج کے خلاف ہیں ہمارے نفس کے خلاف ہیں اور نفس سے جنگ کرنا مشکل ترین کام ہے اسی لیے اس کام کا ثواب اللہ کی راہ میں جان دینے سے بھی زیادہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے ایک بار کسی غزوہ سے واپسی پر رسول اللہؐ جب مدینے میں داخل ہوئے تو صحابہ سے فرمایا کہ اب ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف جا رہے ہیں۔ صحابہ جو اللہ کی راہ میں جان دینے کو سب سے بڑا عمل سمجھتے تھے انہیں تب یہ انداز ہوا کہ جہاد اکبر دراصل اپنے نفس سے لڑنے اور اس پر قابو پانے کا نام ہے۔ آج ہم ایمان والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم صرف ایمان لانے کے بعد ہر جگہ اپنے نفس کا اتباع کر کے بھی جنت کے مستحق رہیں گے تو یہ ایک بھول ہے۔ قرآن کا حکم موجود ہے۔ ''اے ایمان والو اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کا اتباع نہ کرو کیونکہ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' گویا کسی جگہ بھی اپنے نفس کا اتباع دراصل شیطان کا اتباع ہوگا۔

حسن چشتی۔شکاگو۔(امریکہ)

الاقرباء۔۔۔اردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ

کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کو کسی ملک کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا پیمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔نہ صرف امریکہ، انگلینڈ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ بلکہ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں بھی رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کی تعداد چھ ہندسوں سے متجاوز ہے اور تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے لیئے مختلف انعامات اہل قلم کی نگارشات کا تعاقب کرتے رہتے ہیں ان ممالک کے کتب خانوں میں ہر سال لاکھوں رسالوں اور کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔جگہ کی قلت کے باعث رسالوں اور کتابوں کو پہلے مائکروفلم میں منتقل کیا جاتا تھا لیکن اب ڈجیٹل طریق کار کے ذریعہ جدید و قدیم کتابیں محفوظ کی جارہی ہیں۔افسوس ہے کہ پاکستان میں صورت حال بالکل برعکس ہے۔سال میں صرف چند قابل ذکر رسالے اور کتابیں شائع ہو پاتی ہیں جو آبادی اور شرح خواندگی کو دیکھتے ہوئے علم و ادب اور ثقافت سے عدم توجہی کا ایک کھلا اور افسوس ناک ثبوت ہے۔جو رسالے اشاعت کی منزل تک پہنچ پاتے ہیں وہ اشتہارات کی بیساکھیوں پر زندہ رہتے ہیں۔نامساعد حالات، لوڈ شیڈنگ، مہنگائی اور ایسی ہی دوسری مشکلات کو دیکھتے ہوئے پاکستان میں ایک معیاری رسالہ شائع کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

میرے سامنے الاقرباء کا ۲۰۱۳ کا سالنامہ ہے، اسلام آباد سے شائع ہونے والا یہ مجلّہ ادبی افق پر ۱۳ سال قبل طلوع ہوا تھا۔چونکہ اب یہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے، اس لیے اس کے فروغ کا تاریخی جائزہ لینا ممکن ہے۔سب سے پہلے جو بات مجھے ششدر کرتی ہے وہ یہ کہ اس میں لکھنے والوں کی برادری پاکستان تک محدود نہیں ہے بلکہ امریکہ، اسٹریلیا، بھارت، کینیڈا، چین، انگلینڈ، فرانس، جاپان، کرغستان، کویت، ماریطانیا، نیوزی لینڈ، عمان، قطر، سعودی عرب

جنوبی افریقہ، سویڈن اور ترکی تک پھیلی ہوئی ہے۔

اگر اس کے سرورق سے سفر شروع کیا جائے تو تازہ ترین شمارہ پاکستانی قومی ترانہ طغرہ کی شکل میں جاذبِ نظر رنگوں میں ملبوس، فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ابتدائی صفحات پر مدیر صدر نشین سید منصور عاقل، مجلس ادارت میں شہلا احمد، ناصر الدین اور نعیم فاطمہ علوی جیسے اہلِ قلم ہیں۔ مجلس مشاورت اندرون ملک سے معروف جامعات سے وابستہ پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین، پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر عالیہ امام اور حسن زیدی جیسے معتبر نام شامل ہیں۔ بیرون ملک سے مقتدر ناموں میں پروفیسر ڈاکٹر علی آسانی ہارورڈ یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اَر استنبول یونیورسٹی ترکی، پروفیسر ڈاکٹر سویمانے یاسر اوساکا یونیورسٹی جاپان اور پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مقتدر نام شامل ہیں۔ انگلینڈ میں بیرسٹر سلیم قریشی اور امریکہ میں پروفیسر محمد اویس جعفری اس مجلّہ کے مشیرانِ اعلیٰ ہیں

مجلّہ حسنِ ترتیب کے ساتھ مختلف شعبوں میں تقسیم ہے۔ مدیر جناب منصور عاقل اپنے اداریوں سے ایک جانب جراحی کا کام لیتے ہیں اور دوسری جانب زبان، علم وادب اور ثقافت کے تحفظ کے پرزور وکیل کی حیثیت سے اس رسالہ کو ایک مشن تصور کرتے ہیں۔ ان کے نانا سید عبدالوحید خدا حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور ان کے نورتنوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اداریے مثبت فکر کے حامل ہوتے ہیں۔ حالیہ شمارہ میں ''قندیلِ علم --- ظلمت و جہالت کے حصار میں'' تعلیم سے عدم توجہی پر حکومت کے لیئے ایک تازیانہ ہے۔ اس کے بعد تحقیقی مقالات اور مضامین کا شعبہ ہے۔ اس میں شاعر دربارِ نبویؐ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہہ، اردو ادب میں محبوب کی صورت گری، مسائل تصوف اور غالب، منٹو، سقراط، فن جمل، اور جنوبی ہند میں اردو پر مضامین شامل ہیں۔ الاقرباء کو خصوصیت کے ساتھ اقبالیات پر تحقیقی مضامین شائع کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔ زیرِ نظر شمارہ بھی اقبال پر چار ایسے ہی پُر مغز مقالات سے مزین ہے۔ اس کے بعد افسانہ اور کہانی کا شعبہ ہے جو معروف اہلِ قلم کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔ وہ

دانشور، ادیب اور شاعر جو الاقرباء کی محفل میں شریک رہے ہیں اور اب اس دنیا کو خیر باد کہہ چکے ہیں، وہ سب شعبہ 'یادرفتگاں' کے ایوان میں مسند نشیں ہیں۔ متفرق تحریروں کے بعد شعبہ شعرو سخن ہے جو حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے ضیا بار ہے اور اس کے بعد اعلیٰ غزلیں اور خوبصورت نظمیں ہیں۔ 'نقد و نظر' میں نئی اور معیاری مطبوعات پر تبصرے شامل ہیں۔ اور پھر چہار دانگِ عالم سے الاقرباء کے قارئین کے خطوط ہیں جو 'مراسلات' کے شعبہ میں دیے گئے ہیں۔ الاقرباء کی عالمی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پندرہ مراسلات میں سے دس بیرون ملک قارئین کے ہیں۔

مجلس ادارت اعلیٰ معیار برقرار رکھنے پر سختی سے عمل پیرا ہے اور غیر مطبوعہ تحریر ہی شریکِ اشاعت کی جاتی ہے۔ رسالہ اشتہارات کا پروردہ نظر نہیں آتا۔ آخری صفحہ اور اس کی پشت پر صرف شائستہ اشتہار ہیں۔ زیرِ نظر ضخیم سالنامہ ۳۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور لکھنے والوں کی تعداد ۹۰ سے اوپر ہے۔ ان سب پر تبصرہ کرنے کے لیے تو کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ گزشتہ تیرہ سالوں سے جو اہل قلم الاقرباء کی علمی و ادبی سرپرستی کر رہے ہیں اس کہکشاں سے تعارف کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انٹرنیٹ پر سابقہ شماروں کا مطالعہ کیا جائے۔ اسی لیے میں اس ناکافی تبصرہ کے اختتام پر مجلّہ کا لنک تحریر کر رہا ہوں۔ شمارہ میں سے صرف اور صرف وہ چند نام منتخب کر رہا ہوں جن کا تعلق پاکستان کی باہر کی دنیا سے ہے۔ وہ پاکستانی دانشور، ادیب اور شاعر جو الاقرباء کی محفل میں رونق افروز ہیں، بہت قدآور شخصیتیں ہیں اور ان پر تبصرہ کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ الاقرباء کے بیرون ملک لکھنے والوں میں روزنامہ سعودی گزٹ کے مدیر و محقق جناب طارق غازی، سہ ماہی ''دیدہ ور'' اور علی گڑھ اردو کلب' کی بانی محترمہ رضیہ مشکور، ہارورڈ کی ڈاکٹر نسیم ہائنس، استنبول یونیورسٹی، ترکی کے شعبہ اردو ادب کے صدر جناب خلیل طوقار، شاعرہ مصنفہ فرزانہ اعجاز، ادیب و صحافی جناب معین الدین عقیل، شاعرہ، مصنفہ اور مصورہ صوفیہ انجم تاج، عہد ناتمام کی شاعرہ ستار نواز، مصورہ و مصنفہ محترمہ پروین شیر، مدیر 'مضراب' اور بانی 'اردو انجمن' جناب سرور عالم راز سرور، اوساکا یونیورسٹی جاپان کے پروفیسر

ڈاکٹر سویا مانے، انعام یافتہ افسانہ نگار جناب ڈاکٹر آصف الرحمان طارق، پروفیسر قیصر طارق، صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد، محمد رفیع اللہ، خانوادۂ میر ببر علی انیس کے منفرد لب ولہجہ کے معروف شاعر جناب ضامن جعفری، ادیب وشاعر جناب سلمان غازی، شاعرہ محترمہ انور جہاں برنی، شاعرہ فریدہ لاکھانی، بیرسٹر سلیم قریشی اور پروفیسر اویس جعفری شامل ہیں۔ وہ حضرات جو مضامین پر تحقیقی تبصرہ مراسلات کی صورت میں سپردقلم کرتے ہیں ان میں جناب ڈاکٹر یوسف قدوائی، جناب سلام المکی، مشتاق احمد چوہان، جناب منیر الدین، جناب شجاع طلعت، جناب منظور جونیجو، جناب منیر قریشی، جناب شجاعت اللہ، جناب ظفیر عالم، جناب عبدالوہاب خان سلیم، جناب خواجہ مشتاق حسین کے علاوہ اور بھی بہت سے معروف نام ہیں جن کا طوالت کے باعث ذکر نہ کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔

مجلّہ کے معیار کا ثبوت اس امر سے ہوتا ہے کہ دیگر جامعات کے علاوہ ہارورڈ یونیورسٹی کے طلباء کے لیئے اس کی نظم ونثر کا کچھ حصہ نصاب میں شامل اور ہر سمسٹر میں اس کا مطالعہ سفارشی حیثیت رکھتا ہے۔ جامعات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے امیدوار طلباء الاقرباء کو تحقیق اور حوالہ جات کے لیے بطور استفادہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ثقافت، تہذیب اور علم وادب کے وہ عشاق جو برِ صغیر کی ادبی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں انھیں ''تہذیب الاخلاق، اردوئے معلّٰی، معارف، صبح امید، کہکشاں، دین ودنیا، نگار، ادبی دنیا، ساقی، شاعر، افکار، سویرا جو بعد میں ادب لطیف کہلایا، نیا دور، آجکل، ماہِ نو، نقوش، قومی زبان، فنون، اوراق، معاصر، تخلیق ادب اور نئی کتاب'' جیسے معیاری رسالوں اور ان کی خدمات کا بخوبی علم ہوگا۔ ان کے لیے یہ ایک مژدہ جانفزا ہوگا کہ اس کہکشاں میں ایک اور شب تاب وتاریخ ساز جریدہ الاقرباء کا اضافہ ہوا ہے جس میں مختلف اصناف ادب کا ایک اعلیٰ وارفع انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دہائی کے تمام شمارے مجلّہ کی ویب سائٹ www.alaqreba.com پر دستیاب ہیں۔ قارئین مزید تفصیلات کے لیے الاقرباء کے بیرون ملک مشیروں سے رابطہ کر سکتے ہیں جن کے فون نمبر اور ای میل کے پتے الاقرباء کے سرورق کی پشت پر تحریر ہیں۔

سرور عالم راز سرور۔ امریکہ

''الاقرباء'' سالنامہ ۲۰۱۳ء پر ایک نظر

یہ دور اردو میں عمومی اضمحلال کا دور ہے۔ اردو زبان و ادب ہر سطح پر کم سوادی اور کساد بازاری کا شکار ہیں۔ درس و تدریس کے معیار گر گئے ہیں، شعر و ادب زوال آمادہ ہے، غزل گوئی کے نام پر تک بندی کا رواج عام ہو گیا ہے۔ صحت مند، تعمیری اور بے لاگ تنقید و تبصرہ ناپید ہو چلا ہے، تحقیق کا دور دور تک نشان نظر نہیں آتا اور مکھی پر مکھی مارنا تحقیق کا جھوٹا لبادہ اوڑھے ہوئے بازار ادب میں سرگرم تماشا ہے، اردو میں انگریزی الفاظ اور فقروں کی جارحانہ اور مطلق غیر ضروری آمیزش سے اس کا حلیہ تباہ کیا جا رہا ہے اور نام نہاد پڑھا لکھا طبقہ بھی ٹوٹی پھوٹی اور غلط سلط انگریزی کو اپنی زبان اُردو پر ترجیح دے رہا ہے۔ ان حالات میں کوئی سنجیدہ و معیاری اردو رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اسلام آباد، پاکستان سے شائع ہونے والے رسالہ الاقرباء کی انتظامیہ لائق توصیف و تقلید ہے کہ الاقربا کی کامیاب اشاعت سے دنیائے اردو میں ایک مثال قائم کر رکھی ہے جو اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ محنت لگن اور زبان و ادب کی محبت ہو تو کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے۔

الاقرباء کا جنوری۔ اپریل ۲۰۱۳ء کا شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مندرجات پر ایک ہی نگاہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ان کے انتخاب میں بہت محنت کی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات جو قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے وہ رسالہ کے مندرجات کا تنوع ہے۔ آج کل عالم رسالوں کا دستور یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ چند معمولی غزلیں، دو تین دوسرے اور تیسرے درجے کے افسانے اور چند آزاد نظمیں (پابند نظمیں کم نظر آتی ہیں کیونکہ ان پر شاعر کو محنت کرنی ہوتی ہے) ہی ان کی کل کائنات ہوتے ہیں۔ الاقربا میں غزلوں، افسانوں اور نظموں کے علاوہ تنقیدی

مقالات، ادبی وعلمی مضامین، حمد ونعت، قطعات ورباعیات، انشائیے وغیرہ سب ہی اصناف ادب شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک گوشہ بعنوان "اقبالیات" علامہ اقبال سے متعلق ہے اور ایک گوشہ "یادرفتگاں" کے نام سے چند ایسے ادیبوں اور شاعروں کی یاد تازہ کرتا ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مضامین کی یہ کثرت اوران کا ایسا تنوع بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اتنے مختلف موضوعات پر معتبر اہل قلم سے اس قدر وقیع نگارشات لکھوانا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ادارہ الاقرباء اس کارنامے کے لیے مستحق داد اور لائق تقلید ہے۔

مضامین کے باب میں حضرت حسان بن ثابت کی شخصیت، شاعرانہ صلاحیت اور رسول اللہ صلعم کے لیے ان کی خدمات پر جناب اویس جعفری صاحب کا مضمون "حضرت حسان بن ثابت الانصاری" صاحب مضمون کے ذوق وشوق ان کی تحقیقی صلاحیت اور جانفشانی کا بہترین ثبوت ہے۔ یہ مضمون نہ صرف اپنے مشمولات میں وسیع اور عالمانہ ہے بلکہ نقد ونظر کے ہر اعلیٰ پیمانہ پر بھی پورا اترتا ہے۔ حضرت حسان کی شاعری کے مختلف اُدوار کے حوالے سے اویس صاحب نے ان کے کلام کا ماہرانہ تجزیہ کیا ہے اوران کی شاعرانہ صلاحیت اور ادبی مقام کا تعین کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے عقیدت پر تکیہ کرنے کے بجائے ادبی دیانتداری اور سنجیدہ تنقید کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے اور مضمون کو اس طرح متوازن اور معتبر بنادیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مضمون عربی اشعار کی کثرت سے بوجھل ہے۔ ہر چند کہ ان اشعار کا اردو ترجمہ دے دیا گیا ہے لیکن عربی اشعار کا اردو ترجمہ اسی طرح شعریت اور معنویت سے کم وبیش بے گانہ ہوتا ہے جیسے اردو اشعار کا عربی ترجمہ۔ ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں ایسا موثر اور بامعنی ترجمہ کرنا جس سے قاری خود کو ہم آہنگ کر سکے ایک انتہائی مشکل کام ہے۔

سید انتخاب علی کمال کا مشہور عالم تاریخ گو شاعر باقر گیلانی پر مضمون بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ اس سے صرف باقر گیلانی کی مہارت فن کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ فن تاریخ گوئی کی مختصر تاریخ بھی معلوم ہوتی ہے اوراس کے بہت اصول ورموز بھی مضمون میں واضح کر

دیئے گئے ہیں۔ آج کل فن تاریخ گوئی دنیائے ادب سے تقریباً غائب ہو چکا ہے۔ یہ مضمون اس فن کی اہمیت کے حق میں بہت معتبر شہادت دیتا ہے۔

مرزا غالب پر اُردو ادب میں جس قدر لکھا گیا ہے کسی اور ادیب یا شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ محمد فیصل مقبول عجز صاحب کا مرزا غالب پر مضمون (''یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب'') اُن کے تصوف کی جانب رجحان کے حوالے سے ہے جو ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے غالب کو کم لوگوں نے دیکھا اور سمجھا ہے چنانچہ یہ مضمون اس لحاظ سے بہت اہم ہے۔ جناب فیصل صاحب نے غالب کے اشعار سے اپنا موقف واضح کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ غالب کے ہر طالب علم کے لیے اس مضمون کو دیکھنا ضروری ہے۔

شاکر کنڈان صاحب کا مضمون ''سقراط: صاحب سیف و دانش'' محض ''برائے بیت'' قسم کا مضمون ہے۔ سعادت حسن منٹو کے مشہور افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پر تجزیاتی مقالہ اچھا ہے لیکن اس افسانہ پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اب اس مواد میں کوئی منفرد اور بامعنی اضافہ نہایت مشکل ہے۔ پھر بھی زیر نظر کوشش بری نہیں ہے۔ ''جنوبی ہند میں اُردو'' میں جاوید حبیب صاحب نے اردو پر سیر حاصل گفتگو ہندوستان کے اس حصہ کے حوالے سے کی ہے جو لسانی طور پر اردو کا بہت کم ہمدرد رہا ہے۔ انہوں نے اردو کے جنوبی ہند میں نفوذ اور اس کے ارتقا پر بہت محنت سے ایک قابل قدر مضمون پیش کیا ہے۔

غلام عباس ہمارے افسانہ نگاروں کی صف اوّل میں گنے جاتے ہیں اور یقیناً ان کا فن ہے بھی اس مقام کا مستحق۔ خالد امین صاحب نے اپنے مضمون ''غلام عباس اور ہمارا تہذیبی المیہ'' میں چابکدستی سے غلام عباس کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے فن کی اہمیت اور اثر پذیری پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون نہایت دلچسپ ہے اور شروع سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے خالد امین صاحب کا مطالعہ غلام عباس کی افسانہ نگاری کی ہر جہت پر محیط ہے چنانچہ انہوں نے جا بجا غلام عباس کے مختلف افسانوں کے اقتباس دے کر اپنے تجزیہ اور اس کے

نتائج کو پرزور اور مدلل بنایا ہے۔ یہ مضمون الاقرباء کے اس شمارہ کے وزن میں ایک بیش قیمت اضافہ کرتا ہے۔

علی صبا نویدی صاحب نے اپنے مختصر لیکن جامع مضمون میں ادب اور معاشرے میں گیت کی اہمیت اور اس کے فنی التزامات پر روشنی ڈالی ہے۔ گیت کی سماجی اہمیت اور لسانی ہیئت پر ان کی رائے بہت اہم اور علم افروز ہے۔ البتہ مضمون پڑھ کر ایک تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے جیسے ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ اگر وہ گیت اور اس کے فنی التزامات پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے اور ادب میں گیت کے مقام پر بحث کرتے تو مضمون مزید دلچسپ ہو سکتا تھا۔

رسالہ کا غزلیہ باب اپنے اندر دلچسپی کا بہت سامان رکھتا ہے۔ اس حصہ میں غزلوں کا انتخاب ادارۂ رسالہ کی بالغ نظری کا آئینہ دار ہے۔ اس میں نہ صرف معروف اور مقبول شاعروں کی اچھی اور دلکش غزلیات شامل کی گئی ہیں بلکہ نئی نسل کے نمائندہ شاعر اور شاعرات کو بھی اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ مدیر رسالہ کی جانب سے اردو شعر و ادب کے حق میں یہ ایک نہایت خوش آئند قدم ہے۔ اردو زبان اور شعر و ادب کا مستقبل نئی نسل سے ہی وابستہ ہے۔ ان کی ہمت افزائی اور ان کی ادبی و شعری کوششوں کی پذیرائی اشد ضروری ہے۔ اس طرح یہی نہیں کہ نئی نسل کو نسبتاً زیادہ پختہ مشق شاعروں سے استفادہ کا موقع ملے گا بلکہ پرانے لکھنے والے بھی نئی نسل کے انداز فکر و بیاں سے واقف ہوں گے اور اس طرح نئی سوچ اور طرز ادا کے دروازے کھل سکیں گے۔ باب غزل میں شامل سب غزلیں اچھے معیار کی ہیں اور نئے اور پرانے طرز تغزل کا دلکش امتزاج پیش کرتی ہیں۔ چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان سے رسالہ کے عام معیار کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

تمہارے حسن کی تاریخ نامکمل ہے کسی جگہ مرے حسن نظر کا ذکر نہیں

(ضامن جعفری)

روایت کا گلے میں طوق، سر پر تاج کانٹوں کا ہمیں پر منحصر کر دی گئی عزت گھرانے کی

(عذرا نقوی)

اس رسالہ کا باب افسانہ پانچ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اردو میں اچھے افسانوں کی ہمیشہ ہی کمی رہی ہے۔ اس صورت حال کے اسباب کے تجزیہ کا یہ مقام نہیں ہے۔ پریم چند سے لے کر موجودہ دَور تک گا ہے گا ہے اردو میں اچھے افسانہ نگار ابھرتے رہے ہیں۔ موجودہ دَور اس حوالے سے نسبتاً کمزور کہا جا سکتا ہے۔ رسالہ کا باب افسانہ بھی اس کے دوسرے مشمولات کے مقابلہ میں کمزور نظر آتا ہے۔ اچھے افسانہ کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زبان و بیان میں ایسا آسان اور پلاٹ اور کردار نگاری میں اتنا موثر ہو کہ اس کا قاری اسے ایک ہی نشست میں پڑھ کر ختم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ قدم بقدم چلنے پر مجبور کرے اور اُسے افسانہ کے کسی کردار میں اپنا ہی عکس نظر آئے۔ دو ایک افسانوں کو چھوڑ کر رسالے کے باقی افسانے اس پیمانہ پر پورا نہیں اترتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''زندگی کے بدلتے رنگ'' کا پلاٹ اس قدر گنجلک اور الجھا ہوا ہے کہ ہر قدم پر قاری افسانہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کس منزل میں ہے اور کیا بات کی جارہی ہے۔ اگر قاری کا ذہن مستقل افسانہ کی پیچیدہ بیانی کی گتھیاں ہی سلجھانے میں لگا رہے اور اس پیچیدگی کی وجہ بھی پردۂ خفا میں ہو تو افسانہ کا سارا لطف ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

اردو رسالوں میں دستور سا بن گیا ہے کہ رسالہ میں سب سے پہلے حمد، نعت، سلام یا ایسی ہی کوئی ادبی تخلیق شائع کی جاتی ہے۔ گویا یہ رسالہ کی کامیابی کے لیے ایک طرح کی دعا ہوتی ہے۔ الاقرباء نے اس شمارے میں مذکورہ دستور سے مختلف راہ اختیار کی ہے اور حمد و نعت وغیرہ کو رسالہ کے بیچ میں جگہ دی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ دعا بہر حال دعا ہے۔ حمد و نعت کے باب میں متعدد صاحب دل شاعروں کی تخلیقات دی گئی ہیں۔ کامیاب اچھی اور منفرد حمد اور نعت لکھنا نہایت مشکل کام ہے کیونکہ ان اصناف ادب میں بہت سے بڑے بڑے شاعر سب کچھ پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ پھر بھی الاقرباء نے اس صنف کا حق اچھی طرح ادا کیا ہے۔ اس شمارے کی حمدیہ اور نعتیہ تخلیقات کی خاص بات یہ ہے کہ تقریباً ہر حمد اور نعت راہ عام سے ہٹ کر

کہی گئی ہے۔ان میں ''میرے مولا بلالو مدینے مجھے'' والا گھسا پٹا عموم نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنا منفرد انداز خیال و بیان رکھتی ہے اور قاری کے ذہن و دل پر ایک سرور کی کیفیت چھوڑتی ہے۔

باب رباعیات کے متعلق ایک بات کہنی ضروری ہے۔ علم عروض میں رباعی کے چوبیس مخصوص اوزان مقرر کیے گئے ہیں جو کسی بھی مستند کتاب عروض میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ رباعی ایک مشکل صنف سخن ہے اور اس میں بڑے بڑے شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چنانچہ رباعی کہتے ہوئے بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ جب تک اس کے اوزان پر مکمل گرفت نہ ہو رباعی کہنے سے گریز بہتر ہے۔ آج کل دستور سا ہو گیا ہے کہ چار مصرعوں پر مشتمل ہر تخلیق کو رباعی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ چونکہ رسالہ کے قارئین اور مشاعروں کے سامعین کی ایک عظیم اکثریت رباعی کے اوزان اور رموز سے ناواقف ہوتی ہے اس لیے ہر چہار مصرعی نظم رباعی کے نام سے چل جاتی ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ الاقربا نے اس ضمن میں ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ جناب صابر عظیم آبادی کی رباعیات اس صنف سخن کی شرائط کو پورا کرتی ہیں اور شاعری کی آئینہ دار بھی ہیں۔ صابر صاحب اور ادارۂ الاقربا تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔

رسالہ میں طنز و مزاح کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ متفرقات کے تحت اس کمی کو ایک خاکہ ''غالب کا خط علامہ اقبال کے نام'' اور ایک انشائیہ ''آدھا تیتر، آدھا بٹیر'' سے پورا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ دراصل اس کوتاہی میں الاقرباء کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا خود اردو ادب کا ہے کہ ہمارے یہاں طنز و مزاح کی ہمیشہ زبردست کمی رہی ہے۔ ڈھونڈنے سے اچھے مزاح نگار مل جاتے ہیں لیکن عظیم مزاح نگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہمارے معاشرہ کی معاشی زبوں حالی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں آدمی کو ہمہ وقت ''روٹی کپڑا اور مکان'' کی فکر گھیرے ہوئے ہو وہاں طنز و مزاح کی کس کو فکر ہو گی۔ بہر حال مدیران رسالہ کو اس طرف توجہ کی ضرورت ہے تا کہ ان کی ادبی خدمات میں طنز و مزاح کے احیا اور پذیرائی کو بھی شامل کیا جا سکے۔

زیرِ نظر شمارے کا ایک نہایت دلچسپ اور مفید مطلب حصہ ''اقبالیات'' ہے جس کے تحت علامہ اقبال کے فکر اور ان کے فن پر چار اہم اور علم افروز مقالات دئے گئے ہیں۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر یہ بات صادق آتی ہے کہ جو شخص بھی اس میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرے گا اس کی مخالفت میں ایک دنیا کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایسے مخالفین کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اُس شخص کی کامیابی میں کیڑے نکالے جائیں اور اس کو کھینچ کر اپنی سطح پر لایا جائے۔ ایسی صورت میں وہ شخص اپنے موقف کی سنجیدہ اور شائستہ وضاحت اور اس کا مناسب دفاع کرتا ہے لیکن خود کو اپنے مخالفین کی سطح پر لے جانے سے گریز کرتا ہے۔ علامہ اقبال بھی اس کلیہ سے مستثنٰی نہیں رہے۔ ان پر بھی ہر جانب سے بے تحاشا اعتراضات کئے گئے لیکن آخر کار فتح علامہ اقبال کی ہی ہوئی۔ آج ساری دنیا علامہ کے مرتبہ کی معترف ہے جب کہ ان کے معترضین کا نام دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اقبالیات کے تحت مقالات علامہ اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر ان کے مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جوابات پر مفصل اور عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ اقبال کے موقف اور ان کے معتقدات کو سمجھنے میں یہ مقالات بہت معاون ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہر شمارہ میں ادب و شعر کی نامور ہستیوں سے متعلق ایک ایسا ہی سلسلہ پیش کیا جائے۔

آخر میں راقم الحروف ایک تجویز الاقرباء کی انتظامیہ کے سامنے رکھنے کا خواہاں ہے۔ رسالہ میں ایک مستقل باب ایسا ہونا چاہیے جس میں پرانے اساتذہ کی تخلیقات شائع کی جائیں۔ اس باب میں ولی دکنی سے لے کر پچھلی صدی کے مشہور و معروف شعرا اور ادبا کی تخلیقات کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایک تو ہمارے ادب کے نامور شعرا اور ادبا زندہ رہ سکیں گے اور دوسرے یہ کہ نئی نسل کے مطالعہ اور سیکھنے کا ایک مستقل اور مفید سلسلہ قائم ہو جائے گا۔

سلمان رضوی

تاج دارِ سخن میر ببر علی انیس کی یاد میں

میر ببر علی انیس اُردو میر ثیہ گو۔ میر مستحسن خلیق کے صاحبزادے ۱۸۰۱ء میں فیض آباد یوپی میں پیدا ہوئے خاندان سادات سے تعلق تھا۔ مولوی حیدر علی اور مفتی حیدر عباس سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فنون سپہ گری کی بھی تعلیم حاصل کی۔ فنِ شہسواری سے بخوبی شناسائی تھی۔ شاعری میں میر انیس اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ پہلے حزیں تخلص تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ کے کہنے پر انیس اختیار کیا۔ ابتداء میں غزل کہتے تھے۔ مگر والد کی نصیحت پر مرثیہ کہنے لگے۔ اور پھر کبھی بھی غزل کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اپنے بیٹے میر نفیس کی ولادت کے بعد اولاً سنہ ۱۸۵۹ء میں مرثیہ پڑھنے عظیم آباد گئے۔ اور پھر سنہ ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ کے اصرار پر حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔ انیس نے مرثیے کو اعلیٰ درجے پر پہنچایا۔ اردو میں رزمیہ شاعری کی کمی پوری کی۔ انسانی جذبات و مناظر قدرت کی مصوری کے ذریعے زبان کو وسعت دی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بقول ایک سعادت مند بیٹے کی طرح غزل کو سلام کیا اور پھر ساری عمر مرثیہ نگاری میں بسر کی:

عمر گزری ہے اِسی دشت کی سیاحی میں ——— پانچویں پُشت ہے شبیر کی مداحی میں

دو صدیاں گزر جانے کے باوجود مرثیے میں میر ببر علی انیس کا کوئی ثانی نہیں ہو سکا۔ اور اُن کی اسی عظمت نے اُن کے دیگر فنی اور شعری محاسن کو منظر عام پر آنے نہ دیا اور پھر ناقدین نے ان کی تخلیقات کا اس طرح ناقدانہ جائزہ نہیں لیا جیسے غالب، میر اور سودا کے کلام کا۔ اس کی ایک وجہ مرثیے کو فقط عزائی شاعری تک محدود کر دینا بھی تھا۔ اُن کی مکمل شاعری پر آج تک سوائے

حالی کے "موازنۂ انیس و دبیر" کے کوئی ایسا تنقیدی کام نہیں ہوا جسے واقعی ادبی معیار کا کام قرار دیا جا سکے۔ میر انیس کو بھی اپنی حیات میں اس امر کا اندازہ تھا جو انہوں نے کہا تھا:

حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہے کچھ باک — تا فہم ہے وہ چاند پہ ڈالے جو کوئی خاک

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

میر ببر علی انیس کی شاعری کا منبع و مرکز کربلا کا واقعہ اور شجاعت و قربانی ہے۔ اور انیس کی زبان کے حسن اور بیان کی سحر طرازی انھیں آسمانوں کی بلندیوں پر لے گئی ہے۔ میر انیس اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے مرثیہ میں بیاں کردہ مناظر کے علاوہ واقعات اور کردار باقاعدہ دیکھے اور محسوس کیئے جا سکتے ہیں۔ تاریخ مرثیہ نگاری میں یہ حقیقت بھی تحریر ہے کہ میر انیس کا معروف مرثیہ ۔ آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے۔

جب لکھنو سے دلی پہنچا تو نواب مُصطفی خاں شیفتہ نے صرف اس کا مطلع سُن کر اِس طرح داد دی کہ میر صاحب نے مکمل مرثیہ کہنے کی کیوں زحمت کی مصرع تو خود ہی ایک مکمل مرثیہ ہے۔

خورشید چھپا گرد اُڑی زلزلہ آیا — ایک ابر سیہ دشتِ پُر آشوب میں چھایا
پھیلی تھی جہاں دھوپ وہاں ہو گیا سایہ — بجلی کو سیاہی میں چمکتا ہوا پایا
جو حشر کے آثار ہیں سارے نظر آئے — گرتے ہوئے مقتل میں ستارے نظر آئے

میر انیس کے بیٹے میر نفیس کے نواسے میر عارف کی ایک تحریری یادداشت سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارہ سو ستاون کے بعد میر انیس نے محلّہ سبزی منڈی چوک لکھنو کے عقب میں واقع اپنی رہائش گاہ میں ایک سو ستانوے بند یعنی ایک ہزار ایک سو بیاسی مصروں کا مرثیہ "جب قطع کی

مسافت شب آفتاب نے" ایک ہی رات میں تحریر کیا اور اپنے گھر کے عشرے میں پڑھا جو انیس کے شاہکار مرثیوں میں سے ایک ہے۔ میر انیس کی مرثیہ نگاری کے معجزات میں بغیر نقطوں کے (غیر منقوطہ) مرثیے بھی ہیں۔ میر انیس شائد آنے والے حالات و واقعات کی پیش بندی کے عادی تھے اور شائد اسی لیے ۲۳ جولائی ۱۸۷۱ کو انہوں نے خاندان کے لیے ایک وسیع زمین گھر کے عقب میں اپنی تدفین کے خاطر ۱۰۰ روپے میں خرید لی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں ۲۴ رمضان کو انیس بیمار ہوئے اور ابتداً ہونے والا بخار وجہ وفات بنا اور یوں یکم دسمبر ۱۸۷۴ء کو بہ وقت مغربین یہ آفتاب شاعری غروب ہو گیا۔ غفران مآب کے امام بارگاہ میں سید بندے علی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور سبزی منڈی چوک میں اپنے ہی گھر کے باغ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ زندگی کے آخری ایام میں ایک رباعی میر انیس نے کہی:

کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا ۔۔۔ وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا ۔۔۔ سارے جھگڑے تھے زندگی کے انیس

مرثیہ نگاری اپنے اوج کمال پر میر ببر علی انیس کے ہاتھوں پہنچی۔ مغرب میں ہم لارڈ ٹینی سن کی نظم کو بھی مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ جو اُس نے اپنے دوست کے ڈوب کر مر جانے پر لکھی۔ مگر اس میں اور اُردو مرثیے میں فرق ہے۔ مذہب اور تہذیب کے عناصر بھی مختلف ہیں۔ اردو مرثیہ نگاری کے چار بڑے نام یہ ہیں میر انیس، مرزا دبیر میر مونس اور میر ضمیر۔ میر انیس جو اردو کے عظیم شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ میر تقی میر، غالب، اور اقبال کے ساتھ اُنہوں نے رباعی، سلام، نوحہ اور مرثیہ سب میں اپنی شاعرانہ عظمت کا ثبوت پیش کیا۔ اس سے پہلے تخلیق کیے گئے مرثیے زیادہ سے زیادہ پچاس بندوں پر مشتمل ہوتے تھے لیکن میر انیس کے یہاں ان کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں فارسی، ہندی، عربی، اودھی وہ تمام الفاظ استعمال کیئے جو مرثیے کی زینت بن گئے۔ میر انیس کے مرثیوں نے کئی نسلوں کو وجدان اور انسان دوستی

کے جذبے سے مالا مال کیا اردو زبان میں دلکشی اور وسعت پیدا کی۔ غالب سے لے کر آج تک کوئی اردو شاعر ایسا نہیں کہ جس نے میر انیس کو خراجِ تحسین پیش نہ کیا ہو میر انیس کو خود بھی اپنی مرثیہ نویسی پر بڑا ناز تھا آپ فرماتے ہیں۔

کسی نے تری طرح سے اے انیس عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

میر انیس کی مرثیہ نگاری کے فن اور اُس کی شرح تعبیر پر سب سے پہلے مولانا شبلی نعمانی نے انیس ودبیر کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں اُنہوں نے لکھا کہ انیس کی شاعرانہ خوبیوں اور محاسن کا کوئی دوسرا شاعر نہیں۔ اردو کے ایک بہت بڑے نستعلیق نقاد کے قول کے مطابق انیس کے مرثیوں کا موازنہ نظامی کے سکندر نامہ، اور فردوسی کے شاہ نامے سے کیا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے کربلا کی منظر کشی جس انداز میں کی تاریخ میں اُس کی نظیر نہیں۔

انیس نے مرثیے کی صنف میں جس طرح اپنی انفرادیت کو منوایا ہے وہ مرتبہ دوسری اصنافِ سخن میں کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا میر انیس، میر تقی میر، غالب اور اقبال کی قامت کے شاعر ہیں اور اُن کا مرثیہ ہومر کی رزمیہ نظم ایلیڈ سے کسی طرح کم نہیں۔

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

صابر عظیم آبادی

حمد

نظر آتی ہے جو شے بھی یہاں وہ ہے خدا تیری
فلک تیرا زمیں تیری جہاں تیرا فضا تیری

ہے جس کے سر میں سودا تیری الفت تیری چاہت کا
وہی کرتا ہے اس آفاق میں حمد وثنا تیری

ترے جلووں کے بحر بیکراں میں غرق رہتا ہے
وہ جس کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے ادا تیری

ترے ہی دم سے روشن ہے جہانِ رنگ و بو یارب
گلوں میں حسن ہے تیرا ستاروں میں ضیا تیری

تو اول سے ہے آخر تک تو آخر سے ہے اول تک
کہاں ہے ابتدا تیری کہاں ہے انتہا تیری

جو سرکش ہیں جہاں میں وہ برابر سر اٹھاتے ہیں
جو تیرے خاص بندے ہیں نبھاتے ہیں وفا تیری

ادا کس کس عنایت کا کروں میں شکریہ آخر
ستارے چاند سورج کہکشاں سب ہیں عطا تیری

مرا کچھ بھی نہیں ہے رنگ و بو کے کارخانے میں
بیاباں کی تپش تیری گلستاں کی ہوا تیری

بنائیں خود کو ہم ایسا کہ محشر میں نہ ہوں رُسوا
کریں وہ کام پیہم جن میں شامل ہو رضا تیری

شفیق احمد فاروقی (مدینہ منورہ)

نعت

بے دام ہے غلام یہ سرکارؐ آپؐ کا
کوچے میں بس رہے یہ طلبگار آپؐ کا

اوجھل نہ ہو نظر سے یہ دربار آپؐ کا
در پر پڑا رہے یہ نمک خوار آپؐ کا

اب ماسوئی سے کوئی بھی رغبت نہیں رہی
جب سے ہُوا ہے دل یہ گرفتار آپؐ کا

واللہ وہ نماز، امامت میں آپؐ کی
اللہ کا حضور، وہ احضار آپؐ کا

ہے منزلِ مُراد، ہر اک کی جُدا جُدا
سُودا ہے میرے سَر میں تو سَرکارؐ آپؐ کا

نکلے جو رُوح، سَر ہو مرا پائے ناز پر
اِس طور جاں کنی میں ہو دیدار آپؐ کا

نسبت قدومِ ناز کی تاحشر یُوں رہے
قدموں میں ہو جو دفن یہ بیمار آپؐ کا

وجہ سکونِ جاں ہے، کرم آپؐ کا حضورؐ
ہو جائے اَب کرم مرے سرکارؐ آپؐ کا

ظلمت کدہ ہے پھر سے یہ دُنیا بنی ہوئی
جلوہ ہے پھر جہان کو درکار آپؐ کا

بھیجوں تمام عُمر جو میں دَم بہ دَم سلام
کافی جواب مجھ کو ہے اِک بار آپؐ کا

بے عشق آپؐ کے، نہیں ایمان مُعتبر
محبوب ہے خدا کا پرستار آپؐ کا

اُس پر ہزار جان سے قُربان میں شفیق
کلمہ جو پڑھ رہا ہے، سَردار آپؐ کا

عبدالجبار اثر

نعت

سرتاج ہیں سارے نبیوں کے، پیارے ہیں وہ سب سے پیاروں میں
اللہ نے دی ہے سرداری، سرداروں کے سرداروں میں
کیا گنتی اُن پر دانوں کی شامل ہیں جو اس کے پیاروں میں
''وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں''
جو اُنؐ کی غلامی میں آکر ، تو قیرِ بلالؓ پاتے ہیں
شاہوں کو کہاں ملتی ہے بھلا وہ تاجوری درباروں میں
کیا رتبہ مدینے کو ہے ملا ، فیضانِ رسالتؐ تو دیکھو
اب رنگ ہے گنبدِ خضرا کا ، دنیا کے سبھی گلزاروں میں
جس نے بھی اطاعت کی ان کی جس نے بھی محبت کی اُنؐ سے
لاریب ! کہ فضلِ حق سے ہوا ، وہ جنت کے حقداروں میں
آقاؐ ہو ادھر بھی چشم کرم ، رہ جائے ہمارا کچھ تو بھرم
ہیں امتِ عاصی کے بیڑے ، محصور کئی منجدھاروں میں
کیا غم ہو اثر اِس دنیا کا کیا فکر کریں اُس دنیا کی
نازاں ہوں کہ سب سے بڑھ کر ہیں سرکارؐ مرے غمخواروں میں

عرش ہاشمی

نعت

یادِ خیر الوریٰ میں مگن ہوں تو پھر کیوں نہ ہوں ہم بفضلِ خدا مطمئن
ذکرِ خیر البشرؐ ہو وظیفہ اگر خود رکھے وردِ صلِّ علےٰ مطمئن

پہلے رہتا تھا بےچین اور مضطرب کب مرا دل کبھی ایسے تھا مطمئن
محفلِ نعت میں جیسے رکھتی ہے اب مدحتِ شاہؐ ہر دوسرا مطمئن

شرمسار اپنے اعمال پر میں رہا، اپنے انجام سے تھا میں نا مطمئن
پھر نظر اُنکی رحمت کی جانب اُٹھی ایکدم دل مرا ہوگیا مطمئن

ہو کرم کی نظر اے شہؐ بحر و بر، ایسے حالات میں دل ہو کیا مطمئن
ناؤ گرداب میں ہے عدو گھات میں اور اُس پر بھی ہے ناخدا مطمئن

میرے آقا کی چشمِ عنایت رہی اُن کے صدقے ملا مجھ کو جو کچھ مِلا
سب سے بڑھ کر دلِ مطمئن مل گیا جب بھی دیکھا اُسے وہ ملا مطمئن

کارِ دنیا سے گو لاتعلق نہ تھا کچھ غمِ بیش و کم اُس کو لاحق نہ تھا
تھا وہ جس حال میں اور جہاں بھی رہا، ہر غلام آپ کا تھا سدا مطمئن

آپ کی شانِ والا کا عرفاں کسے، کب کسی کا کلام اُن کے شایان ہے
کیا ادا ہو سکے عرش مدحت کا حق کیا کرے کوئی حرفِ ثنا مطمئن

نورین طلعت عروبہ

نعت

آپؐ کی چاہت ہویدا ہو مری گفتار سے
آپؐ کا لطف و کرم جھلکے مرے کردار سے

زندگانی کی حقیقت جو بھی چاہے دیکھنا
لو لگا کر بیٹھ جائے سیّدؐ ابرار سے

آپؐ کے بے سایہ پیکر نے وہ چھاؤں بخش دی
کیا زمانہ مانگنے جاتا بھلا اشجار سے

دو جہانوں کی عبادت کا مزہ ہے اُس جگہ
جس جگہ ملتی ہے جنت آپؐ کی دیوار سے

آپؐ کے خُلقِ معظّم سے ہی ممکن ہو سکا
ورنہ کب دل جیت سکتا ہے کوئی تلوار سے

آپؐ کا طرزِ عمل ہے ہم سبھی کا رہ نُما
زندگی کا حُسن سارا آپؐ کے افکار سے

وردِ اسمِ مُصطفیٰؐ سے کیا خبر ایسا بھی ہو
آملے جنت کی خُوشبو نعتیہ اشعار سے

حسن زیدی

نعت

زائرِ کوئے جناں آہستہ چل
آپؐ سوئے ہیں یہاں آہستہ چل

اے مرے عزمِ جواں آہستہ چل
جا رہا ہے تُو جہاں آہستہ چل

ہے ادب گاہِ جہاں آہستہ چل
اے امیرِ کارواں آہستہ چل

آج کے ہنگامہ پرور دور میں
ہے یہ شہرِ پُراماں آہستہ چل

یہ مقامِ قُدس ہے ، دیتی نہیں
زیب یاں آہ و فغاں آہستہ چل

کیا خبر تجھ کو خبر تک بھی نہ ہو
ہر عمل ہو رائیگاں آہستہ چل

گر سنانے جا رہا ہے اے حسنؔ
رنج و غم کی داستاں آہستہ چل

محمد اویس ابن محمود بہاولپوری

نعت

وہؐ جو صبحِ لم یزل ہیں میری تیرگی مٹا دیں
مجھے دامنِ نظر میں میری ذات سے چھپا دیں

مجھے دن کی روشنی میں نہیں کچھ سجھائی دیتا
میری غفلتوں کا پردہ میرے دل سے اب ہٹا دیں

میں کھڑا ہوا ہوں تنہا، میرا دل بھی ہے فسردہ
میں بھٹک نہ جاؤں آقاؐ مجھے آپ آسرا دیں

میرے سامنے ہے دریا جہاں ٹوٹی میری نیّا
میں پڑا ہوں اس کنارے مجھے پار اب لگا دیں

مری ڈوبتی ہیں نبضیں مرا دل لرز رہا ہے
مرے آپؐ ہی معالج، مجھے آپؐ ہی دوا دیں

ہے عطا یہ سب اُنہی کی جو عذاب ٹل گیا ہے
میرا رب بھی کہہ رہا ہے اسی در پہ سر جھکا دیں

مجھے اذن ہو سفر کا، ہو سفر میں زادِ رہ بھی
جو چلوں میں سر جھکا کے مرا حوصلہ بڑھا دیں

سیّد حبیب اللہ بخاری

نعت

اللہ جانتا ہے حضورؐ آپؐ کا مقام
واللہ ! بھیجتے ہیں فرشتے سدا سلام

معراج کے سفر میں تھے جبریلؑ ہمرکاب
بُراق پر سوار ہوئے سیّدالانامؐ

پہنچے جب ایسی شان سے عرشِ عظیم پر
پھر رُوبرُو خدا سے ہوئے آپؐ ہمکلام

ہر آسماں پہ سب ہی پیمبر تھے منتظر
حکمِ خدا سے سب نے کیا آپؐ کو سلام

سب دوریاں تمام ہوئیں حکمِ خاص سے
سب اُٹھ گئے حجاب پئے سیّدؐ الانام

کیا کیجئے بیاں شبِ معراج کا حبیب
ایسا سفر کہ ایک ہی شب میں ہوا تمام

صابر عظیم آبادی

○

ہزاروں رنگ میں ڈوبا ہوا تھا خواب میں تھا
وہ اک کنول جو ابھی عالمِ شباب میں تھا

وہ بوڑھے ماضی کے لہجے میں کر رہا تھا بات
مگر وہ لمحۂ موجود کے عتاب میں تھا

ہر ایک شخص مجھے دیکھتا تھا حیرت سے
میں اپنی ذات کے سوکھے ہوئے سراب میں تھا

نہ جانے کس نے نوازش کے پھول برسائے
میں ایک خار تھا جو حلقۂ گلاب میں تھا

گھرا ہوا تھا وہ جنگِ نشاط و غم میں اُدھر
مرا وجود ادھر سخت احتساب میں تھا

اسی کو دیکھ کے کرتا تھا یاد تازہ میں
وہ ایک سوکھا ہوا پھول جو کتاب میں تھا

بس ایک پردہ تھا آنکھوں کے درمیاں حائل
عیاں تھا چاروں طرف وہ مگر حجاب میں تھا

اُگی ہوئی تھی ہر اک جا خوشی کی ہریالی
مرا ستارہ مگر عرصۂ عذاب میں تھا

نہ صرف پاؤں میں صابر تھکن کی شدت تھی
اندھیری رات کا جگنو بھی اضطراب میں تھا

سیّد زاہد حسین سالک

○

وفا بھی کم جفا بھی کم گلہ یوں بھی ہے اور یوں بھی
خفا ہم سے تو وہ کافر ادا یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ کچھ صیّاد کا کھٹکا نہ غم برق نشیمن کا
چمن سے تو قفس میں فائدہ یوں بھی ہے اور یوں بھی

دوائے چارہ سازِ دل جو ہو تب کیا نہ ہو تب کیا
کہ مُہلک تو یہ درد لا دوا یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ تابِ گفتگو مجھ کو نہ یارائے شنید اس کو
ستم ناگفتنی اس شوخ کا یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ بزم ناز کا ہے راستہ یہ کوئے دشمن کا
مگر اس حیلہ جُو کا نقش پا یوں بھی ہے اور یوں بھی

زبانِ حال بھی گویا نگاہِ یاس بھی سائل
عیاں تم پر ہمارا مدعا یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ تسکیں شامِ ہجراں میں نہ راحت وصلِ جاناں میں
نصیبِ دل غمِ صبر آزما یوں بھی ہے اور یوں بھی

عدو پر مہرباں ہو ہم سے کم آمیز ہو، تم سے
ہمیں تو بے وفائی کا گلہ یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ تیری خوش نصیبی ہے تُو زاہد بھی ہے سالک بھی
شناسائے رموزِ کبریا یوں بھی ہے اور یوں بھی

ضامن جعفری

(خودساختہ و مُعر باختہ نو اُستادانِ شعر کی نذر)

○

دو قدم کو عشق کا پورا سفر کہنے لگے
وہ ابھی سے خود کو حرفِ معتبر کہنے لگے

پردۂ اصلاح میں ہے نشترِ تشنیع و طنز
زخمِ دل کو دردِ دل کا چارہ گر کہنے لگے

پستیٔ علم و ہُنر کی پردہ پوشی کے لیے
لوگ جہلِ فکر کو بھی اب ہُنر کہنے لگے

زلفِ پیچاں اور پریشاں بھول جائیں گے وہ سب
اہلِ دل بھی حالِ دل اپنا اگر کہنے لگے

چاک سے واقف نہ مٹی کی ابھی پہچان ہے
کل کے لڑکے آج خود کو کوزہ گر کہنے لگے

عاشقانِ عہدِ نو سے پوچھتا پھرتا ہے عشق
عشق کی شُدھ بُدھ بھی ہے؟ زیروزبر کہنے لگے؟

رفتہ رفتہ قافلے لُٹنے کے عادی ہو گئے
راہرو جب راہزن کو راہبر کہنے لگے

کیا ہوئی بینائی اہلِ ادب ضامن کہ لوگ
کور چشمانِ ادب کو دیدہ ور کہنے لگے

○

آغازِ محبت کا سماں بھول گئے کیا
ہر لحظہ وہ رقصِ دل و جاں بھول گئے کیا

چہرے کی تب وتاب وہ آہٹ پہ ہماری
ہر پل وہ سوئے درِ نگراں بھول گئے کیا

کیا حرفِ محبت کو تکلّم کی ضرورت
آنکھوں میں ہے جو حُسنِ بیاں بھول گئے کیا

وہ حسن و جوانی کے لپکتے ہوئے شعلے
اور اُن میں سکونِ دو جہاں بھول گئے کیا

ہر چیز اہم تھی ، نظر و لہجہ و الفاظ
ہر چیز پہ سو سو تھے گماں بھول گئے کیا

یوں یاد دِلاتا ہوں اُنہیں وعدۂ فردا
میں آپ کے صدقے مری جاں بھول گئے کیا

ہے کوئی جواں اُن سے یہ ذرا پوچھ کے آئے قدریں
وہ بزرگوں کی میاں بھول گئے کیا

شیرینیٔ گفتار ہے ضامن جو تمہاری
ہے صدقۂ شیریں دہناں بھول گئے کیا

مضطر اکبر آبادی

O

ذمہ داری بھی زحمت ہے آزار ہے
سر پہ لٹکی ہوئی ایک تلوار ہے

بھید اس کے کسی طور کھلتے نہیں
آدمی بھی بڑا ہی پُر اسرار ہے

سادہ لوحی ہے اُس کی محلِ نظر
سائے کا دھوپ سے جو طلب گار ہے

وقت لمحوں میں کرتا ہے صدیوں کا طے
تیز بے حد زمانے کی رفتار ہے

صورتِ حال ہے اپنے گھر کی یہ اب
دَر سلامت ہے کوئی نہ دیوار ہے

سب دکھاوا ، تصنع ، سراسر غلط
کون غم خوار ہے کس کا غم خوار ہے

زندگی کے بھی اپنے ہی انداز ہیں
گاہ آسان ہے گاہ دشوار ہے

گفتگو ہی نہیں، صرف اس کے سوا
خامشی بھی تو اِک طرزِ اظہار ہے

دشمنوں اور حریفوں کا ہی ذکر کیا
دوستوں کا بھی مشکوک کردار ہے

اُف یہ شہروں کی گنجان آبادیاں
سانس لینا بھی اب سخت دشوار ہے

اُف زمانے کی مضطرؔ یہ نیرنگیاں
ناسزاوار بھی اب سزاوار ہے

امین راحت چغتائی

O

عمر بھر لکھتے رہے یوں تو حدیثِ دیگراں
غور سے دیکھا تو نکلی اپنے دل کی داستاں

ہم اَنا کے کھیل میں کچھ اِس قدر اُلجھے رہے
رفتہ رفتہ ہو گئے گم اپنی منزل کے نشاں

شام بھی ڈھلنے کو ہے، اب آؤ مل بیٹھیں کہیں
ورنہ پل چھن میں نہ جانیں ہم کہاں اور تم کہاں

اس سے پہلے تو لب و لہجہ کبھی ایسا نہ تھا
کوئی ہے آیا ہوا شاید ہمارے درمیاں

کیوں نہ اپنے فیصلے اپنی زمیں پر ہی کریں
کب تلک لاتے رہیں گے بیچ میں ہم آسماں

اک عجب منظر ہے دل میں اُن کی یادوں کا ہجوم
جیسے پھولوں کے کسی تختے میں اڑتی تتلیاں

زندگی کیا ہے بہت سوچا تو یہ عقدہ کُھلا
دشت و صحرا میں لیے پھرتا ہو جیسے سارباں

اب تمنا کیا کوئی آئے نہ آئے، کیا غرض!
ہم تو خود گھر میں ہیں راحت کوئی دن کے میہماں

شفق ہاشمی

O

مرحلے ہیں سفرِ شوق کے دشوار بہت
قافلہ ایک ہے اور قافلہ سالار بہت

منزلیں ہیں کہ بہت دور ہوئی جاتی ہیں
راستے ہیں کہ ہوئے جاتے ہیں پُر خار بہت

جن کو ہونا تھا، ترا کشتۂ بیداد ہوئے
تو بھی رسوا ہے مگر اے نگہِ یار بہت

اپنا یہ حال ہوا تیری مسیحائی میں
سوختہ جاں ہیں غمِ زیست کے بیمار بہت

ہائے وہ شخص کہ تھا اپنی اداؤں کا قتیل
تیر کام آئے اُسے اور نہ تلوار بہت

بے زروں کے لیئے پیغامِ اجل بن بیٹھے
بے بصیرت تھے مرے عہد کے زردار بہت

کیوں نہ اس گرمیِ بازار میں ہم بھی بک جائیں
شہر میں جنسِ وفا کے ہیں خریدار بہت

جتنے آزادہ روِ جادۂ منزل تھے شفق
ہیں وہی گیسوئے قاتل کے گرفتار بہت

سیّد مشکور حسین یاد

O

ہم زمانہ کی ضمانت سے بہت آگے ہیں
وقت کی ساری وکالت سے بہت آگے ہیں

خاک ٹھہرے کہ ہوا لے کے انہیں اڑ جائے
جسم و جاں قیمت و قامت سے بہت آگے ہیں

خود کو سمجھا ہے ترے شہر کے لوگوں نے کہاں
یہ تو سب اپنی وضاحت سے بہت آگے ہیں

ایک ہنگامہ پہ موقوف نہ سمجھو ہم کو
ہم قیامت میں قیامت سے بہت آگے ہیں

یاؔد پہچان میں خود بھی نہیں آتے کریں کیا
ایسے نادر ہیں کہ ندرت سے بہت آگے ہیں

مرزا معصوم پانی پتی

O

کانٹے سے کھٹکتے ہیں کبھی لطف و کرم بھی
دیتی ہے سکوں دل کو کبھی شدتِ غم بھی

احساس کے ماتھے پہ شکن تک نہیں آئی
گو لاکھ زمانے نے کیے ہم پہ ستم بھی

دی ہم کو اگر گردشِ حالات نے فرصت
ہم سیف بکف ہونگے کبھی اہلِ قلم بھی

میخانے کا ماحول ہی افسردہ نہیں ہے
سنسان نظر آتے ہیں اب دیر و حرم بھی

معصوم بڑے حسرت و ارماں بھی ہیں دل میں
اے کاش کہ کھیلیں کبھی اُس زلف سے ہم بھی

سیّد تابش الوری

O

خود روشنی ہی اور اندھیرا بڑھا نہ دے
گھر کا چراغ اپنے ہی گھر کو جلا نہ دے

خود کردہ لغزشیں ہی مری بے شمار ہیں
ناکردہ لغزشوں کی تو مجھ کو سزا نہ دے

اپنے خلاف ہی مرے اندر الاؤ ہے
میں پھٹ پڑونگا، دیکھ مجھے حوصلہ نہ دے

دوشِ صبا پہ اب نہ سلام و پیام بھیج
چنگاریاں دبی ہیں، انھیں یوں ہوا نہ دے

میں جانتا ہوں میرا مرض لاعلاج ہے
جھوٹی تسلیوں سے مجھے آسرا نہ دے

دل خون ہو کے دیدۂ تر سے ٹپک گیا
میرے خدا! اب اور کوئی سانحہ نہ دے

خودداریٔ حیات ، مری کائنات ہے
تیری عطا ، مقام انا سے گرا نہ دے

گر تو گمان بھی ہے تو خود کو یقیں بنا
بے رحم ہے ، ہوائے زمانہ ، مٹا نہ دے

جس زندگی میں عشق حبیبؐ خدا نہ ہو
اس کا تو ایک سانس بھی مجھکو خدا نہ دے

کب پتھروں کو ٹوٹے دلوں نے کیا گداز
بہرے بلند بام محل پر ، صدا نہ دے

انوار فیروز

O

اشک جتنے تھے وہ گوہر ہو گئے
اس لیے حیراں سمندر ہو گئے

ہم نے خوں سے دیپ روشن کر دیئے
راستے سارے منور ہو گئے

خواب محلوں کے دکھائے تھے ہمیں
لوگ سارے یونہی بے گھر ہو گئے

جو ہماری بھیک پر پلتے رہے
آج وہ سب صاحبِ زر ہو گئے

اشک کوئی بھی نہیں باقی رہا
خشک آنکھوں کے سمندر ہو گئے

شہر پر جن کا اجارہ تھا کبھی
بند ان پر آج سب در ہو گئے

کس نے بستی پر یہ جادو کر دیا
لوگ کیوں سارے ہی پتھر ہو گئے

صورتیں ساری یہاں دھندلا گئیں
آئینے سارے مکدر ہو گئے

بارشیں کیوں اب یہاں ہوتی نہیں
کھیت اب سارے ہی بنجر ہو گئے

کل تلک انوار میرے ساتھ تھے
اب وہ میری صف سے باہر ہو گئے

سرور عالم راز سرور

O

اقرار وفا، اُمید کرم کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے
وعدے وہ ترے مبہم مبہم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

سرشاریٔ اُلفت کا عالم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے
جذبات کی وہ دھیمی سرگم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

آلام کی وہ یورش پیہم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے
ڈوبی ہوئی نبضوں کا عالم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

یادوں کی خلش وہ شام و سحر، مایوس سے وہ دیوار و در
احساس کی لو مدّھم مدھم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

کیا وہم و گماں، کیا علم و یقیں، کیا فکرِ غمِ دنیا و دیں
ہستی کے وہ سارے پیچ و خم، کچھ کہہ نہ سکے کچھ بھول گئے

وہ شعر مجسم، جانِ سخن، ہر سانس میں یوں ہے نغمہ زن
افسانۂ غم، رودادِ الم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

کب دَورِ خزاں آیا اور کب رخصت وہ گُلِ رعنائی ہوا
محرومیٔ جاں، مجبوریٔ غم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

دل ایسے پرانے پاپی کو کیا کام ہے دین و ایماں سے
وہ سازِ کلیسا، سوزِ حرم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

عنوان یہی ٹھیرے سرورؔ، افسانۂ ہستی کے تیرے
یا قلبِ حزیں، یا دیدۂ نم، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ بھول گئے

حسن چشتی۔ شکاگو (امریکہ)

O

ہر شخص مجھے اپنا سراپا سا لگے ہے
دُکھ درد کسی کا بھی ہو، اپنا سا لگے ہے

اُس شہرِ تمنا کے اُجالوں کو دُعا دو
اِس دیس میں دن کو بھی اندھیرا سا لگے ہے

جو میرے تصور میں حقیقت کی طرح تھا
اب سامنے آیا ہے تو سپنا سا لگے ہے

چُبھتے ہیں مرے دل میں تری یاد کے نشتر
اس میں بھی ترا کوئی اشارہ سا لگے ہے

اور اب تو یہاں بھول کے ہنستا نہیں کوئی
تم جب سے گئے شہر ہی سُونا سا لگے ہے

جس کوچے میں دیوار بھی دیتے نہیں سائے
اُس کوچے میں اب دھوپ بھی سایہ سا لگے ہے

اب اُٹھو حسنؔ باندھ لو سامانِ مسافت
دُنیا کسی ناٹک کا تماشا سا لگے ہے

پروین شیری (امریکہ)

O

ہے آسیبوں کا سایہ میں جہاں ہوں
شبِ دشتِ بلا میں بے اماں ہوں

چراغاں سا ہے دروازے پہ لیکن
میں اندر سے بہت تیرہ مکاں ہوں

کنارے پر پڑاؤ سب نے ڈالے
سمندر میں اُتر تنہا رواں ہوں

وہ بادل تھا ہوا کا ہمسفر تھا
میں تشنہ کام فصلِ رائیگاں ہوں

ہوا کے زد پہ جیسے شمع کی لو
میں اپنے حوصلوں کا امتحاں ہوں

ستوں کچے تھے بارش سہ نہ پائے
سلگتی دھوپ میں بے سائباں ہوں

پتہ میرا کسی کو کیا ملے گا
نشاں ہوتے ہوئے بھی بے نشاں ہوں

سیّد صفدر حسین جعفری

O

یہ تیرگی میں ترازو ہے روشنی کس کی
یہ کس کی عشوہ گری ہے فسوں گری کس کی

یہ کس نے اَحسن تقویم پر بنایا مجھے
ہے کس کا حُسنِ تخیّل مصوری کس کی

یہ کس کے تارِ نفس سے بندھا ہوا ہوں میں
گرفت کس کی ہے اور دل گرفتگی کس کی

یہ کس کا زورِ قلم بولتا ہے حرفوں میں
فسانہ کس کا ہے اور کشتِ آگہی کس کی

یہ کس نے میرے گریباں کو تار تار کیا
وفورِ شوق ہے کس کا یہ بے کلی کس کی

یہ کس نے بخیہ گری کی ہے چاک داماں کی
ہے دوستی کے لبادے میں دشمنی کس کی

یہ کس نے میرے دل و جاں میں گھر کیا صفدرؔ
یہ کس کی بندہ نوازی ہے بندگی کس کی

عبدالجبار اثر

O

ظلم ڈھانے کے تو ہوتے ہیں بہانے کتنے
اور ابھی ظالمو! اجڑیں گے گھرانے کتنے

دیکھ کر حالِ گلستاں یہ نظر آتا ہے
اور ہوں گے بُرے حالات نہ جانے کتنے

وقت بدلے تو یہ آنکھیں بھی بدل لیتے ہیں
آج اس دور کے انساں ہیں سیانے کتنے

جن کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں آج نصیب
ہم نے دیکھے ہیں یہاں ایسے گھرانے کتنے

کچھ چکا چوند میں ابلاغ کی آتا ہے نظر!
ان میں کتنی ہے حقیقت ہیں فسانے کتنے

آنا چاہیں تو کوئی روکنے والا ہی نہیں
اور نہ آنے کے تو ہوتے ہیں بہانے کتنے

سب کے سب ہو گئے 'مسمار' بچا ہی کیا ہے
تم نے دیکھے تھے اثرؔ خواب سہانے کتنے

کرامت بخاری

O

ایک چہرہ مری نگاہ میں ہے
کوئی یوسف ہے اور چاہ میں ہے

دل میں رہتا ہے ایک ماہ جبیں
میرا دشمن مری پناہ میں ہے

دیکھنے کی ہے آنکھ بھی مجرم
دل بھی شامل اِسی گناہ میں ہے

اِک مروت بھی ہے تغافل میں
اِک محبت بھی انتباہ میں ہے

اُس سے تکرار سود مند نہیں
فائدہ جو بھی ہے نباہ میں ہے

لاکھ ڈھونڈو کہیں نہیں ملتا
لطف جو دو دِلوں کی چاہ میں ہے

اُس کی جانب بڑھے گی خود منزل
وہ مسافر ابھی جو راہ میں ہے

O

یہ کس ویران وادی کا سفر ہے
بڑی زرخیز لیکن بے ثمر ہے

مرے دامن میں جب سے ہے محبت
سُنا ہے حادثوں کو بھی خبر ہے

نہ کیوں صحرا میں عکس آب دیکھوں
یہ پانی کی پُرانی رہ گزر ہے

کُھلی جب سے تلاطم کی حقیقت
اُسی دِن سے طبعیت بے خطر ہے

نئے قصے پُرانے تذکروں سے
نئی سوچوں پہ ماضی کا اثر ہے

ہر ایک ارماں کو بن جانا ہے حسرت
تو پھر یہ زیست کس اُمید پر ہے

وہی جو باخبر کہتا ہے خود کو
وہی سب سے زیادہ بے خبر ہے

محمد اویس ابن محمود بہاولپوری

O

دور صحرا کی کڑی دھوپ میں چھاؤں جیسا
وہ تو لگتا تھا مجھے میری دعاؤں جیسا

اک ریاست تھی میرے پاس نوابوں جیسی
اب ترے شہر میں پھرتا ہوں گداؤں جیسا

تو نہ تھا پاس تو روٹھی تھیں بہاریں مجھ سے
جیسے موسم ہو میرے ساتھ خزاؤں جیسا

اب اُسے ڈھونڈتا پھرتا ہوں بیابانوں میں
جو مرے پاس سے گزرا تھا ہواؤں جیسا

رُخ روشن ہے کہ اک مہر درخشاں ہے اویس
کالی زلفوں کا نظارا ہے گھٹاؤں جیسا

حسن زیدی

O

زندہ ہوں مگر زیست شناسا تو نہیں ہوں
اے درد کی دنیا تجھے بھولا تو نہیں ہوں

یادوں کا حسیں شہر مرے دل میں بسا ہے
اے دوست ترے شہر میں تنہا تو نہیں ہوں

رحمت سے تری کل بھی میں مایوس نہیں تھا
اور آج بھی شفقت تری بھولا تو نہیں ہوں

قسمت میں جو لکھا ہے بتا کیوں نہیں دیتا
اے کاتب تقدیر تماشا تو نہیں ہوں

اب جان حسنؔ لے کے ہتھیلی پہ ہوں پھرتا
اغیار کو یہ وہم کہ چھپتا تو نہیں ہوں

فریدہ لاکھانی۔فرح (سڈنی۔آسٹریلیا)

O

کسی سے کوئی شکایت نہ کچھ گلہ رکھئے
دراز صرف محبت کا سلسلہ رکھئے

خیال و خواب میں ہی اس سے رابطہ رکھئے
خرد سے کچھ تو جنوں کا معاملہ رکھئے

دلوں کی بات دلوں تک رہے تو بہتر ہے
زبان کھول کے کیوں اپنا مدعا رکھئے

تمہاری راہ پہ آجائے گا کبھی نہ کبھی
ابھی تو باتوں میں کچھ دن اسے لگا رکھئے

جدائی اس کی دل و جاں پہ لاکھ بار سہی
وہ مل ہی جائے گا اک روز، حوصلہ رکھئے

عطائے دوست ہے جانے نہ دیجئے اس کو
متاعِ غم کو کسی طور سے بچا رکھئے

جو بات ہے وہ دلوں تک پہنچ ہی جائے گی
چھپا کے شعر میں اک حرفِ مدعا رکھئے

خود اپنے ضبط کا دامن نہ چھوٹ جائے کہیں
قریب جا کے بھی کچھ، اس سے فاصلہ رکھئے

شمع سیّد

O

یقیں بھی وہی جو گماں لے گیا ہے
کہ وہ جاتے جاتے بھی جاں لے گیا ہے

جو ایندھن کی خاطر شجر کٹ چکا تھا
وہ چڑیوں کے سارے مکاں لے گیا ہے

چھلکنے لگی ہے مری آنکھ بھی اب
سبھی ضبط وہ مہرباں لے گیا ہے

کنارا ابھی دور ہی تھا کہ مجھ سے
مری ناؤ کا بادباں لے گیا ہے

سبھی تیر میرے بدن میں اتارے
وہ اب اپنی ٹوٹی کماں لے گیا ہے

جو ہمدم بنا تھا مری برف رت میں
کڑی دھوپ میں سائباں لے گیا ہے

زمیں پر پٹخ کر مجھے آسماں سے
مرے ٹوٹے پر وہ کہاں لے گیا ہے

حمایت علی شاعر (کینڈا)

برزخ (ایک تمثیلی نظم)

صنم کدے کی نیم تاریک روشنی میں شکستہ مجسموں کے درمیان وحشت زدہ بت تراش آذر غیر مطمئن نظروں سے دیکھتے ہوئے جھلا کر اپنے نامکمل مجسمے کو توڑ دیتا ہے اور مٹھیاں بھینچ کر اضطراب کے عالم میں بولنے لگتا ہے)

آذر: میری تخئیل ۔ مرے فن کا وہ شہکار عظیم
کن خلاؤں میں ہے گم؟
(شیشہ ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے)
تیشہ بے چین ہے پتھر پہ مچلنے کے لیے
سنگ بے تاب ہے ۔ اک جسم میں ڈھلنے کے لیے
(ناتراشیدہ پتھروں کو دیکھتے ہوئے)
آنکھیں بے خواب ۔۔۔ کہ تعبیر نظر آئے کوئی
ذہن بیدار ۔۔۔ کہ تنویر نظر آئے کوئی
انگلیاں چاہتی ہیں، پیکر تخئیل کا لمس
(ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)
کوئی خاکہ ہے نہ سایہ ، کوئی پرتو ہے نہ عکس
کچھ نہیں
کچھ بھی نہیں
کوئی صورت نہیں شرمندۂ سنگ
کوئی عنواں نہیں منت کش رنگ

(ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے)

دور نزدیک خلاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرہ و تار فضاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں

(سر جھکا لیتا ہے ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد بے چارگی کے عالم میں)

اپنی تخیل کا وہ نقش ابھاروں کیسے؟

زیست اور موت کو پتھر میں اتاروں کیسے؟

زیست۔۔۔ایک حسن

سحر دم گل خنداں جیسے

موت۔۔۔ایک حُزن

خزاں دیدہ گلستاں جیسے

یہ ہے آغاز، تو انجام ہے وہ

یہ ہے اک صبح تو اک شام ہے وہ

ایک آغاز کو انجام بناؤں کیسے؟

صبح اور شام کے فرسنگ مٹاؤں کیسے؟

ایک ساعت میں سمیٹے ہوئے اک عمر کا طول۔۔۔

ایک پتھر میں یہ جذبات جگاؤں کیسے؟

(گھٹنوں پہ سر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے)

(وقفہ)

(یکا یک اُسے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے قدِ آدم آئینہ

روشن ہو گیا ہو۔۔۔آذر کا عکس نمودار ہوتا ہے اور

وہ اس سے مخاطب ہوتا ہے)

عکس: پھر اسی فکر میں غلطاں ہو۔۔اسی سوچ میں ہو
اک موہوم تصور کو بنا کر منزل
کب تک ان تیرہ فضاؤں کا سفر کاٹو گے؟
(آذر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے)

آذر: (زہر خند کے ساتھ) تم نے مجھ کو کبھی سمجھا ہی نہیں
میری تخئیل کو پرکھا ہی نہیں
میرے سینے میں فروزاں ہے جو شمع
تم نے پیارے اُسے دیکھا ہی نہیں

عکس: مجھ کو معلوم ہے آذر کہ تمہاری تخئیل
ماورائے غمِ دنیا ہے۔۔۔مگر۔۔۔کیا حاصل؟
وہ سفر کیا۔۔۔کہ نہ منزل نہ نشانِ منزل

آذر: میری منزل مری دنیا میں کہاں ہے اے دوست
میرا حاصل۔۔مرے سینے میں نہاں ہے اے دوست
جاؤ تم۔۔۔مجھ کو ذرا سوچنے دو

عکس: تم ذرا کہتے ہو۔۔کتنے ہی مہینے گزرے
اور تم اپنے صنم خانہ خاموش سے باہر نہیں نکلے دم بھر
روز خورشید دہکتا رہا اور بجھتا رہا
چاند کی بزم سنورتی رہی چپ چاپ بکھر جاتی رہی
پھول کھلتے رہے مرجھاتے رہے
آشیانوں سے پرند اُڑتے رہے، لوٹ کے آتے بھی رہے

زندگی اپنے مشاغل سے الجھتی بھی سلجھتی بھی رہی
وقت چپ چاپ گزرتا رہا۔۔۔لیکن۔۔۔اک تم۔۔۔
ایک تم ہو کہ تمہارے افق تار پہ چمکی نہ کرن
ایک تم ہو کہ تمہیں کوئی نظر پا نہ سکی
کوئی آہٹ تمہیں چونکا نہ سکی
آخر اس طرح سے تم کیسے جیو گے آذر؟
(آذر ہنستا ہے)

آذر: دوست۔ تم عمر کے اُس موڑ پہ ہو آج جہاں
زندگانی کے خم و پیچ ہیں سب تم پہ عیاں
تم تو ایک ایک حقیقت کو سمجھ بیٹھے ہو
اپنی دنیا کے سبھی راز پرکھ بیٹھے ہو
لیکن اس راز کے ادراک کا حاصل آخر!
ایسے بے نام سفر کی کوئی منزل آخر!
(ناتراشیدہ پتھروں کی طرف دیکھ کر)
میں اس ادراک کا اک نقش حجر چاہتا ہوں
سنگ پیکر میں رواں، خونِ جگر چاہتا ہوں

عکس: میری نظروں میں ابھی تک ہیں وہ لمحے آذر
جن کے فریادیؑ خاموش ہیں یہ نقشِ حجر
کتنے رنگین مہ و سال نے جاں دی ہے یہاں!
کتنی نو خیز تمناؤں کا مقتل ہے یہ گھر!

آذر: (الجھ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے)
تم تو تصویر کا بس ایک ہی رخ دیکھتے ہو
یہ نہیں دیکھتے۔۔۔ کیا شئے ہے گراں۔۔ کیا ارزاں؟
زندگانی ہے بہت کچھ۔۔۔ پہ سبھی کچھ تو نہیں
اور بھی کچھ ہے پس پردۂ دیوار جہاں
کتنی دنیائیں کہ ہیں ضربتِ تیشہ میں نہاں
کتنے پیکر کہ ہیں پتھر کے جسد میں رقصاں
کتنے اسرار، پس حد نظر ہیں عریاں؟

عکس: ٹھیک کہتے ہو مگر
ایسی تحقیق میں مضمر ہے بہت جاں کا زیاں

آذر: (بے نیازانہ) تم کو معلوم نہیں عشرتِ تخلیق ہے کیا؟
راحتِ درد ہے کیا؟ لذتِ تحقیق ہے کیا؟
(گلاس اٹھا کر شراب کا ایک گھونٹ پیتا ہے)
ایسے منصب کے عوض جاں کا زیاں کیا معنی!

عکس: لیکن آذر۔۔۔
تمہیں کس طرح سے سمجھاؤں کہ میں۔۔۔
میرا مطلب ہے کہ تم۔۔۔
تم شب و روز جو یہ زہر پیا کرتے ہو
تم بڑے پیار سے چپ چاپ جو اپنے خوں میں
قطرہ قطرہ اسے تحلیل کیا کرتے ہو۔۔۔
آخر اس قتلِ عمد سے حاصل
تم نے اس طرح سے پایا کیا ہے؟

آذر : تم نے سمجھا ہے مجھے اور نہ سمجھو گے کبھی
میرے دل میں کبھی جھانکا ہے نہ جھانکو گے کبھی
تم کو معلوم نہیں
میں نے اس قتل میں کیا کھویا ہے ، کیا پایا ہے
میرا یہ شغل مری زیست کا سرمایہ ہے
(خلا میں کسی موہوم نقطے پر نظر جماتے ہوئے)
موت اور زیست ہے کس کے بس میں
لوگ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں
لیکن اک کرب۔۔۔۔
وہ اک کشمکشِ موت وحیات۔۔۔
(عکس کی طرف دیکھتے ہوئے)
اور وہ سکرات کا عالم۔۔جس کو
حاصل عمر گریزاں کہیئے۔۔۔
(پھر ایک چسکی لے کر گلاس رکھ دیتا ہے)
دوست۔۔۔میں چاہتا ہوں۔۔۔
دل کے اُس کرب کا اک نقش ابھاروں اک روز
زیست کو۔۔۔موت کو
پتھر میں اتاروں اک روز
میرے فن۔۔۔اور۔۔مری روح کا محور ہے یہی
میری دنیا ہے یہی میرا مقدر ہے یہی

(ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)

جانے کس روز مرے خواب کی تعبیر ملے

عکس: تم نے جو خواب بُنے، خواب نہیں ۔۔۔۔ دام ہیں وہ

ساغر بادہ نہیں ۔۔۔۔ زہر بھرے جام ہیں وہ

آذر: (تنگ آ کر بیٹھتے ہوئے)

اب میں کس طرح سے سمجھاؤں تمہیں

زہر میں بھی ہے نہاں بادۂ کہنہ کا سُرور

زہر ہے آبِ حیات

عکس: تم عجب طرح سے ہر شے پہ نظر کرتے ہو

زندگانی کی جگہ موت بسر کرتے ہو

(آذر بے تابی کے عالم میں اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے)

آذر: تم نہیں سمجھو گے تم جاؤ

مجھے اور پریشاں نہ کرو

مجھ کو اس موت کی وادی میں فنا رہنے دو

یار جاؤ مجھے دنیا سے سوا رہنے دو

(تیشہ اٹھا کر آئینے کو چکنا چور کر دیتا ہے)

محمد اویس جعفری (امریکہ)

نور و نکہت کا سفر

فضا میں پھیل گئی اس کی بات کی خوشبو
ابھی تو اس نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں
یہ اس کی بات کی خوشبو
غزالِ شعر کی زلفِ شکن اندر شکن بھی ہے
یہ غازہ اس کے رُخ کا، اس کے چہرہ کی پھبن بھی ہے
یہ اس کی جھیل سی آنکھوں کا کاجل بھی حیا بھی ہے
یہی ان صندلیں ہاتھوں پہ تحریرِ حنا بھی ہے
یہی ہونٹوں کی لالی بھی
یہ گہنا استعاروں کا، یہی تشبیہ کا زیور
یہی انگشتری بھی، آرسی بھی، اس کی بالی بھی
یہی تخئیل کی آہٹ، یہی الہام کی دستک
یہی خوشبو
سخن بھی، روحِ فن بھی، اور قلم کا بانکپن بھی ہے
یہ اک دانشگہِ تہذیب کی تصنیف کردہ شخصیت بھی ہے
یہی خوش قامتی بھی، خوش قبائی اور اس کی خوش کلامی بھی
یہ خوشبو کیف و مستی کی فضا میں نور و نکہت کا سفر بھی ہے
چلیں! ہم اس سفر پر اور اک نکہت بداماں
خوشبو آسا شخصیت کے ساتھ چلتے ہیں

امین راحت چغتائی

خزاؤں کے جیسے دیباچے

وصالِ ہجر کے لمحے بھی آگئے آخر
چلو حجابِ حقیقت سرکنے والا ہے
ہر ایک شے کی صداقت اُبھرنے والی ہے
محبتوں میں جو مضمر تھیں نفرتیں کیا کیا
ابھی وہ صورتِ آئینہ سامنے ہوں گی
کہ آئینوں کی شہادت بڑی شہادت ہے!

وہ دن بھی تھے کہ صدائیں سکون پرور تھیں
شبیں اُترتی تھیں افلاک سے سحر صورت
جدھر نگاہ اُٹھائیں، قرارِ جاں پائیں
قدم قدم پہ ہجومِ نظر نواز کی خیر
مگر یہ دل کہ ابھی تک نہ اس کے چاک سِلے

کبھی فلک کو، کبھی فرشِ خاک کو دیکھیں
یہ رنگ و نور کے چشمے کہاں سے پھوٹ بہے
پھر اِن میں کون ہے جو بار بار لہرائے
خیال لینے لگے جانے کروٹیں کیا کیا

کہیں وہی تو صداقت نہیں ہے رنگوں کی
کہیں اُسی کے تو جلوے نہیں ہی جلوت میں
کہیں اُسی سے نہ روشن ہوں خلوتیں اپنی
کہیں وہی نہ رگِ جاں سے ہو قریب اتنا
کہ سانس لیں تو اُسی نام کی صدا آئے

یہ ڈھلتی چھاؤں یہ ہر سمت پھیلتے سائے
یہ سبزہ زار، خزاؤں کے جیسے دیباچے
یہ زرد رنگ سے لکھی شجر کی تحریریں
ذرا سی فکر کریں تو سمجھ میں آ جائیں
ذرا سی چاپ بھی تحلیل ہو فضاؤں میں
تو پل جھپکنے میں تصویرِ راہ گیر کھنچے
نگہ جھکائیں تو سب فاصلے سمٹ آئیں

جسے بلائیں وہ کیوں بولتا نہیں آخر
یہ راز زحمتِ سفر ہے جو پا گئے تو کہو
وصالِ ہجر مقدر نہ ہو اگر راحت
تو کون تاروں بھری رات جاگ کر کاٹے!

سیّد مشکور حسین یاد

اگر میرے لہو سے

اگر میرے لہو سے
آگ کا دریا نہیں بہتا
اگر میرے لہو سے
خاک کا طوفاں نہیں اُٹھتا
اگر میرے لہو سے خواب کی چلمن نہیں اُٹھتی
اگر میرے لہو سے عقدۂ دوراں نہیں کھلتا
اگر میرے لہو سے
شعلوں کی بارش نہیں ہوتی۔۔۔۔
جو ظلم و جور کی سب بستیوں کو راکھ کر ڈالے
اگر میرے لہو کی بجلیاں گرتی نہیں ہیں ظالموں کے
سب ٹھکانوں پر
تو پھر میرے لہو کا راکھ ہو جانا ہی بہتر ہے
اور اُس کے ساتھ میرا خاک ہو جانا ہی بہتر ہے

کرامت بخاری

صحرا کی خاک

شامِ غم آ گئی تھی رستے میں
راستے راستوں میں الجھے تھے
فاصلے فاصلوں میں پھیلے تھے
کتنی صدیوں سے چل رہا تھا میں
زیست کے بے کنار صحرا میں
ایک مشکل سا موڑ آیا تھا
میں نے سمجھایا تھا اُسے لیکن
بات کو وہ سمجھ نہیں پایا۔
زندگی خود بھی ہو گئی زخمی
اور مجھ کو بھی کر دیا گھائل
اب ہے جیون جنوں پہ آمادہ
اب گریباں کو چاک ہونا ہے
دشتِ غربت ہے اور غربت میں
ہم کو صحرا کی خاک ہونا ہے

سیمیں برلاس (لندن)

محبت

محبت ایسا سچ ہے جو کبھی بولا نہیں جاتا
اِسے بس مان لیتے ہیں
وہ مفلس ہو یا دولت مند
یہ سب کو غنی کر دے
محل ہو یا کہ کٹیہ ہو
یہ ہر جا روشنی کر دے
یہ جس پتھر کو چھوئے گا
وہ پارس ہو کے رہتا ہے
یہ جس لمحہ میں جی لے گا
اُمر وہ لمحہ رہتا ہے
محبت ایسا سچ ہے جو کبھی جھٹلا نہیں سکتے
اِسے پہچان لیتے ہیں
اِسے بس مان لیتے ہیں

کرامت بخاری

محبت

محبت کرتے رہنے سے
محبت کم نہیں ہوتی
کہ اس جلتے دیے کی لو
کبھی مدھم نہیں ہوتی
خدا کا یہ خزانہ ختم ہونے میں نہیں آتا
کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو اگر اس سمت آ نکلے
تو اس میں وہ کہیں سے بھی کمی کوئی نہیں پاتا
محبت، مہر و الفت، دلنوازی اور دلداری
یہ موسم ہیں یہ موسم تو مرے جذبوں کے کھلی موسم کا حصہ ہیں
مری اپنی کہانی میں مرا اپنا ہی حصہ ہیں
مجھے تو جب کوئی نفرت کہیں پہ گھیر لیتی ہے
کوئی بے رحم ساعت میری جانب بڑھنے لگتی ہے
تو میں اہل محبت سے سہارا مانگ لیتا ہوں
محبت سے محبت کو دوبارہ مانگ لیتا ہوں

معظم سعید

اُمید

سوچتے سوچتے
ذہن شل ہو گیا
کروٹوں کی تھکن
پسلیاں چیر کر دل میں چبھنے لگی
دم بھی گھٹنے لگا
سانس رکنے لگی
پر مری زیست کے مسئلے جوں کے توں
مجھ پہ حاوی رہے
عقل و دانش پہ رکھے ہیں کوہ گراں
گفتگو رائیگاں، جستجو رائیگاں
خود فریبی کے احساس کی داستاں
بے ثمر ٹہنیوں کے شجر، سائباں
تشنہ لب جسم و جاں
مضمحل کارواں
اک سفر جس کی منزل نہ کوئی نشاں

شب کے پردے میں لپٹی ہوئی اک فغاں
رقص کرتا دھواں
شہر ماتم کناں
اتنے بے کیف منظر کی آغوش میں
پھر بھی آنکھیں مری
خواب بُنتی رہیں
روشنی کے لیے، زندگی کے لیے

سلمان غازی (ممبئی۔انڈیا)

نوحۂ اردو

دل حزیں کی سنیں ! ذکر غم کے ساتھ کریں
قریب آؤ کہ اردو زباں کی بات کریں

وہ اک زبان کہ جس سے سبھی کو پیار بھی ہے
جو خاص و عام میں مرہونِ اعتبار بھی ہے

اسی سے پھوٹ کے چشمہ چلا محبت کا
اسی سے رنگ زباں کو ملا محبت کا

نئی زبان تھی لہجہ نیا تھا رنگ نیا
اسی سے اہل زباں نے چنا تھا ڈھنگ نیا

اسی سے پایا جہاں نے سلیقۂ گفتار
اسی زباں نے دیا دہر کو نیا کردار

زبان کیا تھی سمندر تھا جس میں گرتے تھے
کئی زبانوں کے سوتے جہاں اترتے تھے

یہ سچ ہے حسن اداؤں تو ہر زبان میں ہے
ہو اشتیاق تو ناوک بھی ہر کمان میں ہے

ہر اک زبان سے معیار چن لیا اس نے
جو تارِ حسن سے کمخواب بن لیا اس نے

جواں ہوئی تو شباب اس کا اوج پر آیا
اُچھل اُچھل کے سفینہ بھی موج پر آیا

کسی حسیں کا بھلا رک سکا شباب ہے کب؟
کہ اس کا حسن عیاں زیر آفتاب تھا تب

گلوں کے رخ پہ تبسم بھی تھا نکھار بھی تھا
وہ گلستاں کہ جو آسودۂ بہار بھی تھا

وہ جس کی شاخ پہ شبنم نثار ہوتی تھی
وہ جس کی راہ بھی منزل شمار ہوتی تھی

وہ جس کے گیت پہ سبزہ بھی لہلہاتا تھا
وہ جس کی شان میں عالم بھی گیت گاتا تھا

کہ اِس زباں پہ فصاحت نثار ہوتی تھی
یہی کلام کی خوبی شمار ہوتی تھی

بلاغت اس کے لیے بے قرار رہتی تھی
روانی ایسی کہ اک جوئے شیر بہتی تھی

قلم چلا جو ادیبوں کا نثر پاروں میں
نکل کے آئے مفاہیم بھی قطاروں میں

غزل سے بزم کی رونق کوئی بڑھاتا تھا
تو کوئی نظم میں افکار کو سجاتا تھا

کبھی اسی سے ادب پر بہار آئی تھی
کسی نے شعر و سخن میں مراد پائی تھی

مگر رہی ہے یہ محروم قدر دانوں سے
ترس رہی ہے محبت کو یہ زمانوں سے

اگرچہ اہل زباں کو کچھ اس سے بیر نہیں
پر اس زبان کے دشمن بھی کوئی غیر نہیں

عجیب حال ہے دم پیار کا تو بھرتے ہیں
پڑے جو وقت تو پھر فرض سے مکرتے ہیں

کتاب ہو کہ رسالہ ، ہو یا کوئی اخبار
کتب فروش نظر آئے گا یہاں لاچار

بڑے ہیں عشق کے دعوے مگر یہ ذوق نہیں
کہ اک کتاب خریدے یہ اس کو شوق نہیں

کتاب بنتی ہے زینت کتاب خانوں کی
سرِ ورق پہ چڑھی گرد ہے زمانوں کی

اکیڈمی بھی کئی لوگ یوں چلاتے ہیں
جب اختیار ہو اردو کو بیچ کھاتے ہیں

مشاعروں کی تجارت بھی خوب ہوتی ہے
کہ جس نظام پہ اردو زبان روتی ہے

پھر اس کے چاہنے والوں نے غور فرمایا
اور اس کے بعد مسلسل یہ بغور فرمایا

کہا کسی نے کہ آساں اسے بنانا ہے
زباں پرانی ہے اور اب نیا زمانہ ہے

پئے عوام یہی بندوبست ہوتا ہے
کہ بس زبان کا معیار پست ہوتا ہے

کسی طرح سے بس اخبار بیچا جاتا ہے
صحافی وہ ہے جو معیار بیچ کھاتا ہے

رہا یہ حال تو کون اس زباں کو سمجھے گا
کلام میر کے حُسنِ بیاں کو سمجھے گا

سراج و درد کہاں پھر کلامِ داغ کہاں
طلب ہے مے کی مگر ہاتھ میں ایاغ کہاں

جو دوستی ہے تو پھر دوست کا صلہ کیا ہے
ہوں ایسے دوست تو اغیار کا گلہ کیا ہے

چمن ہی اپنی روایت کا پاسدار نہیں
کہ گل ہی نالۂ بلبل سے بے قرار نہیں

کہے وہ کس سے کہ اب جان پر بن آئی ہے
کہ بدنصیب نے اپنوں سے چوٹ کھائی ہے

چلو کہ آخری سانسوں کو گنتے جاؤ تم
جھکاؤ ، شرم سے نظروں کو پھر جھکاؤ تم

لٹا کے اپنا چمن دیکھتی تماشہ ہے
قریب آؤ یہ اردو زباں کا لاشہ ہے

یہ بے زبان ہے کچھ اس کو اختیار نہیں
عجیب عشق ہے عاشق کو اس سے پیار نہیں

صابر عظیم آبادی

رباعیات

کیسی یہ کہانی ہے فسانہ کیسا
گاتا ہے یہاں کون ترانہ کیسا
جو کام ہے وہ کام کیے جا پیہم
مت دیکھ کہ آیا ہے زمانہ کیسا

☆☆

آنکھوں کو نظارا نہیں اچھا لگتا
یہ دشت یہ صحرا نہیں اچھا لگتا
راحت میں ہر اک چیز بھلی لگتی ہے
غم ہو تو تماشا نہیں اچھا لگتا

☆☆

لگتی ہے مجھے کوہ و دمن کی خوشبو
جیسے ہو کوئی صحنِ چمن کی خوشبو
مسحور کیا کرتی ہے جسم و جاں کو
ایسی ہے ترے شیشہ بدن کی خوشبو

☆☆

یہ طرز عداوت نہیں اچھی لگتی
یہ چھل یہ شرارت نہیں اچھی لگتی
نفرت یہ بناوٹ یہ نمائش یہ انا
ازراہِ محبت نہیں اچھی لگتی

☆☆

اخلاص کی خوشبو کو اچھالا نہ گیا
جو بغض تھا سینے سے نکالا نہ گیا
روشن تو ہوئے شہر ہزاروں لیکن
اس دشتِ محبت کو اجالا نہ گیا

لگتے ہیں نظر میں بڑے پیارے بچے
ہوتے ہیں بڑھاپے کے سہارے بچے
بچوں ہی سے بڑھتی ہے جہاں کی رونق
ہیں پھول کی مانند ہمارے بچے

☆☆

وہ قتل وہ غارت کا سماں دیکھا ہے
وہ آگ وہ شعلہ وہ دھواں دیکھا ہے
گہوارہ اخوت کا جہاں تھا پہلے
گھر جلتے ہوئے میں نے وہاں دیکھا ہے

☆☆

ہو بزم سے باہر کہ ہو اندر لوگو
ہوتا ہے یہی ذکر برابر لوگو
کردار ہی سے حسن پہ آتا ہے نکھار
کردار ہی عورت کا ہے زیور لوگو

☆☆

جب جرم مری ذات سے منسوب ہوا
لوگوں کی نظر میں بڑا معیوب ہوا
جھوٹوں کو سنائی نہ گئی کوئی سزا
سچ بول کے میں شہر میں مصلوب ہوا

☆☆

یہ طنز یہ شکوہ یہ شکایت کیسی
انسان کو انسان سے نفرت کیسی
بے وجہ لیے پھرتے ہو شمشیر انا
کچھ بات نہیں ہے تو عداوت کیسی

نقد و نظر

کتاب : دشتِ شب (شعری مجموعہ)

مصنف : امین راحت چغتائی

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : گلریز پبلی کیشنز۔ راولپنڈی

قیمت : چار سو روپے

''دشتِ شب'' کے شاعر شعری مجموعوں کے علاوہ ایسی کتب کے بھی مصنف و مؤلف ہیں جو تنقید و تحقیق۔ فلسفہ و مذہب اور تاریخ و ثقافت کے وقیع و متنوع موضوعات پر گزشتہ ستائیس (۲۷) برسوں میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے تجر علمی اور کمال فن کے اعتراف میں اُن کی نعتیہ تصنیف ''محراب توحید'' پر سال ۲۰۰۷ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے اول انعام پیش کیا جا چکا ہے۔ راقم الحروف کو بھی ماضی میں چغتائی صاحب کی بعض منظوم و منثور تخلیقات کا انتقادی جائزہ لینے کے مواقع میسر آئے ہیں چنانچہ اُن کے کثیر الجہت فکری پس منظر کے ساتھ زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ نے اُن کی علمی و فنی شخصیت کو قدیم و جدید غزل کی موضوعاتی وسعتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ دیکھنے کا ایک اور موقع فراہم کر دیا ہے۔

طہارتِ فکر مصنف کے اوصافِ فن کا وہ بنیادی اور نمایاں عنصر ہے جو اُن کی تمام تخلیقات بالخصوص شعری مجموعوں میں روح بن کر سرایت کر گیا ہے جسے ان کے شائستہ لب و لہجہ نے مزید جلا بخشی ہے۔ زیر تبصرہ تصنیف تمام تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ شعرائے کرام

شعری مجموعوں کا آغاز تبرکاً حمدیہ اشعار سے کرتے ہیں لیکن جناب امین راحت نے ثابت کر دیا ہے کہ صنفِ غزل کا موضوعاتی تنوع اس قدر ہمہ گیر ہے کہ حمدیہ و نعتیہ مضامین بھی غزل کی پیکر تراشی میں جلال و جمال کے عناصرِ فاخرہ کا کردار ادا کر سکتے ہیں چنانچہ آغازِ کلام ایسے کسی روایتی اہتمام سے مشروط نہیں۔ بایں ہمہ 'دشتِ شب' کی پہلی ہی غزل کا مطلع اور چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جو دشتِ شب سے گزرنے کا حوصلہ دے گا   چراغ راہگزر بھی وہی جلا دے گا

وہ دے کے ذوقِ سفر رہروانِ منزل کو   قدم قدم پہ نئے گلستاں کھلا دے گا

وہ جس کے نام سے کرتا ہوں میں سفر آغاز   وہی سفینہ مرا پار بھی لگا دے گا

میں کیوں کسی کے درِ ناز پر جھکوں راحت   مجھے تو چاہیئے جو بھی مرا خدا دے گا

رمزیت و اشاریت نہ صرف غزل کو معنوی وسعت عطا کرتے ہیں بلکہ حُسن ہیئت و اسلوب میں شاعر کو ان اوصاف کے فنکارانہ استعمال پر کامل قدرت حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ حمدیہ و دعائیہ اُسلوب برقرار رکھتے ہوئے غزل میں تعمقِ فکر سے کام لینے اور فلسفیانہ اندازِ نگارش کا وہ ہنر بھی جس میں شعری تازگی و لطافت بھی قائم رہے ہمارے متدین فکر شاعر کو خوب آتا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

جو سیرِ گُل کو نکلتے ہیں صبحدم ان کو   زمینِ گُل سے بھی تھوڑی سی آشنائی دے

'دشت شب' کے مطالعہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس مجموعۂ شعری میں شعورِ ذات ایک واضح متحرک عنصر ہے جو کائنات اور خالقِ کائنات کی نسبت بین السطور فکری متوازیت کا ترجمان بھی ہے۔ لیکن یہ حقیقت کہیں بھی شعر کی تاثراتی لطافت کو مجروح نہیں ہونے دیتی جس کا مدلّل ثبوت درج ذیل اشعار سے ملتا ہے۔

ہواگر یقیں کہ ملا کرے گا بس ایک نانِ جویں سہی
مجھے کاخ دار اسے کیا غرض مجھے بیٹھنے کو زمیں سہی
میں ثبوت جس کے ہنر کا ہوں وہ عیاں رہے یا نہاں رہے
مرا کام اُس کی تلاش ہے نہ ملے کہیں تو نہیں سہی
کہیں غیب سے بھی نوید ہو کہ ظہورِ نور قریب ہے
میں ہوں ظلمتوں میں گھرا ہوا مجھے روشنی کا یقیں سہی

وہ الفاظ جن میں معنویت کے بیکراں سمندر موجزن ہوں وہ جناب چغتائی کی قاموس فکر سے ماورا ہیں اور نہ فرہنگ وجدان سے۔ وہ دقیق و عمیق فلسفیانہ مضامین کو کوزۂ لفظ میں بند کر دینے پر قادر ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال اُن کے فلسفۂ شعور ذات سے حاضر خدمت ہے اس گزارش کے ساتھ کہ درج ذیل شعر میں ''سربُریدہ لفظ و معنی'' اور ''بے صدا حرفِ دعا'' کی تراکیب لفظی شاعر کے ہم عصر عالمِ انسانیت سے شکوہ سنجی پر گہرے تدبّر و تفکر کی دعوت دیتی ہیں:

سربُریدہ لفظ و معنی، بے صدا حرفِ دعا   آدمی سے منہ چھپاتی پھر رہی ہے آگہی

اس سیاق و سباق میں شاعر کے ''ذوق خود احتسابی'' کا عالم بھی دیکھیے جس کی ترجمانی کے لیے ''سیرِ گریباں'' کی غزل افروز ترکیب لفظی کو استعمال کیا گیا ہے اور ''زمین بے طرب'' کو ''عرش ساماں'' کرنے کی آرزو بھی جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے

زمین بے طرب کو عرش ساماں کر رہا ہوں میں   ذرا ٹھہرو ابھی سیر گریباں کر رہا ہوں میں

اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ حکیم الامتؒ کے اتباع میں شاعر ''دشتِ شب'' بھی اپنی ''تاب سخن'' کو بھرپور عصری معنویت کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے گویا کہہ رہے ہیں کہ:

"شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو" لیکن اپنے مخصوص لب ولہجہ میں:

بیوفا ہم تو وفادار ہے کون آنکھ اُٹھا ، دیکھ سردار ہے کون

اور پھر اپنے خالق کے سامنے سپر انداز ہو جاتے ہیں

لوٹا رہے ہیں تیری امانت سمجھ کے ہم اب بارِ زندگی بھی اُٹھایا نہ جائے گا
راحت ہر ایک راز اگلنے کو ہے زمیں اب رازِ کائنات چُھپایا نہ جائے گا

چغتائی صاحب کی غزل میں جہاں فلسفہ وحکمت حریرو پرنیاں میں ملبوس ہو کر شاعر کی لطافت فکر کا عنوان بن گئے ہیں وہیں قدیم وجدید روایاتِ غزل کا جمال آفریں امتزاج بھی اُن کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ لفظیات تراشی کی قلمرو کے حکمران ہیں جو اُن کی السنۂ شرقیہ پر عبور کی رہین منت ہے آیئے ایسے اشعار کی بھی نظر افروز جھلک دیکھتے ہیں:

دن کے ڈھلتے یہ اہتمام ہوئے میرے آنسو چراغ شام ہوئے

بدلتی رُت کا بھی چپکے سے اک اشارہ کیا وہ جس نے شعر میں زنداں کو استعارہ کیا
ہمیں خبر تھی اندھیرا ابھی رہگزر میں ہے سرشکِ غم کو یہی جان کر ستارہ کہا

"دشت شب" میں اگر کہیں یاسیت کا شائبہ دکھائی بھی دیتا ہے تو وہ شاعری کی پُر اعتماد اور ایمان پرور رجائیت کی ضیا بار فضا میں ظلمت کی پرچھائیوں کی طرح تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

حجابِ ظلمتِ شب اُٹھ رہا ہے نظر آنے کو ہے صورت سحر کی

کلاسیکی اور جدید فکر جب شانہ بہ شانہ ہو کر شعری پیکر تراشتی ہے تو چغتائی صاحب کی شاعری میں ایک احتجاجی رو آتی ہے مگر تہذیب وشائستگی کے ساتھ۔ وہ موثر انداز میں گردوپیش

کے ماحول پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اور استقامتِ کردار کی بات بھی کرتے ہیں۔ مگر اکثر ہم عصروں کے غرور و تکبر کے جارحانہ انداز میں نہیں بلکہ عجز و انکسار کے لطیف و دلکش پیرایۂ اظہار میں:

میں اک تصویرِ عہدِ بے اماں ہوں — میں اپنے گھر میں ہوں لیکن کہاں ہوں
تری خلقت پہ جو بیتی ہے مولا — میں اُس کی چیخ ہوں اُس کی فغاں ہوں

اسی تسلسل میں فکری تنوعات کے تیور بھی ملاحظہ فرمایئے:

بیٹھے ہیں زیرِ آسماں تن پہ کوئی ردا نہیں — کیسے بتائیں کیا ہیں ہم کیسے بتائیں کیا نہیں
ایک گدائے بے نوا جانے کہاں سے آ گیا — لب پہ کوئی طلب نہیں کوچے سے بھی گیا نہیں
روٹھے ہوئے حروف اِدھر لفظ گریز پا اُدھر — اب کے عجب سزا ملی یاد کوئی دعا نہیں
راحت اُسی کے بیکراں لطف و کرم کا معجزہ — اُس کا دیا ہوا یہ سر اور کہیں جھکا نہیں

چغتائی صاحب کی کثیر الجہت شاعری میں سب سے زیادہ عصری معنویت اپنی گہری چھاپ رکھتی ہے جس کے سبب اُن کا کلام عہدِ حاضر کے اردو شعری ادب میں ایک متاعِ گراں مایہ بن گیا ہے، اُن کے شعر میں حُبِ وطن کی تڑپ نمایاں ہے۔ انسانی دردمندی اور خدا ترسی جو اُن کے کردار کی اساس ہیں لعل و جواہر کی طرح اُن کی غزل کی تابناکی میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اے وطن اپنا تو بس اتنا ہے معیارِ وفا — دوستی تیرے لیے ہے دشمنی تیرے لیے
آ بھی جا اب اے سحر اے تیرہ بختوں کی نوید — منتظر ہے کب سے آنکھوں کی نمی تیرے لیے

ہجوم یوں تو بہت تھا مگر ہمیں آئے — ہوا کے سامنے اپنا دیا جلانے کو
کسی طرف سے تو اب خیر کی خبر آئے — زمانہ کب سے ترستا ہے مسکرانے کو

ظلمتِ شب کی طوالت بھی رہے پیشِ نظر — اب چراغوں میں بھی اتنی روشنی باقی نہیں
بستیوں میں جا کے دیکھو تو سہی راحت کبھی — لوگ تو زندہ ہیں ان میں زندگی باقی نہیں

کتاب : آئینۂ امروز و فردا (شعری مجموعہ)

مصنف : فضا اعظمی

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : اکادمی بازیافت۔ اردو بازار کراچی

قیمت : چار سو روپے

زیرِ نظر شعری مجموعہ نصف درجن مشاہیر ادب کے کلماتِ تحسین سے مزیّن ہے جن کے اسمائے گرامی اور ارشادات کی تلخیص ذیل میں درج ہے۔

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتحپوری

"فضا اعظمی طبعاً نظم کے نہیں غزل کے شاعر ہیں"

۲۔ پروفیسر سحر انصاری

"فضا اعظمی کسی ایک رخ یا نظریے کے شاعر نہیں ہیں۔ رومان سماجی حقائق۔ سیاست اور مقامی و عالمی تہذیب کے مختلف زاویے ان کے دائرہ فکر کا حصہ ہیں۔"

۳ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

"وہ ایک سنگم پر کھڑے ہیں ایک جاتی ہوئی تہذیب کا ایک بجھتے ہوئے چراغوں کا"

۴۔ سید مظہر جمیل۔

"فضا اعظمی اپنے رنگِ سخن، طرز ادا اور فکری مزاج کی وجہ سے عصری شعری منظر نامے میں اپنی ایک جدا شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری عصر حاضر کے تہذیبی و انسانی مسائل سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔"

۵۔ عطاء الحق قاسمی

”میں فضا اعظمی کی شاعری کا بڑا قائل ہوں خاص طور سے اُن کی یک موضوعی طویل نظموں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظموں میں مجھے ایک دردمند پاکستانی اور زندہ ضمیر انسان کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔“

۶۔ مبین مرزا (تقریظ نگار)

”ان کی شاعری اپنے موضوع اور فکر دونوں ہی اعتبار سے مقصدی شاعری کے ذیل میں آتی ہے۔۔۔ یعنی غزل اور نظم دونوں اصناف مین ان کا تخلیقی جوہر الگ الگ رخ سے ظہور کرتا ہے“

بیشک فضا اعظمی صاحب غزل اور نظم دونوں ہی کے شاعر ہیں چنانچہ اُن کے فکر و فن کی ان تمام جہتوں کی جن کی اوپر نشاں دہی کی گئی ہے ”آئینۂ امروز و فردا“ کے مطالعہ سے تصدیق ہوتی ہے میرے نزدیک اُن کا یک اعزاز یہ بھی ہے کہ انھیں دنیائے شعر کے نابغۂ اعظم مرزا بیدل کا ہم وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُن کی نظم و غزل کی شاعری کے مطالعہ کے دوران ایسے مقامات بھی آئے جہاں شعر کو مکرّر پڑھے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً زیرِ نظر مجموعہ کا پہلا شعر:

جی چاہتا ہے کوئی نیا خواب دیکھیے　　صحرائے بے گیاہ میں سُرخاب دیکھیے

آپ کا اعتنا الارم الارم　　آپ کی بے رخی الحذر الحذر

یہ تاثر کہ فضا بیک وقت غزل کے شاعر بھی ہیں اور نظم کے بھی۔ درج ذیل اشعار اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں نظم سے تعبیر کریں یا غزل مسلسل ٹھہرائیں ان پر دونوں کا اطلاق ہوتا ہے یعنی ”فضا صاحب کا اندازِ رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی“ ملاحظہ ہو

تم ہو بہاروں کی شہزادی تم پہ نچھاور پھول کی وادی
ذات میں خود جو اوجِ فلک ہو اُس کو ثریا سے کیا لینا
تم ہو شبنم تم ہو قلزم تم ہو بادل تم ہو ساگر
تم ساون کا پہلا قطرہ تم کو دریا سے کیا لینا
سرمستی کا سرچشمہ ہو ، خود پیمانہ خود میخانہ
تم کو ساقی سے کیا مطلب تم کو صہبا سے کیا لینا
آج بھی تم ہو کل بھی تم تھیں تم ہو کتاب عشق کا مضموں
روحِ غزل ہو جانِ فضا ہو تم کو دنیا سے کیا لینا

آیئے اب نظم و غزل کے مزاج و آہنگ کے امتزاج کا جمال بھی دیکھتے ہیں اور جلال بھی:

اک نوکِ قلم اک خونِ جگر تحریر کے دو رُخ ہوتے ہیں
اک ظلمت شب اک نور سحر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں
مشترکہ تمدن کی جنت ، تہذیبی تصادم کا دو رُخ
خوں ریز زمین گلمرگ فضا کشمیر کے دو رُخ ہوتے ہیں

خوبصورت غزل کہنے کا سلیقہ دیکھنا ہو تو یہ اشعار دیکھیے جو کلاسیکی روایت کے غماز بھی ہیں اور تخلیقی روح عصر کے بھی۔

مری صبح شوق گزر گئی کسی شعلہ رُو کی جناب میں
مری شام درد بسر ہوئی کسی آرزو کے سراب میں
مجھے سیرِ گل سے ملے گا کیا نہ دماغ ہے نہ مزاج ہے
میں اسیر گردشِ وقت ہوں مری زندگی ہے عذاب میں
تجھے جس پہ ناز ہے اے فضا تجھے جس پہ اتنا غرور ہے
تو تمام درد بھی ڈال دے اُسی آگہی کے حساب میں

آپ دوسرا شعر مکرر پڑھیے تو آپ کو مجھ سے متفق ہونا پڑے گا کہ فضا کے یہاں کلاسکی روایت اور تخلیق روح عصر شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں جس کا ثبوت غالب کے درج ذیل شعر سے مل جائے گا۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

عصری شعور فضا کی شاعری کی توانا ترین خصوصیت ہے جس کا اظہار مختلف اسالیب اور دلپذیر لہجوں میں ملتا ہے وہ چاہے نظم ہو کہ غزل البتہ موضوعی نظم زیادہ پُر اثر ذریعۂ اظہار ہے۔ غزل کے چند اشعار

یہ طرزِ تکلم تری عادت تو نہیں تھی　　اس میں کہیں غیروں کی شرارت تو نہیں تھی
منصف کو نتائج سے خبردار کیا تھا　　اس میں کہیں توہین عدالت تو نہیں تھی
قدموں سے الجھتے ہیں گھروں کے در و دیوار　　صحرا میں کوئی ایسی قباحت تو نہیں تھی

اپنی قیمت آپ پر خود ہی عیاں ہو جائیگی　　آپ یوں ہی گھومتے رہیے خریداروں کے بیچ
رقص کرتا ہے کہیں ساز ازل کی تان پر　　عشق سادہ پھول بن جاتا ہے انگاروں کے بیچ

حسرتِ وصل کجا ذوق تماشا بھی نہیں　　دین تو دین ہے اب خواہش دنیا بھی نہیں
روحِ احساسِ گریزاں کی خبر ہے کس کو　　زلفِ ماضی بھی نہیں عارضِ فردا بھی نہیں

جناب عطاء الحق قاسمی جو پاکستان کے معروف صحافت کار اور مقبول کالم نگار ہیں انھوں نے ''آئینہ امروز و فردا'' کے شاعر کو ''دلی مبارکباد'' پیش کی ہے مگر نہ معلوم مجھے یہ گمان کیوں ہے کہ فضا صاحب کے درجہ ذیل اشعار اُن کی نظر سے نہیں گزرے۔

اصل کچھ ہے واہمہ کچھ اور ہے　　ہے خبر کچھ واقعہ کچھ اور ہے

یا الٰہی نامہ بر کو کیا ہوا　　پڑھ رہا ہے کچھ لکھا کچھ اور ہے
وائے مجبوری صحافت کار کی　　لکھ رہا ہے کچھ سنا کچھ اور ہے

زیر تبصرہ شعری مجموعہ میں ۲۳ غزلیں ۴۳ نظمیں۔ ۶ قطعات اور ۲۱ متفرق اشعار شامل ہیں غزلوں پر اس طائرانہ پرواز خیال کے بعد کچھ نظموں پر توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ نظم بعنوان ''یہ واقعہ کچھ نیا نہیں ہے'' شاعر کے تاریخی شعور کا شاہکار ہے۔ عراق پر امریکہ کے حملہ سے متاثر ہو کر کہی گئی یہ نظم تو تصنیف ادب میں ارفع مقام رکھتی ہے۔ بیشتر نظمیں اپنے اُسلوب و آہنگ کے اعتبار سے قاری کا دل موہ لیتی ہیں۔ اعظم گڑھ میں اپنی آبائی قیام گاہ سے شاعر کے بے دخلی کے کرب کا اندازہ ''یاد ماضی'' کے عنوان سے درج ذیل قطعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

ٹوٹا ہوا دل، زخم جگر بیچ رہے ہیں　　ورثے میں جو پایا تھا وہ گھر بیچ رہے ہیں
تم آ کے ذرا آخری دیدار تو کر لو　　ہم شیش محل، چاند نگر بیچ رہے ہیں

میں عادتاً اظہار خیال سے پہلے کسی بھی تصنیف یا تالیف کا مجملاً نہیں بلکہ اکملاً مطالعہ ضروری سمجھتا ہوں چنانچہ اس عمل سے گزرنے کے بعد محاسن کلام کے ساتھ مصائب سخن یا کچھ واضح تسامحات بھی نظر سے گزرے جن کا ذکر نہ کرنا انتقادی معروضیت یا دانشورانہ دیانت کے منافی ہوگا۔ میں نے زیر تبصرہ شعری مجموعہ کے مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ صرف و نحو سے عدم آگہی یا ردیف و قوافی کے فنی تقاضوں سے بے خبری اور اوزان شعری میں خلل ڈالنے والے عوامل سے بے توجہی برتنا فضا اعظمی جیسے شاعر کی نسبت میرے تصور سے بھی ماورا تھا مگر افسوس کہ یہ سب کچھ دیکھنا پڑا۔ البتہ ان کی طرف توجہ دلانے میں اخلاصِ نیت صرف یہ چاہتا ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت مزید سے قبل شاعر نظر ثانی فرمالیں جو نہایت ضروری ہے۔ مثلاً

۱۔ مجموعہ کی پہلی ہی غزل جس کی ردیف 'دیکھیے' اور قوافی ''خواب اور سُرخاب'' وغیرہ ہیں اُس کے تیسرے شعر کا مصرعہ اوّل ہے ''تصویرِ شب میں صورتِ خورشید دیکھیے'' اگر یہ غزل کا تیسرا مطلع ہے تو قافیہ غلط ہے۔ اگر نہیں تو مصرعہ اول میں بغیر قافیہ ردیف کا استعمال غلط ہے بلکہ اساتذہ تو جز وردیف کے استعمال کو بھی معیوب سمجھتے رہے ہیں۔

۲۔ صفحہ نمبر ۴۴ پر تیسرے شعر کا مصرعہ ثانی ہے ''تو پھر کیوں 'قضیہ' من اور تُو' ہے قضیہ من اور تو'' فارسی ترکیب ہے جس میں غیر فارسی حرف عطف ''اور'' کا استعمال غلط ہے۔

۳۔ صفحہ ۵۶ پر غزل کے تیسرے شعر میں وہی فنی نقص ہے جس کی طرف نمبر ا میں اشارہ کیا گیا ہے انیس (۱۹) اشعار پر مشتمل اس غزل کے پانچ شعروں میں بھی نقص موجود ہے۔

۴۔ صفحہ ۶۶ پر ''صبح سے پہلے شام کے بعد'' ردیف والی غزل میں قوافی کا اہتمام سرے سے نظر ہی نہیں آتا۔

۵۔ صفحہ ۶۸ پر غزل کے مطلع ہی میں قوافی کا سقم ہے یعنی 'قطرے اور الجھاں' اور آخری شعر کا تو قافیہ بھی مختلف ہے اور ردیف بھی۔

۶۔ صفحہ ۸۴ پر نظم 'دل یہ کہتا ہے' کا پانچواں شعر ہے 'دل یہ کہتا ہے کہ اے کاش میں دریا ہوتا۔ پاپ کو دھونے کا اور پاکی کا 'ذریعہ' ہوتا۔ مصرعہ ثانی میں قافیہ 'ذریعہ' نہیں بلکہ 'ذریا' پڑھا جاتا ہے۔ یہ سنگین نقص ہے اسی غزل کے ۱۵ویں شعر کا قافیہ ''گارا'' شاعر کے معیارِ فن میں لسانی غرابت کا مظہر ہے جب کہ آخری شعر میں ''بنایا' اور 'انسان' کو ہم قافیہ گردانا گیا ہے۔

۷۔ صفحہ نمبر ۹۱ پر نظم بعنوان 'پندار برتری' میں جو الفاظ برحق/ صادق 'میرا ادب/ زانوئے ادب۔قوم/رسُوم کو ہم قافیہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو فنی بے خبری کا مظہر ہے۔

۹۔ صفحہ نمبر ۹۷ پر دوسرے شعر کا مصرعہ اول ''حرفت و سائنس کی معراج ہے مغرب کا مقام'' خارج از بحر ہے۔

۱۰۔ صفحہ نمبر ۹۹ بعنوان ''شاعری'' میں پرواز خیال/ معراج خیال کو ہم قافیہ نظم کیا گیا ہے۔ جو غلط ہے

۱۱۔ صفحہ ۱۴۲ پر نظم ''سرشار غزل'' تیسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں ''صرف نظر'' کا استعمال غلط ہے۔

۱۲۔ ''متفرقات'' کے زیرِ عنوان، شعر'' اس کا گیتا سے تعلق ہے نہ انجیل سے ہے۔ 'معاملہ' اس کا فقط حضرتِ قابیل سے ہے'' مصرعہ ثانی میں لفظ 'معاملہ' 'ماملہ' پڑھا جاتا ہے جو شاعر کے شایانِ شان نہیں۔

کتاب : فکر فیض

مرتب : ڈاکٹر نثار ترابی

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : ملٹی میڈیا افیئرز۔ لاہور

قیمت : ۵۵۰ روپے

ڈاکٹر نثار ترابی تحسین و تہنیت کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دنیا بھر میں 'فیض صدی' کی تقریباتِ جشن کے موقع پر اہل علم و ادب مبصرین و نقاد حضرات اور مورخین و مداحین فیض کو'' فکر

فیض" کے عنوان سے ایک ایسا جمیل و جلیل ارمغان پیش کیا ہے کہ جو نہ صرف فیض مرحوم سے ان کی عقیدت و ارادت کا مظہر ہے بلکہ ایک ایسا منفرد و نادر صحیفہ بھی ہے جو اپنے دامن میں مشاہیر ادب کی ایک بڑی تعداد کے معتبر و مستند تجزیاتی و تنقیدی مضامین اور نظریاتی و ارادت مندانہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک بڑا اور اہم کام تھا جو انھوں نے انجام دیا وہ فیض مرحوم کے ایک شعر سے ماخوذ خود نگاشتہ تقریظ بعنوان "ذکرِ یار چلے" میں رقمطراز ہیں۔

(الف) "عالمی سطح پر فیض (۱۹۸۴ء تا ۱۹۱۱ء) کے حوالے سے دنیا بھر میں صدی تقریبات کا انعقاد اور اشاعتی کتب کے وسیلے سے فیض صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور اُنھیں یاد کرنے کے سلسلے میں تاریخ ادب میں یقیناً یادگار رہیں گے۔"

(ب) "۔۔۔۔اقبال کے بعد فیض ہی دورِ جدید کے دوسرے بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظم اور غزل کو ایک نیا اُسلوب اور ڈھنگ دیا۔ غزل کے لیے نئی روایت قائم کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو بیسویں صدی کے نصف آخر تک انسانوں کے جذبوں کا ترجمان بنایا اور تیسری دنیا کے پس ماندہ لوگوں کے احساسات اور دکھوں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔"

(ج) "حب الوطنی کے گیت گائے ہیں اور غزل کے کلاسیکی لب و لہجہ کو نئی آب و تاب بخشی ہے۔"

فاضل مرتب و مدون نے جن مشاہیر ادب کی نگارشات سے کتاب کو تاریخی اہمیت دی ہے اُن میں جناب افتخار عارف کو فیض مرحوم سے قرابت اور ایک طویل رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے لہٰذا آیئے دیکھتے ہیں کہ افتخار عارف صاحب کے مشاہدات و تجربات کیا ہیں:

"فیض عالم انسانیت کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری دوامی، آفاقی، انسانی قدروں کی ترجمان تھی مگر ظاہر ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار مقامی ہوئے بغیر آفاقی نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی

زمین سے اور اپنے لوگوں سے جُڑے ہوئے تھے۔"

افتخار عارف صاحب نے، منجملہ دیگر، فیض صاحب کی اُس تقریر سے بھی اقتباس پیش کیا ہے جو فیض مرحوم نے ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن انعام کی پرشکوہ تقریب کے موقع پر اردو زبان میں کی۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بناو ہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظؔ نے کی تھی:

"خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی   مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

"فکر فیض" میں جو دیگر اہل قلم کی تحریریں شامل ہیں اُن سے مزید دو ایک اقتباسات ضروری ہیں تاکہ فاضل مرتب کے پُر معنی انتخاب کی تفہیم ہو سکے۔ معروف شاعر اور نقاد جناب سحر انصاری فرماتے ہیں:

"نقش فریادی" کی ترکیب اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ فیض کو غالب سے کس قدر گہرا ربط ہے۔ غالب کے دیوان کے پہلے شعر کے پہلے دو لفظوں کو گویا فیض نے اپنے عہد کے انسان کی سماجی اور داخلی کشمکش اور جبر کا استعارہ بنا دیا ہے۔"

مسلم شمیم صاحب ترقی پسند تحریک کے معتبر محقق و مورخ ہیں ان کی رائے سے ایک حوالہ:

"فیض احمد فیض ترقی پسند فکر اور ترقی پسند ادبی جمالیات کے سب سے بڑے ترجمان اور ترقی پسند نظریات و روایات کے آغاز سفر سے تادم حیات معتبر ترین حوالہ رہے"

درج بالا مشاہیر کی آراء اور دیگر پُر مغز مقالات و مضامین کی تدوین و ترتیب کہ اعلیٰ ادبی خدمت ہے جس پر میں ترابی صاحب کو مکرّر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور سہ ماہی 'الاقرباء' کے شمارہ جنوری۔ مارچ ۲۰۱۰ء کے اداریہ بعنوان "فیض میزان عصر میں" کے حوالے یہ اعادہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں فیض مرحوم کے فکر و فن پر جن نابغۂ روزگار شخصیات کے اثرات مرتب

ہوئے ہیں ان میں حافظ و غالب کے علاوہ حضرت علامہ اقبال نمایاں ترین ہیں بلکہ اہل نقد و نظر نے انھیں بجا طور پر غالب و اقبال کی شعری روایت کا تسلسل ہی نہیں امین بھی قرار دیا ہے۔ ان کی مشہور نظم ''ہم بھی دیکھیں گے'' اُن کی بلاغت فکر کا شاہکار ہے۔ قرآن حکیم کی ''سورۃ القاعدہ'' کی حکیمانہ شعری تفسیر فیض کی دینی بصیرت کی بھی غماز ہے ان کی زندگی میں کہیں بھی اخلاقی اقدار اور دینی صداقتوں سے انحراف کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ بے شک فیض مارکسی فلسفے سے متاثر تھے لیکن کارل مارکس کو تو علامہ اقبال نے بھی یہ کہہ کر زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے کہ ''نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب'' اور اس طرح جہاں اسلامی نظام حیات سے غیر متصادم معاشی و معاشرتی فلسفوں اور نظریات کی افادیت کو تسلیم کیا ہے وہیں پیغمبرانہ بعثت کی استنادی حیثیت کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر دیا ہے۔

کتاب : ہالے اور حوالے

مصنف : فاروق ارشد شاہین

مبصرہ : نعیم فاطمہ علوی

ناشر : حسنِ قلم پبلی کیشنز لاہور

فاروق ارشد شاہین نے جواب اس دنیا میں نہیں رہے کتاب کا انتساب اپنے لڑکپن کی حسین یادوں کے نام کیا ہے جن کی کسک ان کے دل نے مرتے دم تک سنبھالی ہوئی تھی۔

تنہائی۔۔۔ہم سفر کی جدائی۔ ان دیکھی دنیا کی طرف بڑھتے ہوئے قدم گزرے ہوئے زمانے کی گہری یادیں۔ بیماری۔۔۔ یکسانیت۔۔۔ ذات کا کشف۔۔۔ اپنوں سے دوری۔۔۔ خواب اور خیال کی مضبوط گرفت اور کمرے کی چار دیواری۔۔۔

غم فراق کا موسم ہوا ہے بے قابو ہیں اشکبار یہ آنکھیں اداس رہتے ہیں

چلی ہوائے الم خیز و شعلہ جُو ارشد　　کلی کلی کے بدن بے لباس رہتے ہیں

فاروق ارشد شاہین کی پہلی اور آخری تخلیق "ھالے اور حوالے" میں ہر رنگ نمایاں ہے۔ اس میں غزلیں بھی ہیں۔ نظمیں بھی ہیں۔ پابند شاعری بھی۔ آزاد شاعری بھی۔۔ حمدیہ کلام بھی امید کے دیئے بھی یاس کے گہرے سائے بھی۔۔۔ ملکی حالات کی دردناک تصویر بھی۔۔ غریبوں کا درد بھی۔۔۔ امیروں کی بے حسی بھی۔۔ فاختہ کا قصہ بھی بلبل کی سرنوچ ڈالنے کی حاسدانہ روش بھی۔۔۔ زیادہ تر نظمیں اور غزلیں چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہیں۔ مگر چند ایک لمبی بحر میں بھی ہیں۔

"ھالے اور حوالے" ہر روپ اور ہر رنگ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اُن کے کلام میں غنائیت بھی ہے۔ جو کسی مغنی یا مغنیہ کی توجہ کی منتظر ہے:

روتی رہ گئی شہنائی اور روتا رہ گیا پیار
او پردیسی پریت جگا کے چھوڑ دیا منجدھار
پھر سے آئی بہار رے پنچھی
پھر سے آئی بہار۔۔۔　　مجھ دکھیا پر ترس نہ آیا
آشاؤں نے روپ بدل کے　　تیرا رستہ تکتے تکتے
امرت چھینا ، زہر پلایا　　پریتم مورے نینا ہارے

فاروق ارشد شاہین کے ہاں بعض جگہ ناصر کاظمی، اور خود اُن کے والد مولانا غلام رسول مہر (مرحوم) کی شخصیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔

پیار کی اس ناگہانی موت پر　　دل گلے لگ کے مرے روتا رہا
صبح تک میرے جنوں کا قافلہ　　دشت فرقت میں لہو بوتا رہا

حسرت موہانی نے چپکے چپکے جن یادوں کو آنکھوں میں بسا رکھا تھا۔ فاروق ارشد شاہین کے ہاں وُہ یادیں کسک بن کر یوں ابھرتی ہیں

پھر شام کی پہنائی میں لمحے کئی آئے
تُو بال سکھانے کے بہانے
سیڑھی پہ چلی آتی
اِن لمحات میں ہم دونوں
کچھ دیر کھڑے رہتے مبہوت محبت میں

وہ گیت محبت کے وُہ پیار بھری شامیں
کیا لوٹ کے واپس وُہ آئیں گی کسی لمحے
پیوستہ رہیں نظریں در و دیوار سے کیوں ارشد
کچھ نقش محبت کے باقی ہیں وہاں شاید

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی پہلی بیوی کو لحد میں اتارتے ہوئے اُن کی ریشمی زلفوں کا لمس تاحیات سنبھالے رکھا۔۔۔ یہ لمس ارشد کے ہاں آ کر یوں نمایاں ہوتا ہے۔۔

کنارا کر لیا ارشد جو بدلا رنگ موسم نے میسر اب کہاں وُہ ریشمی زلفوں کے سائے میں

اچھی شاعری ہمیشہ دل کے نہاں خانوں میں اترتی ہے۔ یہیں پلتی ہے دِل کے زخموں سے نمو پاتی ہے۔ خون جگر سے سانسیں لیتی ہے۔ اور پھر ان نہاں خانوں سے نمودار ہوتی ہے تو آپ بیتی نہیں رہتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔ کیونکہ کائنات کی سچائیاں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ دل پر چوٹ لگے تو آنکھیں اشکبار ہو ہی جاتی ہیں۔ فاروق ارشد شاہین کی شاعری آپ بیتی نہیں جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے لڑکپن کی جس محبت کو دل کے نہاں خانوں میں سنبھالے رکھا۔۔۔ وقت زمانے، حالات اور تنہائی نے اُسے جلا بخشی۔۔۔ اور ان کی شاعری ہر دل کی آواز بن گئی اُن کے ہاں ہمیں قوم کا درد اور زمانے کی زبوں حالی کا بھی ذکر ملتا ہے۔

بے مروت، بے حمیت، بے ہنر ہوتے رہے لوگ میرے شہر میں زیر و زبر ہوتے رہے

اور

یوں خلق خدا مرتی رہی بھوک سے لیکن کچھ اس کا اثر ہو نہ سکا تخت نشیں پر
رہنے کو ٹھکانہ بھی میسر نہیں ارشد اب اپنا بسیرا ہے اِسی تپتی زمیں پر

آخر میں ان کا ایک تأثر انگیز شعر ملاحظہ فرمایئے۔

تلاش قتل ہو ارشد کہاں کہ مقتل میں نہیں ہے ثبت کوئی نقش دست قاتل کا

مراسلات

بیرسٹر سلیم قریشی۔ لندن

ضخیم سالنامہ ہمدست ہوا۔ بلکہ نظر نواز ہوا۔ الاقرباء یورپ کی مشینی زندگی میں دلوں کا پیغام اور علم وادب کی روشنی لاتا ہے اس دفعہ سرِ ورق پر جناب ابن کلیم احسن نظامی کے حُسنِ فن کا شاہکار طُغرا جاذبِ نظر ہے جو پاکستان کے قومی ترانہ کو گلدستہ کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اورفنِ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ اپنے اندر درخشندہ ماضی کی جھلکیاں اور علمی روایات لئے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ الاقرباء کے سرِ ورق پر یہ طُغرا آپ کے حُسن ذوق کا آئینہ دار ہے۔ اندرونِ مجلّہ آپ نے قومی ترانے کا تاریخی پس منظر پیش کیا ہے جو معلومات افزا ہے۔

آپ اپنے اداریوں میں ملک کو درپیش اہم موضوعات پر رقمطراز ہوتے ہیں۔ اس دفعہ تعلیم اور اعلیٰ تعلیم پر ''قندیل علم۔ ظلمت و جہالت کے حصار میں'' کے عنوان سے نہایت تفصیلی افتتاحیہ مقالہ لکھا ہے اُمید ہے کہ موجودہ حکومت اس سلسلہ میں ماضی کی کوتاہیوں اور مستقبل کے لیے آپ کی تجاویز کا نوٹس لے گی موجودہ سالنامہ بھی ماضی کے سالناموں کی طرح علم وادب کا ذخیرہ سمیٹ لایا ہے۔ پروفیسر محمد اویس جعفری کا حضرت حسّان بن ثابتؓ پر مضمون ایک تحقیقی تحریر ہے۔ اس سے عرب شاعری کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سقراط پر جناب شاکر کنڈان کا تاریخی مضمون، بہت دلچسپ ہے ''جنوبی ہند میں اردو'' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر جاوید حبیب کی تحریر جنوبی ہند میں اردو کی تاریخ پر نہایت سیر حاصل معلوماتی تبصرہ ہے۔ اقبالیات پر نہایت ہی فکر انگیز مضامین لکھے گئے ہیں خاص طور پر جناب عامر سہیل اور ڈاکٹر مظہر حامد نے اپنے مقالہ میں اقبال کے معترضین کے اُٹھائے ہوئے اعتراضات کے خاطر خواہ جواب دیئے ہیں اور علامہ کا پوری طرح دفاع کیا ہے۔

یادِ رفتگان میں جناب عقیل دانش کا اپنے بھائی پروفیسر ڈاکٹر شریف احمد مرحوم پر لکھا ہوا مضمون اُن کے دل کی آواز ہے۔ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' خود عقیل دانش اپنے بھائی کا پرتو ہیں۔

میگزین کا حصّہ نظم بھی نثر کے حصّے کے ساتھ توازن برقرار رکھتا ہے۔ ''نقد ونظر'' کے حصّے میں کتابوں پر آپ کے تبصرے بھی بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ میرے دوست عقیل دانش کی کتاب ''پیرایۂ اظہار'' (شعری مجموعہ) پر آپ کا تبصرہ پڑھا۔ چونکہ آپ خود ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ شعری مجموعہ پر آپ کا تبصرہ قابلِ قدر ہے آپ نے اپنے تبصرہ میں مصنف کے بارے میں لکھا ہے ''نئے ماحول اور جبر وقدر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ان کا منشورِ حیات ہے لیکن ماضی فراموشی عقیل دانش کے نصاب زندگی میں شامل نہیں'' چونکہ میں انھیں ذاتی طور پر جانتا ہوں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ موصوف کے بارے میں آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ لکھنا تو بہت کچھ تھا لیکن طوالت کے خوف سے مراسلہ ختم کرتا ہوں۔ والسلام۔ خیر اندیش۔

محمد طارق غازی۔ آٹوا۔ (کینڈا)

بہت تاخیر سے کچھ نذر پیش کر رہا ہوں کوئی بیس پچیس برس ادھر کی بات ہے کمپیوٹر کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بات کرتے ہوئے میرے ایک عرب دوست نے کہا تھا کہ دس سال بعد جو شخص کمپیوٹر کے استعمال سے ناواقف ہوگا وہ جاہل کہلائے گا۔ اپنی بے علمی کے بارے میں کبھی شبہ نہیں تھا۔ اب تصدیق بھی ہوگئی۔ کمپیوٹر پر لکھ لیتا ہوں باقی کچھ نہیں آتا جاتا۔ اور لکھنا بھی یوں ہے کہ جیسے سائیکل پر بٹھا کر کوئی آہستہ سے اسے دھکیل دے تو ہم سائیکل سوار کہلاتے ہیں ہزار سال پہلے ایک تہذیب بے علم لوگوں کو کم علم اور کم علم لوگوں کو ذی علم بنادیا کرتی تھی۔ اب جاری تہذیب چند منٹ میں سارا پڑھا لکھا غارت کردیتی ہے۔ 'فاعتبروا یا اولی الابصار' آنکھوں والو عبرت پکڑو!

قصہ مختصر مجھے کمپیوٹر کی کچھ شدبد (اصل ہندی لفظ شُدھ بُدھ۔ خالص عقل) ہوتی تو بھلا یہ تاخیر کیوں ہوتی۔ سالنامہ ۲۰۱۳ء میں حضرت حسان ابن ثابت پر برادر محترم اویس جعفری صاحب کا مقالہ روح کی سرشاری کا باعث ہوا۔ اتنی عرق ریزی سے لکھا ہوا یہ ادبی شہ پارہ

رسولؐ اللہ سے ان کی بے پایاں محبت کا آئینہ دار ہے۔ میں اس مضمون کو دو بار پڑھ چکا ہوں مگر سیری نہیں ہوئی۔ کیا اچھا ہوا اگر حضرت کعب ابن مالک، حضرت عبداللہ ابن رواحہ اور حضرت خنسا پر بھی اسی نوعیت کے مضامین آجائیں۔ ابن ہشام نے موقعہ بموقعہ اوّل الذکر دو اصحاب کا اجمالی ذکر کیا ہے، مگر میرے علم میں نہیں اردو میں ان پر کوئی تحقیق کی گئی ہے۔ میرے ایک کرم فرما دارالعلوم دیوبند کے فاضل مولانا ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی ہیں جن کا ادبی ذوق بھی نہایت اعلیٰ ہے۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ اسلام کے عرب شعرا پر ایک سلسلۂ مضامین الاقرباء کے لیے تحریر کریں☆۔ یہ خط مولانا نجیب قاسمی کو بھی بھیج رہا ہوں۔ تمام عزیز الاقرباء اور ارباب الاقربا کو سلام پہنچایئے۔

ڈاکٹر نسیم ہائنس۔ (ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ)

سالنامہ ملا، شکریہ۔ میرے خیال میں اپنی تاریخ اشاعت کا یہ سب سے زیادہ ضخیم شمارہ ہے۔ سرِ ورق بہت خوبصورت ہے۔ دونوں جگہ یعنی یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا، کینیڈا اور یہاں ہارورڈ میں رسالہ بروقت مل گیا۔ میں یہاں گرما کا اردو پروگرام پڑھانے پہنچی ہوں۔ پیر ۲۴ جون سے کلاسز شروع ہو رہی ہیں جو ۱۰ اگست تک جاری رہیں گی۔ نصاب کو دیکھتے ہوئے کچھ نظم و نثر کا حصہ ریکومینڈیڈ ریڈنگ کے لیے ریزرو کرنے کی خواہش ہے، ابھی انتخاب کرنا باقی ہے۔ یہاں ۲۰۰۷ سے لے کر آج تک کی فائل مکمل ہے اس لیے سابقہ شماروں سے بھی انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ سہ ماہی الاقربا انشاءاللہ ستمبر تک وصول ہو جائے گا۔ یو۔بی۔سی۔ میں سرما کے سیشن میں وہاں کے نصاب کو دیکھتے ہوئے کچھ انتخاب ان طلبا کے لیے بھی تجویز کرنے کی نیت رکھتی ہوں۔ یہ شمارہ بھی اپنی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بہت اعلیٰ تحقیقی مضامین رکھتا ہے۔ کاروانِ حیات کا حصار کرتی اور دنیائے دوں کو اسیر کرتی ہوئی ''کتاب'' کا آہنگ بہت پسند آیا۔

☆ ہم فاضل و محترم مرسلہ نگار کے اس کرم کے لیے سراپا سپاس ہیں (ادارہ)

''نقد ونظر'' میں کتابوں پر بہت عمدہ تبصرہ ہوتا ہے، دل چاہتا ہے سب ہی کو حاصل کر لیا جائے۔ ان نامساعد حالات میں بھی اس قدر اعلیٰ ادب تخلیق ہو رہا ہے، فخر وشکر کی بات ہے۔ اس حصہ کو ہر دو یونیورسٹیز کے منتظمین کتب خانہ کے علم میں بھی لاتی ہوں۔ بہت عرصہ سے آپ کو خط نہیں لکھ سکی اور آج بھی بس حاضری لگا رہی ہوں، امید ہے آئندہ تفصیل سے لکھ سکونگی۔ تمام تر نیک خواہشات کے ساتھ۔

ڈاکٹر عارفہ بشریٰ۔ سری نگر (کشمیر)

میں بصد ادب خود کو آپ سے متعارف کرا رہی ہوں۔ میرا نام (ڈاکٹر) عارفہ بشریٰ ہے اور میں حضرت بل سری نگر میں یونیورسٹی آف کشمیر میں ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو ہوں۔ میں ایک ورکشاپ میں شرکت کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گئی ہوئی تھی وہاں پروفیسر زاہد سے آپ کے موقر مجلّے کا پتہ ملا۔ میں مختلف رسائل وجرائد میں لکھتی رہی ہوں۔ میں آرزومند ہوں کہ آپ کے موقر مجلّے کے لیے اپنی! نگارشات پیش کروں چنانچہ میں اپنا ایک غیر مطبوعہ اور آپ ہی کے مُجلّے کے لیے بطور خاص تحریر کردہ مضمون بعنوان ''اردو شاعری میں تانیثیت'' ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ قبول فرمائیں گے۔ شکریہ (ترجمہ)

احمد اعجاز الدین رحمت علی (ماریشس)

آپ کا مؤقر سہ ماہی الاقرباء برقی نہاد کی معرفت نظر نواز ہوا۔ تحقیقی وتخلیقی مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ مجلّہ معلومات افزا نگارشات سے مزین ہے اور معیار کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر اور منفرد ہے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ رسالہ عالمی کردار کا حامل ہے اور اردو زبان وادب سے محبت کرنے والے اس سے تشنہ اور محروم نہیں رہ سکتے۔ ماریشس جیسے دور افتادہ ملک میں جہاں کے مسلمان اردو زبان کو اپنی آبائی زبان سمجھتے ہیں وہاں کے اردو اساتذہ اور طلباء کے لیے الاقرباء کا گاہے بہ گاہے مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ اُن کے تجسس اور ذوق کی آبیاری ضرور کر سکتا ہے۔

مقالہ افتتاحیہ "قندیلِ علم"۔۔۔ جہالت وظلمت کے حصار میں" کو حرفاً حرفاً اور سبقاً سبقاً پڑھا اور سوچنے پر مجبور ہوا کہ پاکستان کے نظامِ تعلیم کی کیا صورتِ حال ہے۔ پاکستانی قومی ترانے پر مشتمل مضمون بھی غیر پاکستانیوں کے لیے قدرے دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ جو مضمون مجھے سب سے زیادہ پسند آیا وہ بلاشبہ پروفیسر محمد اویس جعفری کا ہے جو مکرر پڑھنے کی چیز ہے۔ دوسرے مضامین بھی بہت جاندار ہیں چاہے غزل ہو یا، غلام عباس، منٹو، غالب یا اقبال پر مضامین ہوں سب قابلِ ستائش ہیں۔ میری نظر سے غیر پاکستانی اہلِ قلم کی تحریریں بھی گزری ہیں جن میں جاپانی سکالر جناب سویمانے شامل ہیں۔ غالباً انھوں نے غیر ملکی زبان کے طور پر اردو زبان وادب کا مطالعہ کیا ہے، لیکن ماریشس میں صورتِ حال مختلف ہے۔ یہاں اردو کی تعلیم بطور ثانوی زبان دی جاتی ہے اور یہاں ہم لوگ اردو زبان کو اپنی ثقافت کا مخزن سمجھتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم کرنے میں بھی دلچسپی ہے کہ کیا اردو کے بعد اسلامی تاریخ کے لیے بھی آپ کے مجلّے کی آغوش وا ہے ؟

مجھے یہ جان کر بھی مسرت ہوئی ہے کہ آپکے ادارتی اراکین میں فرانسیسی زبان وادب پر ایک خاتون ماہرہ بھی شامل ہیں۔ نیک تمناؤں اور دلی مبارکباد کے ساتھ۔

سیّد انتخاب علی کمال۔ کراچی

سالنامہ ۲۰۱۳عیسوی میرے نئے تبدیل شدہ پتے پر مل گیا۔ نوازشات و اکرام۔ حسین و خوشنما، اعلیٰ ذوقِ خطاطی سے سجا سرورق سُبحان اللہ۔ الاقرباء کا قدرتی حُسن ہی دلفریب ہے۔ "مقالہ افتتاحیہ" اداریہ، حساس دل اور ذوقِ علم رکھنے والوں کے دل کی آواز ہے خدا کرے یہ صدائے علم صدا بہ صحرا بن کر ریت کے ٹیلوں میں گم نہ ہو اس میں شک نہیں کہ اس کی سطر سطر نیک نیتی پر مبنی ہے۔ پروفیسر محمد اویس جعفری صاحب نے شاعرِ دربارِ رسالت ؐ حضرتِ حسّان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت، فن، مقام اور حسب نسب کے اُن پوشیدہ گوشوں پر بھی روشنی ڈالی جو نظروں کے عام جھروکوں سے اُوجھل تھے۔ واقعی علمی اور تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔

اس کی تعریف کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں؟

محترم سرور عالم راز سرور صاحب کے مضمون ''اُردو غزل کی صورت گری'' میں ضرب المثال ''گرگِ باراں دیدہ'' کی جگہ ''گرگ بارہ دیدہ'' (بارہ آنکھوں والا بھیڑیا) ایک لطیفہ کی طرح ہے اور خوب ہے۔ برادرِ محترم! یہ تو بہادر شاہ ظفر کا زمانہ تھا جہاں کم از کم محل سرا کی خواتین بھی ''گرگ'' کے معنی تو جانتی تھیں بس مسئلہ آن پڑا ''باراں دیدہ'' کے تلفظ یا اِملا کا۔ اگر اتفاق سے آج کا کمپوٹرائزڈ زمانہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ تلفظ کے معاملے میں تو اِلا ماشاللہ آج کی خواتین تو محل سَرا کی خواتین سے کہیں آگے ہیں۔ بلکہ خواتین کو چھوڑیئے تلفظ کے معاملے میں مرد حضرات بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ یادش بخیر! ایک زمانہ تھا جب صرف اکیلا ریڈیو ہی ہوتا تھا۔ زیڈ اے بخاری مرحوم اس کے رُوح ورَواں ہوتے تھے۔ کیا مجال کہ کہیں تلفظ کی غلطی کسی اناونسر سے سرزد ہو جائے فوراً بخاری صاحب سرزنش فرماتے تھے۔ مگر آج ٹی وی پر چلنے والی ''پٹی'' پر ''فلاں حادثے میں پانچ جانوں کا ''زیاں'' کو تقریباً ہر چینل پر ''ضیاع'' لکھا جاتا ہے۔ ''عذاب'' (ع۔ذ۔ا۔ب) کو ''عزاب'' (ع۔ز۔ا۔ب) لکھ دیا جاتا اور کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اسی طرح اکثر اخبارات ورسائل میں ''اَلسَّلامُ عَلَیکُمْ'' جیسے اسلامی کلمے کو ''السلام وعلیکم'' لکھا جاتا ہے ایسے معمولی معمولی الفاظ کی ''اِملا'' اَٹکل پچّو الل ٹپ لکھنے کا رواج عام نظر آتا ہے۔ الغرض ''گرگِ باراں دیدہ'' کو اگر آج ''گرگِ بارہ دیدہ'' سمجھ لیا جائے تو کوئی عجب نہیں۔۔ محترم علیم صبا نویدی کا مضمون اچھا ہے۔۔۔ ''یہ مسائل تصوّف یہ ترا بیان غالب'' میں محترم فیصل عجز صاحب نے شہرۂ آفاق کُتب ''فُصوص الحکم'' اور ''فُتوحاتِ مکّیہ'' کے عظیم خالق حضرت شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ کے ''نظریۂ وحدت الوجود وشہود'' یعنی اہلِ تصوّف کی اِصطلاح میں وہ دَرجہ جس میں جلوۂ حق بلکہ ہر شے عینِ حق نظر آئے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ احمد شاہ بادشاہ کے دور میں فُصُوص الحکم کا ایک اردو ترجمہ شیخ محمد حسین دہلوی نے بھی کیا ہے۔ دیکھئے ''خم خانۂ جاوید'' (جلد ششم صفحہ ۸۱) کے ساتھ ہی اسلام کا ''نظریۂ جبر وقدر'' بھی سرسری زیرِ بیان آگیا۔ مرزا

غالب کے مسائلِ تصوف نیز غالب اور شاہ غمگین کے سولہ سالہ تعلقات کا ذکر بھی مختصر کر کے گویا کوزے میں سمندر بند کر دیا ہے۔۔۔محترم شاکر کنڈان کی تحریر "سقراط۔صاحب سیف و دانش" میں شاکر صاحب نے سقراط کے زرّیں اقوالِ علم و دانش کے خزینے جمع کر کے عمدہ کام کیا۔ جناب خالد امین، ڈاکٹر سویامانے اور میرے محترم دوست کے بیٹے عزیزی ڈاکٹر مظہر حامد کی تحریریں اچھی ہیں۔ حصہ نظم میں کئی ناقابلِ فراموش اشعار ہیں۔ افسانہ "نگندے" بہترین اور "پھل پائی" اعلیٰ ترین افسانے ہیں۔ امید ہے آپ مع اراکینِ مجلسِ ادارت بخیر ہوں گے۔

والسلام

سیّدہ ماہرہ نعمان۔کراچی

پہلی بار انٹرنیٹ پر سہ ماہی الاقرباء جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء دیکھا واقعی یہ عالمی معیار کا مجلّہ ہے سطر سطر میں خوب پلکوں سے نمک چنا ہے۔ مقالۂ افتتاحیہ کا لفظ لفظ سجا سجا لکھا ہے۔ امریکہ سے پروفیسر محمد اویس جعفری صاحب نے حضرت حسان بن ثابتؓ کی شخصیت، فن اور بہادری نیز حسب نسب پر بڑی محنت اور بھرپور مطالعہ سے مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ جناب سرور عالم راز سرور نے جناب محترم صبا نوید صاحب نے، جناب محترم فیصل مقبول عجز صاحب نے بڑی عمدہ کاوشیں کی ہیں۔ مگر پورے کے پورے مجلّہ میں اگر کوئی سوغات ہے تو وہ "امام فن جمل۔۔۔باقر گیلانی" ہے۔ باقر گیلانی کا مطلع جس میں ایک بھی بھرتی کا لفظ نہیں ہے۔

نبی و تاج ملک، مہر عالم و زیب جہاں

(منقوط ۵۳۴   ۱۰۶۸ ہجری   (غیر منقوط ۵۳۴)

بزرگِ عالمیاں، عز کعبہ، تاج جہاں

(منقوط ۵۳۴   ۱۰۶۸ ہجری   (غیر منقوط ۵۳۴)

سنہری حروف میں لکھا جانے والا مطلع ہے اس کے دونوں مصرعوں کے حروف کی تعداد بھی ۲۴/۲۴ ہے۔ اور اسی طرح شعر نمبر ۶ اور ۷ کے حروف کی تعداد ۲۴/۲۴ ہے۔ ویسے تو باقر گیلانی

کے تمام کے تمام اشعار اعلیٰ فن کا نمونہ ہیں اب تو ایسی محنت اور فنکاری ناپید ہوگئی ہے اور سہل پسندی عام ہے۔ حصہ نظم میں شفق ہاشمی کی حمد۔۔۔ شفق ہاشمی کی نعت۔۔۔ شفق ہاشمی کی غزلیات اور شفق ہاشمی کے تراجم سب ہی سے ان کی قادر الکلامی جھلکتی ہے۔ لگتا ہے وہ کہنہ مشق اُستاد ہیں۔ صابر عظیم آبادی کی یہ رُباعی لاجواب ہے۔

جو بوجھ ہیں کاندھے سے اتارے جائیں دن اپنے کسی طور گزارے جائیں
رہتا ہے ہر ایک لحہ یہ دھڑکا دل میں ہم لوگ شرافت میں نہ مارے جائیں

افسانوں میں ''تگندے'' محاورات اور ضرب الشال کا حسین مُرقع کہیئے۔ ڈاکٹر مظہر حامد نے ''علامہ اقبال کے ہم عصر معترضین'' اچھا لکھا ہے۔ نقد ونظر میں ''شب تاب'' کا تبصرہ پسند آیا۔ اور سیدہ مایاو آسٹی کا ''منافقت کیا روگ ہے'' بھی اچھا ہے مگر یہ جماعت ہشتم کی طالبہ کا لکھا نہیں لگتا۔

شفق ہاشمی۔ اسلام آباد

سالنامہ نظر نواز ہوا۔ دیدہ زیب اور دل پذیر سرورق اور فروغ تعلیم کے موضوع پر جناب کے انتہائی مؤثر اور مدلل مقالۂ افتتاحیہ سے لے کر خوبصورت منظومات و منثورات تک تمام مندرجات بالعموم بہت خوب ہیں۔ میں خصوصی طور پر محترم محمد اویس جعفری صاحب کو سیّد حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کی شخصیت اور فکر وفن کے حوالے سے ایک جامع اور عالمانہ مضمون پر دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ عربی زبان وادب پر دقیقہ رس نظر نہ ہو تو اس نوعیت کی تحریر ممکن نہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے شعروادب پر حضرت حسانؓ کی فکری میراث کا احسانِ عظیم ہے کہ اس کی بدولت ہمیں فکر وفن کی نئی جہتیں ملیں اور حب رسولؐ اور اُسوۂ رسولؐ کو علم و عمل کے سانچوں میں ڈھال کر ادب پاروں میں منتقل کرنے کی روایت وجود میں آئی۔ میری خواہش اور گزارش ہے کہ جعفری صاحب آئندہ سیّدہ خنساء اور اُمّ المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شعری کارہائے نمایاں پر بھی خامہ فرسائی فرمائیں۔

جعفری صاحب کے دل نواز مقالے کے بعد ''اردو غزل میں محبوب کی صورت گری'' کے عنوان سے جو تحریر نظر سے گزری اس سلسلہ میں کہنا چاہوں گا کہ اپنے موضوعاتی تنوع ہمہ گیریت، لب ولہجہ کی چاشنی، اسلوب کی دلربائی، اور کینوس کی بے پایاں وسعت کے لحاظ سے اردو غزل کو نہ صرف اردو شعروادب کی تاریخ میں بلکہ عالمی ادبی سطح پر جو منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ مضمون اس کا احاطہ نہیں کر پایا مضمون غمازی کرتا ہے کہ اردو غزل اور اس کی آفاقی قدر تغزّل کے حوالے سے بھی صاحب مضمون انصاف نہیں کر پائے۔ آغاز کلام میں ہزاروں بار کہی گئی بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ''غزل کے لغوی معنی عورت سے بات کرنا ہے''۔ عربی قوامیس کے مطابق لفظ غزل محبت، اس کے عرفان اور جمالیاتی پہلو سے عبارت ہے۔ ''ز'' کے سکون سے لفظ غزل کا مفہوم ہے بُنت کاری (To weave/ To spin) ان دونوں بنیادی مفاہیم کو سامنے رکھیں تو بطور اصطلاح غزل اس صنف سخن کا نام ہے جس میں محبت کی آفاقی قدر، جمالیاتی پہلو اپنے پابند پیرایۂ اظہار سے مل کر اُسے الفاظ کی انتہائی خوبصورت بُنت کاری کا اعلیٰ نمونہ بناتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مضمون غزل کے قلب میں ڈھل جائے تو اس کی معنویت اور دل کشی میں بے پایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ شانِ تغزّل ہے جو غزل کو جملہ اصنافِ ادب سے منفرد کرتا ہے۔ اپنے محدود مطالعہ کے رُو سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اردو غزل کا ثانی نہ عربی و فارسی میں موجود ہے اور نہ انگریزی ادب میں۔

صاحب مضمون کا شکوہ ہے کہ فارسی ادب سے مستعار لیلیٰ، مجنوں اور شیریں فرہاد کی داستان ہائے حسن و عشق پر ہی اردو غزل کی تان کیوں ٹوٹتی ہے اور ''ہندوستان کے رومانوی کردار'' سسّی، پنّوں ہیر، رانجھا، سوہنی، مہینوال اور اس میں حضرت کرشن مراری اور رادھا کی روایات نے کیوں جگہ نہیں پائی۔ اسی طرح اُنہیں رستم وسہراب، قیصر وکسریٰ اور نوشیرواں کے حوالوں پر بھی اعتراض ہے۔ آگے چل کر اردو غزل میں شاعر کا محبوب کے لیئے بالعموم صیغۂ مذکر کے استعمال پر وہ برافروختگی کا اظہار کرتے ہیں۔

اس نوعیت کی گفتگو کا کوئی تفصیلی جائزہ تو تضیع اوقات کے ضمن میں آتا ہے، میں یہاں صرف چند نکات کی طرف اشارہ مناسب سمجھتا ہوں۔ ''عشق و محبت'' بلاشبہ اردو غزل کا اولین حوالہ ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہ بجائے خود اتنا ہمہ گیر اور وسیع الجوانب عنصر ہے کہ چند الفاظ میں جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ اردو غزل میں محبوب کے لئے صیغۂ تذکیر کا استعمال فی الحقیقت اُسے جو معنوی حسن اور جمالیاتی گہرائی و گیرائی عطا کرتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ نہ صرف عشق حقیقی اور عشق مجازی، کے معروف پہلوؤں سے، بلکہ ابلاغیاتی حسن کے نقطۂ نظر سے بھی اس طرح اسے جو وسعت حاصل ہوئی ہے وہ صیغۂ تانیث سے ممکن نہیں تھی۔

رہی بات کہ 'ہندوستان' کے داستانوی کردار ہماری شعری روایات میں کیوں جگہ نہ پا سکے تو اس کی بڑی واضح توجیہہ تو یہی ہے کہ فطری طور پر اردو زبان و ادب اور اس کی شعری روایات پر عربی اور فارسی ادبی روایات کا اثر ایک لازمی امر ہے۔ اس کا مگر یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رام، سیتا، کرشن، رادھا، اور ہیر وغیرہ کا ذکر اور حوالہ اردو شعروادب میں مفقود ہے۔ ہندوستان کے مقامی کلاسیکی ادب پر گیت اور سنگیت کا عنصر غالب ہے اور اسی بناء پر ہمارے بالخصوص گیت نگار شعراء کے یہاں وہ تمام تلمیحات، استعارے اور لسانیاتی تلازمے بکثرت ملیں گے جن پر ''ہندوستان'' کا اطلاق کیا جا سکتا ہے میراجی، ن م راشد، اختر الایمان، ساحر وغیرہ کے یہاں یہی پہلو نمایاں ہے۔

مفتی عبدالرحمٰن شریف۔ جنوبی افریقہ

آپ اس خاکسار کو یاد رکھتے ہیں، میں اس نوازش کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ چند ماہ قبل مدرسہ انعامیہ، کیمپر ڈاون کے امیر کی تجویز پر میں نے بوٹسوانا کے جامعہ اسلامیہ میں تدریس، جامعہ مسجد کی امامت اور دارالافتاء کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور اسی وجہ سے مجھے نقل مکانی اختیار کرنی پڑی۔ چند ماہ مصروفیت بہت زیادہ رہی، اسی لیے سابقہ شماروں کا صرف سرسری مطالعہ کر سکا۔ سالنامہ ماشاءاللہ بہت ضخیم اور تحقیقی مضامین سے آراستہ ہے۔ سرورق کی جتنی

تعریف کی جائے کم ہے۔ حمد و نعت آپ کے شعری شعبہ کی ہمیشہ جلی سرخی ہوتی ہے اور یہ بہت مبارک فعل ہے۔ اقبالیات پر الاقرباء خصوصیت کے ساتھ تحقیقی مضامین شامل کرتے ہوئے اپنا امتیاز قائم رکھتا ہے۔ اس مرتبہ شاعر دربار رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سید نا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اویس جعفری صاحب کا بہت تفصیلی و معلوماتی مضمون شامل ہے۔ میں عربی ادب کا طالب علم ہوں اور عشا قان و مدح خوانِ آقا کا آپ کی طرح عاشق و مدّاح۔ زیر نظر مضمون کے آخری حصہ میں عربی اشعار کا متن نہیں دیا گیا، جس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ترجمہ لاکھ اچھا ہو عربی زبان کی رفعت تک بمشکل پہنچ پاتا ہے۔ اس موضوع پر دکتور حنفی حسنین کی کتاب 'الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام'، عبداللہ انیس الطباع کی تصنیف 'شاعر النبی حسان بن ثابت الانصاری'، شوقی حنیف کی کتاب 'تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی' اور حنا الفاخوری کی تصنیف 'تاریخ الادب العربی' تفصیلی و معروف کتابیں ہیں۔ براہ کرم عربی شعرا خصوصاً عہدِ رسالت کے بانیانِ نعت و مدحتِ سرکار کے فصیح، قادر الکلام اور نابغہ روزگار شعرا پر مضامین کا یہ لائق ستائش سلسلہ جاری رکھیے۔ ان کی ادبی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ ہمارا تاریخی اور ادبی ورثہ و سرمایہ ہے۔ اہلِ ذوق کے لیے اس صہبا کو عام کیجیے ۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین

سعدیہ راشد۔ کراچی

آپ کا گراں قدر جریدہ ''الاقرباء'' پابندی سے وصول ہو رہا ہے۔ اس بار سالنامہ ضخیم بھی ہے اور متنوع مضامین اور تحریرات سے مزین بھی۔ محمد فیصل مقبول عجز صاحب کا مضمون اپنے موضوع پر کچھ مختلف انداز کا لگا اور جاذب توجہ ہوا۔

اوساکا یونیورسٹی جاپان کے جناب ''سویامانے'' کا مضمون مختصر مگر اہم ہے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ ''الاقرباء'' کی ادارت اور اشاعت میں پوری توجہ صرف کر کے اسے مفید تر بناتے ہیں۔ بہ احترامات فراواں۔

فریدہ لاکھانی۔ سڈنی (آسٹریلیا)

سالنامہ نظر نواز ہوا۔ حال ہی میں الاقرباء پر محترم حسن چشتی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر اس رسالہ کی تاریخی توقیر کا اندازہ ہوا۔ بہت شکریہ کہ آپ نے میری غزل کو شریک اشاعت کیا۔ ایک غیر مطبوعہ غزل ارسال ہے۔ رسالہ بلا شک وشبہ بہت معیاری ہے اور میرے نزدیک اس کی حیثیت دنیائے ادب میں ایک شمع کی مانند ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ اسے سدا روشن رکھے۔ ہر چند کہ یہ شکایت عام ہے کہ اچھا ادب پڑھنے والے ناپید ہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ جب تک الاقرباء کے جیسے لکھنے والے جو علم وادب سے نہ صرف محبت رکھتے ہیں بلکہ جان ودل سے اس کی خدمت بھی کر رہے ہیں، باقی ہیں پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائیگا جیسا کہ اس رسالہ کے عالمی قارئین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مقولہ ہے کہ زندگی ماضی کو دیکھ کر سمجھتی ہے اور مستقبل کو سامنے رکھ کر بسر کی جاتی ہے۔ اور کرنی چاہیے۔ یہ ایک مثبت فکر کی علامت ہے۔ آپ کے اداریے اور نثر ونظم کے شہ پارے صحت مند ادب کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے خالق آئندہ نسلوں کے لیے بے ایک بیش قیمتی خزانہ پس انداز کر رہے ہیں۔ عہدِ حاضر کے رسائل وجرائد میں الاقرباء اس خزانہ میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

سیّد حبیب اللہ بخاری۔ بہاولپور

سہ ماہی 'الاقرباء' کا سالنامہ ۲۰۱۳ء موصول ہوا۔ یہ آپ کا مجھ پر کرم خاص ہے۔ مجلّہ کے سرورق پر ترانہ ملی ایک گلدستہ کی صورت میں رقم ہے یہ جدّت قابلِ تحسین اور جاذب نظر ہے۔ سالنامہ میں جملہ مضامین ومقالات اور حصہ اقبالیات کے مطالعہ سے محققین کی محنت وکاوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ہمارے لیئے علمی سرمایہ ہے۔

بیگم ثاقبہ رحیم الدین اور عثمانہ اختر جمال کے افسانے پسند آئے حمد ونعت اور غزل ونظم کا حصہ شعرا حضرات کے ذوقِ جمال اور رفعتِ تخیل کو اجاگر کرتا ہے۔ شہلا احمد کے برادر اور آپ کے قریبی عزیز سید صدیق علی صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ

انہیں جوارِ رحمت میں جگہ اور جملہ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ رمضان المبارک کی برکتوں سے اللہ آپ سب کو نوازے۔ عید کی پیشگی مبارک باد قبول کیجئے۔

انوار فیروز۔ راولپنڈی

سہ ماہی الاقرباء کا سالنامہ موصول ہوا۔ جس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ یوں تو الاقرباء کا ہر شمارہ ہی خاص نمبر ہوتا ہے لیکن سالنامے کی کیا بات ہے سرورق سے لے کر آخر تک تمام نگارشات عمدہ اور معیاری ہیں آپ کا مقالہ افتتاحیہ بروقت اور خوب ہے۔ ہمارے ملک میں ہر چیز کا بیڑہ غرق کر دیا گیا۔ اللہ ہمارے حکمرانوں کو ہدایت دے۔

مضامین اور مقالات سارے ہی معیاری ہیں۔ خاص طور پر پروفیسر محمد اویس جعفری۔ سرور عالم راز۔ علیم صبا نویدی۔ فصیل مقبول عجز۔ شاکر کنڈان اور ڈاکٹر جاوید حبیب کے مضامین۔ اقبالیات میں پروفیسر رحیم بخش شاہین۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران۔ عامر سہیل اور ڈاکٹر مظہر حامد کے مقالات بہت اچھے ہیں اور ہم جیسے ادب کے طالب علموں کی رہنمائی کے لیے مفید ہیں۔ افسانے اور کہانیاں سب ہی اچھی ہیں۔ خاص طور سے آصف الرحمٰن طارق اور بیگم ثاقبہ رحیم الدین۔ حمد و نعت کے علاوہ شاعری کا حصہ بھی پسند آیا۔ سالنامہ ہر لحاظ سے بھرپور اور قابل تعریف ہے آپ کے اور نعیم فاطمہ علوی کے تبصرے بھی بھرپور ہوتے ہیں۔ الاقرباء بلاشبہ عالمی معیار کا جریدہ ہے اور دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے۔ آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔

عثمان مظفر۔ (نوکوآلودفا، ٹونگا)

آپ نے انٹرنیشنل یونیورسٹی اوف ایشیاء کرغستان کے شعبہ لسانیات میں اردو لیکچر کے سلسلہ میں گزشتہ تعلیمی سال میری بہت مدد کی تھی جس کے لیے میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ سالنامہ پڑھا اور پڑھ رہا ہوں۔ معمول کے مطابق بہت فاضلانہ مضامین ہیں۔ ہم جیسے لوگ جو ترکِ وطن کے باوجود پاکستان سے عشق رکھتے ہیں، صرف اخبارات اور رسائل ہی کے ذریعہ اس کے ادبی

منظر نامہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس شمارہ کا اداریہ بھی حکومت کی تعلیم سے بیگانگی کا مظہر ہے اس موضوع پر پہلے بھی آپ بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ کیا منتخب حکومت اس اہم مسئلہ پر توجہ دے گی، یہ تو صرف وقت ہی بتائیگا۔ اس شمارہ میں حضرت حسّان پر تفصیلی مضمون پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شہریار کی شاعری میں غزل کی روایت برقرار رکھتے ہوئے ان کا اختصار رمز و کنایہ کے ساتھ علامات اور استعاروں کا استعمال ان کو اپنے ہم عصر شعرا میں ان کے منفرد مقام کی ضمانت دیتا ہے۔ پروفیسر زاہد چونکہ مرحوم کے شعبہ ہی میں مدرس تھے اس لیے وہ ان کی شخصیت اور نفسیات سے زیادہ واقف ہیں اور اسی لیے مرحوم کے فن پر ان کا تبصرہ قابلِ قدر ہے۔ شہریار صاحب نے فلم، گمن، امراؤ جان ادا، اور انجمن، جیسی فلموں کے نغمات بھی لکھے ہیں۔ 'اسم اعظم' 'ساتواں در'، 'ہجر کا موسم'، 'خواب کے در بند ہیں' وغیرہ ان کے مجموہائے کلام ہیں۔ اس مرتبہ افسانہ اور کہانی کا حصہ پہلے کے مقابلہ میں بہت جاندار ہے۔ "غالب کا خط اقبال کے نام" انشا کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ امید ہے اس قسم کے خطوط عدم آباد کے مشاہیر آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ مصنف کے توسط سے انھیں مرا سلام اور گزارش پہنچا دیجے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ کہاں 'کرغستان' اور کہاں 'ٹونگا' تو جناب کرغستان کا معاہدہ ختم ہونے پر میں یہاں پڑھا رہا ہوں اور ستمبر میں انشاء اللہ 'ٹیٹو وو یونیورسٹی، میسی ڈونیا' میں شعبہ انگریزی کی پیش کش پر وہاں کا قصد ہے۔ میسی ڈونیا میں البانیہ کے مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے۔ ٹونگا کا تجربہ خوشگوار رہا۔ یہ بہت سرسبز و شاداب جزیرہ ہے۔ کیلے اور ناریل کے درختوں کی بہتات ہے۔ لوگ سادہ، مہذب، بہت خوش خوراک، تنور میں کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر مچھلی پکاتے اور موسیقی سنتے ہوئے کھاتے ہیں۔ کھانا اور موسیقی ہی یہاں مقصد زندگی ہے، باشندے بے فکر اور تن ومند ہیں۔ بغیر قمیض کے بنیان پہننا خلافِ قانون ہے۔ خواتین اور مرد ایک تہبند نما لباس پہنتے ہیں اور اس پر خوبصورت پٹکا باندھتے ہیں۔ یہاں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، فی جی اور عرب ممالک سے آئے ہوئے تقریباً سو مسلمان خاندان آباد ہیں۔ ایک مسجد مکمل ہورہی ہے جہاں اسلامی تعلیم کا

انتظام ہے۔حال ہی میں چند مقامی افراد نے اسلام قبول کیا ہے۔سکھ اور ہندو لوگ بھی ہیں اور بہت خوش حال ہیں۔ بڑے اور ترقی یافتہ ملکوں میں جا کر آباد ہونا تو سمجھ میں آتا ہے،مگر ٹونگا آکر آباد ہونا بہت ہمت کی بات ہے۔ چلتے چلتے ایک لطیفہ سناتا چلوں۔ یہاں پاک و ہند کے چند مسلمان خاندان اتوار کو ایک اسکول میں یکجا ہوتے اور گپ شپ کے لیے دعوت کا انتظام کرتے ہیں۔ان حضرات کو اپنی تہذیب ، زبان و معاشرت سے بہت پیار ہے۔ میں نے ان کو ان کی خواہش پر چند اخبارات اور رسالوں کے لنک فراہم کیئے۔ ایک خاتون نے انٹرنیٹ پر آپ کا رسالہ پڑھ کر جو تجویز دی ہے وہ آپ تک پہنچا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہر مضمون کے بعد ایک صفحہ لغت کا ضرور ہونا چاہیے جس میں مشکل الفاظ کے معنی درج ہوں۔ ☆مسکرایئے اور رفیقانِ کار کو سلام کہیے۔

مسعود احمد صدیقی۔ (کرک لینڈ۔امریکہ)

پچھلے دنوں ایک تقریب میں الاقرباء کا ذکر آیا اور یہ جان کر کہ یہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے،خوشی اس لیے ہوئی کہ اس کا جائزہ لینا اور معیار کا تعین کرنا ممکن ہے۔ بے شمار اخبارات اور رسالے آج کل انٹرنیٹ پر پڑھے جا سکتے ہیں۔لیکن مصروفیات کی بنا پر ان سب پر وقت صرف کرنا اور پھر اپنی دلچسپی کی تحریر تلاش کرنا ایک بڑا دردِ سر ہے۔ یوں بھی کسی ادبی رسالہ کو کمپیوٹر پر پڑھنا آسان کام نہیں۔ علم و ادب سے دلچسپی چونکہ میری نسل کی گھٹی میں پڑی ہے اس لیے اس سے مفر بھی ممکن نہیں۔ چند دنوں سے میں سالنامہ کے مطالعہ میں مصروف ہوں اور یہ دریافت کر کے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ یہ ایک معیاری تحقیقی رسالہ ہے اور اس کے اوراق میں ہر شخص کی دلچسپی کے لیے کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ لکھنے والے خواہ وہ نثر نگار ہوں یا سخنور، معروف و معتبر ہیں۔

☆ الفاظ کا مشکل یا آسان ہونا ہر شخص کا اضافی معاملہ ہوتا ہے۔اسی لیے فکشن یا ایسی ہی ہلکی پھلکی اصناف ادب پڑھنے والے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے متحمل نہیں ہو سکتے۔یہ ہم نہیں عرض کر رہے بلکہ انگریزی ادب کے عظیم نقاد ڈاکٹر جانسن کا ارشاد گرامی ہے(ادارہ)

ہے۔ رسالہ اشتہارات سے پاک ہے اور صاف ستھرے پاکیزہ ادب کا نمائندہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انواع و اقسام کے رسالوں کو خیر باد کہہ کر کسی ایسے رسالہ کا انتخاب کر لیا جائے جو تشنگی کا علاج فراہم کر سکے اور یوں اپنی علمی و ادبی و تہذیبی روایات سے رشتہ بھی برقرار رہے۔ کتابی صورت میں مطالعہ کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے، اس لیے زرِ خریدار سال کر رہا ہوں۔ براہِ کرم سالنامہ ڈاک سے جلد ارسال فرما کر ممنوں فرمایئے۔۔ ماشا اللہ آپ اور آپ کے احباب بہت ہی مثالی کام کر رہے ہیں اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔۔ میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ خیریت سے رہیے اور خوش رہیے۔

سعود صدیقی۔ کراچی

۲۰۱۳ء کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ میں شکر گزار ہوں اپنے اس سمندر پار دوست کا جس نے مجھے اس رسالہ سے متعارف کرایا۔ آج کے دور میں ایک معیاری اور متوازن ادبی رسالہ کی دریافت اور اشاعت اگر ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔ الاقرباء کی جلد بندی، کاغذ، چھپائی، اور نثر و نظم کا انتخاب، غرض اس کا ظاہری اور باطنی حسن، عصری ادب میں اس کے مقام و مرتبہ کا ایک روشن اور نا قابلِ تردید ثبوت ہے۔ میں تہہ دل سے مدیر، مجلس ادارت اور مجلس مشاورت کو اس تاریخ ساز کارنامہ پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس کی درازی عمر کے لیے دعا گو ہوں۔
اس کا سرورق اس قدر دلکش اور دیدہ زیب ہے کہ میں اس کی بڑی کاپی کرا رہا ہوں تا کہ اسے فریم کرا کر اپنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کر سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو رسالہ بھیجنے کی دوبارہ زحمت کرنا پڑی۔ ڈاک کا نظام اطمینان بخش نہیں ہے، جہاں لوگ گم ہو جاتے ہوں وہاں رسالوں اور کتابوں کے گم ہونے کا شکوہ کس سے کریں، اللہ ہمارے اوپر رحم و کرم فرمائے۔ میں اس شمارہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کمپیوٹر کا مزاج برہم ہو گیا۔ اسی دوران جناب حسن چشتی صاحب کا تبصرہ اخبارات میں دیکھا، کمال ہو گیا، دل سے دل کو راہ ہوا ایسی کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا، جناب چشتی صاحب نے قلمبند کر دیا۔ بہر حال

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے لے کر، غزل میں محبوب کی صورت گری، جنوبی ہند میں اردو، علامہ اقبال کے ہمعصر معترضین وغیرہ جیسے تحقیقی مضامین پڑھ کر یہ خیال آتا ہے کہ اگر حضرت امیر مینائی مرحوم ان مضامین کو دیکھتے تو انھیں اندازہ ہوتا کہ تنِ محقق میں ''مصرع تر'' کہنے والے شاعر کے تن سے کہیں زیادہ لہو خشک ہوتا ہے تب کہیں ایک مضمون کی صورت نظر آتی ہے۔افسانے بھی بہت اچھے ہیں۔رضیہ مشکور امریکہ کے ادبی افق پر بہت نمایاں خدمات انجام دے رہی ہیں، ہاجرہ مسرور کی ''تیسری منزل'' پر ان کا جائزہ اچانک ختم ہو گیا اور کچھ تشنگی باقی رہ گئی۔محترم ضامن جعفری، سرور عالم راز، خیال آفاقی، سلمان غازی، مہتاب قدر واویس جعفری صاحبان اور محترمہ فرزانہ اعجاز اور آمنہ عالم صاحبہ کی شاعرانہ صلاحیت سے انکار ممکن نہیں۔ان میں سے بہت سے اہل قلم سے علیگڑھ اردو کلب کی محفل میں ملاقات ہوتی رہتی ہے۔بیگم طیبہ آفتاب صاحبہ کے ''گھریلو چٹکلے'' میری اہلیہ کے علاوہ خاندان کی دوسری خواتین کے لیے بھی بہت دلچسپی کا موجب ہوئے۔چلتے چلتے اس بات پر مجلس ادارت کو مبارکباد دیتا چلوں کہ عام رسالوں کی روش کے برعکس اس مجلہ میں اس قسم کا کوئی گوشہ نہیں جس میں کسی شاعر یا ادیب پر اشتہار کی صورت میں مضمون ہو ۔رسالہ کی تنظیم، انتخاب، ترتیب اور مزاج میں ایک دلکش توازن ہے اور عالمی اردو ادبی رسائل کے لیے ایک لائق تقلید مثال۔نئی سہ ماہی کے شمارہ کے لیے چشم براہ اور دعا گو۔

خواجہ مشتاق حسین (گلبرٹ) امریکہ

دلفریب سرِ ورق میں ملبوس سال رواں کا جنوری تا جون کا سالنامہ وصول ہوا۔آپ کی سہ ماہی محفل میں ہمیشہ نئے لکھنے والوں سے ملاقات ہو کر بہت خوشی ہوتی ہے۔زیرِ نظر شمارہ میں ضامن جعفری، سرور عالم راز، انور احمد علی، مہتاب قدر صاحبان اور محترمہ پروین شیری و محترمہ فریدہ لاکھانی کی اعلیٰ تخلیقات پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔پروفیسر زاہد صاحب کا شہریار مرحوم کی فنی صلاحیتوں اور ان کے منفرد انداز و اسلوب سخن پر ایک قابل ستائش مضمون ہے۔وہ شعری مجموعے

جن پر اس شمارہ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ عصری ادب میں وہ سب ایک خوش آیند اضافہ ہیں۔ محشر زیدی صاحب کی ''یاد وصال''، حسن عسکری کاظمی صاحب کی ''شب تاب'' اور عقیل دانش صاحب کی ''پیرایۂ اظہار'' کی اشاعت پر انھیں دلی مبارکباد پہنچا دیجیے۔ تبصروں کو پڑھ کر کتابوں کے مطالعہ کی آرزو اور حصول کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ محشر زیدی صاحب کا یہ شعر:

سر سلامت آپ کا ہونا ضروری ہے حضور   ہم رعیّت ہیں ہمارا بال بیکا ہو تو ہو

عقیل دانش صاحب کا یہ شعر:

یہ دور وہ ہے کہ حق گوئی تو کجا دانش   ولی ہیں آپ اگر مدحتِ ستم نہ کریں

اور حسن عسکری کاظمی صاحب کی غزل کا گنگناتا ہوا یہ شعر کمال ہے:

روشنی، سایہ، تکلم، خامشی، خوشبو، ہوا   ان گنت اُسلوب اِک سرد چراغاں میں رہے

بہت سی تحریریں دوبارہ پڑھنے کا تقاضا کر رہی ہیں اور دوسری جانب کچھ احباب منتظر مطالعہ ہیں۔

فرخ ہاشمی۔ (پیرس) امریکہ

سالنامہ ملا۔ شکریہ۔ سرورق فن کا ایک نادر نمونہ ہے۔ قومی ترانہ کو خطاطی کے اس دیدہ زیب طغرہ میں پہلی بار دیکھا اور اس کے خالق، حسن نظامی صاحب کو اس شاہکار پر آفریں کہنا اور مبارکباد دینا ایک اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔ ان تک تحسین پہنچا دیجیے۔ آپ کے اہل قلم میں کچھ اقبال پر تخصص رکھتے ہیں اور ان کے مضامین ہمیشہ کلام اقبال کی یا تو ایک نئی جہت دریافت کرتے ہیں یا کسی دریافت شدہ جہت کو مزید وسعت دیتے ہیں۔ بہر حال مضامین تحقیقی اور خیال افروز ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کی مقبولیت اور جاودانی ہونے کا راز ازل تا ابد کو اپنی آغوش میں لیے کلمہ

توحید رسالت کی صداقت ہے۔ اگر اس مصور پاکستان کا اپنے خواب کی تعبیر دیکھنا ممکن ہوتا تو اس کے دل پر کیا گزراتی ؟

''اردو ادب میں گیت'' پر علیم صبا نویدی صاحب کا مضمون، چونکہ اس موضوع پر جس پر کم توجہ دی گی ہے ایک خوش آیند اضافہ ہے۔ لفظ ''گیت'' کا مصدر سنسکرت کا لفظ ''گے'' ہے جس کے معنی گانے کے ہیں۔ اور اس کا مفہوم ہے کہ داستان و نثر کے برعکس کوئی ایسی تخلیق ہو جس سے نغمگی ہو اور جسے سُر کے ساتھ گایا جاسکے۔ انسانی تاریخ میں موسیقی نے ادب کو جو عموماً شعری پیکر میں ہوتا تھا محفوظ کرنے اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے میں بہت مثبت اور کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ نثر، افسانے، مضامین، یادداشتیں، صحافت، ناول، مقابلتاً نئی اصناف ہیں۔ قرون وسطی میں ہندی اور اردو زبانیں جیسا کہ آج ہم انھیں جانتے ہیں موجود نہیں تھیں۔ کلاسیکی اشعار کی قدیم زبان یا تو اودھی یا برج بولیاں تھیں۔ بعد میں وادی گنگا میں وہ زبان ہندوی کہلائی۔ آج کل گیت ایک منفرد صنف سخن ہے جو غزل، قطعہ ورباعی سے مختلف ہے۔ وہ شاعر جو گیت لکھنا چاہتا ہے وہ ان الفاظ سے اجتناب کرتا ہے جن کی اصل عربی، فارسی، یا ترکی زبانوں سے ہو۔ اردو زبان میں وہ لچک ہے کہ اس نے ہندی کے بے شمار الفاظ کی اپنی آغوش میں اس محبت سے پرورش کی ہے کہ انھوں نے خود اس کے حسن اور لوچ میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں انور جہاں برنی کی غزل اس حسن کی غماز ہے۔

''گیت'' ہی کے خاندان کی ایک صنف ''شبد'' بھی ہے جو دراصل سنسکرت و ہندی سے ماخوذ ہے۔ ظہور اسلام سے قبل ویدوں کے اشلوک اسی صنف میں گائے جاتے تھے۔ اگرچہ اشلوک خود ایک صنفِ سخن ہے لیکن اشلوک جس اسلوب سے گائے جاتے تھے اسے بھی ''شبد'' کہا جانے لگا۔ شمالی ہند، دکن اور بنگال میں موسیقی بہت مقبول رہی ہے۔ شروع شروع میں باہر سے آنے والے بزرگان دین اور صوفیائے کرام نے سب سے پہلی بات جو داخل ہونے کے بعد محسوس کی وہ یہ تھی کہ یہاں کے لوگ موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے اور موسیقی ان پر جادو کا اثر کرتی

تھی۔خدا کی عبادت بھی اشلوک اور شبد گا کر کی جاتی تھی۔اس کے علاوہ جوگی، بیراگی، سادھو، سنت، فقیر شبد گا کر ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔شاہ حسن باجن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بنگال کے سفر کے دوران انھوں نے ایک بیراگی کو دیکھا کہ وہ شبد گا رہا تھا اور لوگ اس کے گرد بیٹھے رو رہے تھے اور ان پر ایک عجیب محویت اور خود سپردگی کا عالم طاری تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔چنانچہ اس کے بعد صوفیائے کرام نے اپنے نظریات کی تبلیغ شبدوں ہی میں کرنی شروع کر دی۔شیخ فریدالدین شکر گنج ؒ نے خاص طور پر شبد لکھے۔یہ سب ان بزرگوں نے اللہ کے دین کی تبلیغ کے لیے مقامی بولی میں کیا تاکہ وہ جلد عوام کے دلوں میں اتر جائیں۔جن بزرگانِ دین نے اس طرز کو اپنایا ان میں سید محمد جونپوری ۱۵۰۴ء شیخ بہاالدین باجن ۱۵۰۶ء شاہ محمد جیو گام دھنی ۱۵۱۵ء شیخ عبدالقدوس گنگوہی ۱۵۳۸ء اور سید شاہ ہاشم حسنی العلوی ۱۶۴۹ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

صابر عظیم آبادی۔کراچی

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔الاقرباء کا سالنامہ ۲۰۱۳ء نظر نواز ہوا۔دیکھ کر مسرت حاصل ہوئی۔اچھے اچھے مضامین، مقالات، افسانے، اقبالیات اور منظومات سے مزین ہے۔پروفیسر محمد اویس جعفری کا مضمون حضرت حسان بن ثابت ؓ بہت پُر مغز اور مربوط ہے۔انہوں نے حضرت حسان بن ثابت ؓ کی شخصیت اور شاعرانہ صلاحیت کو بڑی عمدگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔حضرت حسان ؓ بہت بڑے مداح رسول ؐ ہیں جن کے مقابل اردو اور فارسی کی شاعری میں کوئی دوسرا نعت گو شاعر نظر نہیں آتا۔اقبال پر بھی موضوعات کے لحاظ سے قابل مطالعہ مقالات شامل ہیں۔غزلوں، نظموں اور نعتوں کا حصّہ بھی بہت معیاری ہے۔نقد و نظر کے حصے میں آپ اور نعیم فاطمہ علوی کے تبصرے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔مراسلات کی دنیا بھی سب سے الگ تھلگ ہے۔چند تخلیقات حاضر خدمت ہیں۔امید ہے پسند فرمائیں گے۔۔تمام احباب کو میرا سلام

صاحبزادہ مسکین فیض الرحمان دُرّانی۔لاہور

''الاقرباء'' کا سالنامہ ۲۰۱۳ء ارسال کرنے کا بہت بہت شکریہ۔

استنبول سے واپسی پر ڈاک میں سب سے اوپر ''الاقرباء'' پورے آب و تاب سے سبز نورانی کرنوں سے چشمِ بینا کے لیے روشنی کا سامان لیے ہوئے تھا۔ پاک سرزمین کا ترانہ ۱۱ مئی ۲۰۱۳ء کو سمجھنے کی ضرورت تھی۔ بہرحال اللہ سبحانہٗ تعالیٰ پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ ''الاقرباء'' کے مندرجات بالاستیعاب مطالعہ پر اکسا رہے ہیں۔ انشاءاللہ پہلی فرصت میں استفادہ ہوگا۔

محترم ابنِ کلیم احسن نظامی کو صد بار مبارک کہ یہ خوبصورت فرحت بخش سرِ ورق بحمداللہ موسم کی حدت اور خاص کر سیاست کی گرمی کو کم کرنے کے لئے کافی ہے۔ کاش ہمیں اپنے قومی ترانے کے الفاظ کے معانی و مفاہیم کا ادراک نصیب ہو سکے۔ والسلام

محمد بشیر۔لاہور

چند دن ہوئے مجھے رسالہ 'الاقرباء' کا تازہ ترین شمارہ انٹرنیٹ پر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں بہت کم پڑھتا ہوں لیکن جناب پروفیسر محمد اویس جعفری صاحب کا مضمون ''حضرت حسان بن ثابت الانصاریؓ'' پڑھ کر ایسے لگا جیسے یہ کسی رسالہ کا مضمون نہیں بلکہ پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ کو یہاں مختصر درج کیا گیا ہے اور میرے اس خیال کا ثبوت حوالہ جاتی کتب (Reference Books) کی فہرست ہے۔ اگرچہ میں بھی پچھلے چند ماہ میں نقوش پائے مصطفٰیؐ، اطلس سیرت النبیؐ، 'سیرت النبیؐ' کا انسائیکلو پیڈیا اور چند دیگر کتب سیرت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم پڑھتا رہا ہوں لیکن کسی میں بھی حضرت حسان بن ثابتؓ، کے متعلق اتنی گہرائی میں جا کر نہیں لکھا گیا۔

سائرہ بتول صاحبہ کی نظم 'بیٹی' حقائق کی ترجمانی کرتی ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم بیٹیوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کریں جیسا بیٹوں سے کرتے ہیں۔ بیٹیاں چند سالوں کی مہمان ہوتی ہیں ان کی ہر طرح دلجوئی کرتے رہنا چاہیے۔

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ
پروفیسر ہما سالاری

احوال وکوائف

○ محترمہ شہلا احمد کی امریکہ روانگی:

محترمہ شہلا احمد نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن اور مدیر مسئول سہ ماہی "الاقرباء" ۱۸ جون سے شکاگو (امریکہ) میں رہائش پذیر اپنے بھانجے فیصل حسین خاں کی دعوت پر آج کل امریکہ میں مقیم ہیں اور مختلف شہروں میں اپنے اعزاء سے ملاقاتوں میں مصروف ہیں۔ امید ہے کہ وہ آئندہ دسمبر تک وہاں قیام کریں گی۔

○ محمد فائز حسن زیدی کا اعزاز:

سابق سیکرٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن جناب محمد حسن زیدی و بیگم شہلا حسن زیدی کے ہونہار صاحبزادے محمد فائز حسن زیدی نے جو غلام اسحٰق خاں انسٹی ٹیوٹ سے کمپیوٹر انجینئرنگ (Computer Engineering) کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں International Society of Photoptical Instrumentation کی رکنیت کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ فائز حسن کیلیفورنیا، امریکہ میں منعقد ہونے والی Conference of Optics and Phonotics.2013 میں غلام اسحٰق خاں انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پاکستان کی نمائندگی کریں گے۔ یہ کانفرنس ۲۴ تا ۲۹ اگست منعقد ہوگی۔ اس کانفرس میں پوری دنیا سے تقریباً ۱۷۰۰۰ Professionals شرکت کر رہے ہیں۔

ادارہ الاقرباء جناب محمد حسن زیدی، بیگم شہلا حسن زیدی، فائز حسن زیدی اور تمام اہلِ خاندان کو اس اعزاز پر دلی تہنیت پیش کرتا ہے اور فائز حسن کی مزید کامیابیوں، کامرانیوں اور خوش بختیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○ ملیحہ مزمل سالاری کی کامیابی:

جناب سید مزمل سالاری رکن مجلس انتظامیہ وبیگم ہما سالاری ڈپٹی سکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن کی ہونہار صاحبزادی ملیحہ سالاری نے میٹرک کے امتحان میں ۹۲ء۵ فیصد نمبروں کے ساتھ +A گریڈ حاصل کیا ہے۔ عزیزہ ملیحہ Presentation Convent School, Rawalpindi کی طالبہ تھیں۔ انھوں نے شروع ہی سے نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں میں مثالی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور بے شمار انعامات حاصل کیے۔

ادارہ اس نمایاں کامیابی پر عزیزہ ملیحہ واہل خاندان کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور مستقبل کی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○ سیّد ارسلان منصور کی کامیابی:

سید ارسلان منصور صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منصور عاقل وبیگم ناہید منصور صاحبہ کے ہونہار پوتے نے جو سیّد فیصل منصور وبیگم نادیہ فیصل کے صاحبزادے ہیں میٹرک کے امتحان میں ۸۱ فیصد نمبروں کے ساتھ +A گریڈ حاصل کیا۔ سید ارسلان منصور نے بارہا اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا وہ گزشتہ سال مطالعاتی دورے NASA SPACE CENTER, UAS کے لیے منتخب ہوئے تھے۔

ادارہ اس شاندار کامیابی پر جناب سید منصور عاقل اور ان کے اہل خانہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور ارسلان کے شاندار مستقبل کے لیے دعا گو ہے۔

○ جناب ظفر سالاری کی انگلینڈ روانگی:

سکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن جناب ظفر سالاری اپنی اہلیہ کے ہمراہ ۴ اگست کو نجی دورہ پر انگلینڈ تشریف لے گئے ہیں۔ ان کا دورہ تقریباً ۲۰ دن پر مشتمل ہے وہ انشاء اللہ ۲۴ اگست کو پاکستان واپس ہوں گے۔

○ سانحاتِ رحلت:

ا۔ گذشتہ دنوں صدر الاقرباء فاؤنڈیشن کے حقیقی بھتیجے سید مسرور عالم کراچی میں بعارضۂ قلب ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم نے اپنے اہل و عیال کے انگلینڈ میں رہائش اختیار کر لینے کے بعد گذشتہ برس پی۔آئی۔اے سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ اُنھوں نے متعدد بین الاقوامی سفر کیے اور اہل خانہ کے بیرون ملک منتقل ہو جانے کے بعد بھی عزیز و اقارب اور احباب سے ملنے اکثر پاکستان آتے رہتے تھے۔ آخری بار اسلام آباد۔ راولپنڈی بھی آئے۔

۲۔ اس سے قبل صدر الاقرباء فاؤنڈیشن کی اہلیہ محترمہ ناہید منصور صاحبہ کے بڑے بھائی سید کلیم احمد بھی لاہور میں چند دنوں تک ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد انتقال کر گئے تھے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ اُن کے اہل خانہ بھی چند برسوں سے امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔

ادارہ 'الاقرباء' ان سانحات پر جناب و بیگم سید منصور عاقل اور متعلقہ خاندانوں سے دلی تعزیت کرتا ہے اور مرحومین کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

○ الاقرباء فاؤنڈیشن کی فلاحی سرگرمیاں:

ادارہ الاقرباء ابتداء سے ہی غریب و نادار لوگوں کی مدد کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس مرتبہ بھی ادارہ کی طرف سے گردے کے مرض میں مبتلا ایک نادار بچے کو Kidney Transplant میں مدد کے لیے ۲۰,۰۰۰ روپے کی رقم دی گئی نیز ایک اور نادار مریض کو دواؤں کے لیے ۵,۰۰۰ روپے پہنچائے گئے۔

○ بیگم و جناب سلیم قریشی کے فرزندار جمند ڈاکٹر عارف علیم قریشی کی لندن میں تقریباتِ شادی:

لندن میں مقیم سہ ماہی 'الاقرباء' کے مشیرِ اعلیٰ برائے یورپ بیرسٹر سلیم قریشی صاحب و بیگم محترمہ ساجدہ قریشی کے فرزند ارجمند ڈاکٹر عارف علیم قریشی کی تقریباتِ شادی و خانہ آبادی لندن میں مورخہ ۲۳ تا ۳۰ جون ۲۰۱۳ء منعقد ہوئیں۔ تقریب نکاح مسنونہ و استقبالیہ مورخہ ۲۳ جون بمقام ''ویسٹ منسٹر بال روم۔ لندن میریٹ ہوٹل، گورنر سکوائر میں شام ساڑھے چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک جاری رہیں جب کہ ''ولیمہ عشائیہ'' کی تقریب مورخہ ۳۰ جون کو ''والتھم اسٹو واسمبلی ہال'' میں منعقد ہوئی اِن تقاریب کی خصوصی رپورٹنگ انگریزی اور اردو میڈیا نے تفصیلاً کی۔ مقامی اخبار ''نیشن'' میں تصاویر کو درجِ ذیل تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا۔

''لندن۔ معروف قانونی شخصیت اور قانون دان بیرسٹر سلیم قریشی اور بیگم ساجدہ قریشی کے صاحبزادے ڈاکٹر عارف علیم قریشی گذشتہ دنوں محمد حمید اللہ خان اور بیگم عزیز سلطان خان کی صاحبزادی امینہ حنا فاطمہ

خان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ شادی کی اس خوشی میں اتوار ۳۰ جون کو "والتھم سٹو اسمبلی ہال میں ایک پُرتکلف تقریب منعقد کی گئی جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے عمائدین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقع پر لی گئی تصاویر میں دلہا اور دلہن اپنے اہل خانہ کے ساتھ موجود ہیں جب کہ دیگر تصاویر میں شرکائے تقریب ہیں۔

عقیل دانش

عارف اور امینہ کی شادی کے مبارک موقع پر

نئے سفر پہ رواں عارفؔ و امینہ ہیں
رفاقتوں کی حسیں چاندنی مبارک ہو

ہر اک قدم پہ نچھاور ہوں پھول خوشیوں کے
خدا کرے کہ نئی زندگی مبارک ہو

☆☆☆

آنکھوں میں ہے مسرّت اور لب پہ ہیں دعائیں
بچے ہمارے اپنی دنیا بسا رہے ہیں

ہیں عارفؔ اور امینہؔ اک چاند ایک سورج
اب اِن کی روشنی سے دل جگمگا رہے ہیں

☆☆☆
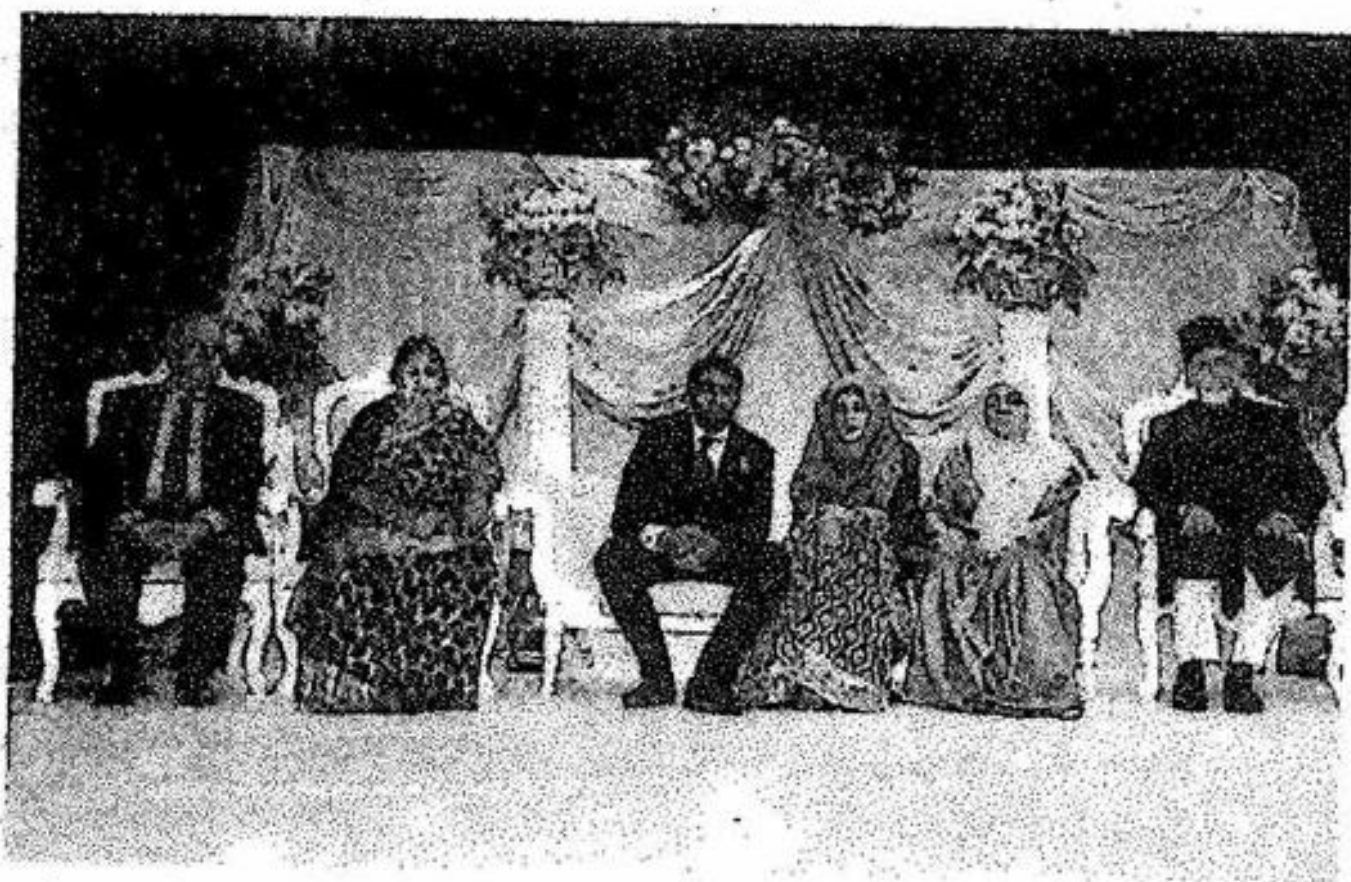
دلہا دلہن اپنے والدین کے ساتھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سہرا

بتقریب شادی خانہ آبادی عزیزی ڈاکٹر عارف علیم قریشی فرزند دلبند محب مکرم بیرسٹر سلیم قریشی و بیگم ساجدہ قریشی مورخہ ٢٣/٣٠ جون ٢٠١٣ء بمقام لندن

رقصِ گُل ہے کہ نسیمِ گزراں ہے سہرا — ایک گلدستۂ صاحب نظراں ہے سہرا
گنگناتی ہوئی بلقیسِ صبا ہو جیسے — مسکراتی ہوئی کلیوں کا جہاں ہے سہرا
غنچہ غنچہ متبسم، مترنم ہے فضا — رنگ و آہنگ کا اک سیلِ رواں ہے سہرا
سب گلستاں کا گلستاں ہوا صد رشکِ حنا[1] — کس کی عارف[2] نگہی کا یہ بیاں ہے سہرا
بس کہ ہے ذوقِ سلیم[3] آئینۂ وصفِ حمید[4] — اے خوشا بخت کہ فرخندہ نشاں ہے سہرا
ساجدہ[5] شکرِ خداوند میں ہیں سر بسجود — چشمِ سلطانہ[6] میں اک شاہِ شہاں ہے سہرا
تہنیت باد ! عزیزانِ قریشی نسباں — مرحبا! خوش نگہاں ! رشکِ جناں ہے سہرا
سیکھے فرزندی کے آداب بہ فیضانِ نظر — بہرِ نوشاہ متاعِ دو جہاں ہے سہرا
پیکرِ عظمتِ ایثار و وفا اسمٰعیل[7] — مظہرِ رحمتِ خلاقِ جہاں ہے سہرا
علم و نعت کی ہیں پہچان علیم[8] اور نعیم[9] — اے جنید![10] آپ کی الفت کا نشاں ہے سہرا
ایک فرحانہ[11] و میمونہ[12] و روبینہ[13] ہی کیا — اسمٰی[14] و سارہ[15] و سمرانا[16] کی ہے جاں سہرا

مطلعِ فکر سے انجم ہیں گہر بار عاقل
ہے زمیں بھی یہ فلک، کاہکشاں ہے سہرا

اسلام آباد (پاکستان) — بہترین دعاؤں کے ساتھ
مورخہ ١٦ جون ٢٠١٣ء — بیگم و سید منصور عاقل

تصریحات

١۔ حنا (دلہن) ٢۔ عارف (دلہا) ٣۔ سلیم (دلہا کے والد) ٤۔ حمید (دلہن کے والد) ٥۔ ساجدہ (دلہا کی والدہ) ٦۔ سلطانہ (دلہن کی والدہ) ٧۔ اسمٰعیل (دلہا کے تایا) ٨۔ علیم ۔ (دلہا کے چچا) ٩۔ نعیم (دلہا کے چچا) ١٠۔ جنید (دلہن کے بھائی) ١١۔ فرحانہ (دلہن کی بہن) ١٢۔ میمونہ (دلہن کی بہن) ١٣۔ روبینہ (دلہن کی بہن) ١٤۔ اسمٰی (دلہن کی بہن) ١٥۔ سارہ (دلہن کی بہن) ١٦۔ سمرانا (دلہن کی بہن)

سیّدہ سارہ سلمان

گھریلو چٹکلے

○ **ہائی بلڈ پریشر:** ہائی بلڈ پریشر کو فوری طور پر کم کرنے کے لیے لیموں کو پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اِس کے علاوہ چھوٹی الائچی اور کیلے سے بھی بلڈ پریشر کم ہو جاتا ہے۔

○ **ہاضمہ کے لیے:** جن لوگوں کا ہاضمہ ٹھیک نہ رہتا ہو اُن کو چاہیے کہ کھانے کے بعد پکے ہوئے پپیتے کی ۲/۳ قاشیں کھالیں۔ کھانا جلد ہضم ہو جائے گا۔

○ **زبان میں لُکنت:** بچے کی زبان میں لکنت ہو تو عقرِ قرحا لے کر پیس لیں اور چٹکی بھر عقرِ قرحا کو شہد میں ملا کر زبان اور منہ کے اندر لگائیں دِن میں تین (۳) دفعہ یہ عمل کریں۔

○ **گردے کی تکلیف:** گردے کی تکلیف کے لیے نہار منہ چائے یا قہوے میں ایک کھانے کا چمچ گھر میں بنا ہوا سفید مکھن ملا کر ۵ سے ۷ دِن تک پئیں انشاءاللہ تکلیف دور ہو جائے گی۔

○ **جسم پر داغ دھبہ کے نشانات:** جسم کے کسی حصے پر کوئی داغ یا دھبہ ہو یا جلنے کے نشانات ہوں گھیکوار کا گودا لگائیں۔ آہستہ آہستہ نشانات ختم ہو جائیں گے۔

○ **بے خوابی:** اگر کسی کو بے خوابی کی شکایت ہو تو کدو یا خشخاش کے تیل کی سونے سے پہلے مالش کر لیں۔ بہت اچھی نیند آئے گی۔

○ **دانتوں کی پیلاہٹ کو دور کرنا:** دانتوں کی پیلاہٹ کو فوراً دور کرنا ہو تو نمک اور لیموں کا عرق ملا کر انگلی سے صاف کر لیں۔ دانت چمک جائیں گے۔